اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اکتوبر ۲۰۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۶ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اکتوبر ۲۰۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۶ء

شمارہ نمبر ۹

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

روبینہ شاہین

محمد امین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کاپتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

پرانے چاول

قندِ شیریں

قطعات

ولائتی زعفران

سفر وسیلۂ ظفر

قسطور قسط

غزلیات / ھزلیات

مزاحیے

کالم گلوچ

انشائیہ

کتابی چھرے

نظمالوجی

لمرِک

سہ ماہی کی کتاب

مزاح نگار ڈائریکٹری

فیس بُک موج میلہ

جستہ جستہ

اُرسلانؔ بلوچ، ایم ابراہیمؔ، اعظم نصرؔ، علیم خان فلکی وغیرہ کے جستہ جستہ فقروں، قہقہہ آور چٹکلوں اور ادارہ ہٰذا کے تشخیص کردہ شرارتی کارٹون، مجلّے کے مختلف صفحات پر۔

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سیکن نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب و جوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

سرگوشیاں

ہمارے ایک دوست ہیں جو اکثر اپنے بھانجوں کو پڑھاتے ہیں۔ اُنہوں نے ہی اس واقعہ کا ذکر مجھ سے کیا ہے۔ پچھلے ہفتے اُن کے ایک بھانجا شریف جن کی عمر شریف ۱۴ یا ۱۵ برس ہوگی، نے پڑھائی کے دوران اُن سے پوچھا ''ماموں! کیا آپ شاعری کو ٹھیک کر سکتے ہیں؟''

''شاعری کو تو دنیا بھر کے نقاد مل کر بھی ٹھیک نہیں کر سکے، میں کس کھیت کی مولی ہوں لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ ماموں، دراصل میں نے ایک اُردو میں پوئم بنائی ہے، آپ اُسے ٹھیک کر سکتے ہیں؟''

''ریت بجری کہاں سے لائے تھے تم اس کے لئے؟''

''ریت بجری؟ ماموں میں نے پوئم بنائی ہے!''

''بیٹے، اوّل تو اُردو میں جو شاعری کی جائے وہ پوئم نہیں نظم کہلاتی ہے، اور دوم یہ کہ وہ بنائی نہیں جاتی بلکہ رقم کی جاتی ہے یعنی لکھی جاتی ہے۔''

''وہی ماموں، میں نے نظم لکھی ہے، آپ اس کو ٹھیک کر دیں گے؟ میں نے فیس بک سٹیٹس اپڈیٹ کرنا ہے''

''اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ نظم ٹھیک نہیں کی جاتی بلکہ اُس کی تصیح کی جاتی ہے، بہر حال دکھاؤ، کہاں ہے وہ نظم؟''

برخودار نے شرماتے ہوئے فزکس کی کتاب میں سے ایک کاغذ نکالا اور اُنہیں تھما دیا۔

ہمارے دوست نے نظم پر ایک نظر ڈالی، یہ نظم کسی طالب علم سے منسلک کسی موضوع پر نہیں تھی، میرا مطلب ہے کہ وہ نظم علم، سکول، کمرۂ جماعت، کسی جانور، مظاہرِ قدرت یا اسی جیسے کسی موضوع پر نہیں تھی بلکہ اپنی کسی خاتون ہم جماعت کی تعریف میں لکھی گئی تھی، جسے برخوردار اپنے فیس بک کے سٹیٹس میں اپڈیٹ کرنا چاہتے تھے۔ نظم کسی بحر کے تکلف میں پڑے بغیر لکھی گئی تھی، بس قافیہ پیمائی کی گئی تھی اور وہ بھی نثر میں ہاں البتہ خیالات خاصے بالغانہ نوعیت کے تھے۔

''برخوردار، پہلے مطالعہ کرو، پھر نظمیں بھی جوڑتے پھرنا!'' اِس پر ہمارے دوست نے اُس کی خاصی سرزنش کی تھی۔

''مطالعہ؟ پر کتھوں؟؟'' ہم نے اپنے دوست سے کہا ''حرفتِ جانکاری کے اس دور میں بھلا کون مطالعہ کا کشٹ اُٹھائے اور کیوں اُٹھائے؟ قابلیت جن باٹوں پر تولی جاتی ہے اُن کی طبعی ترکیب میں علمی استعداد نام کی کوئی شے شامل نہیں بلکہ یہ ترازو کسی اور ہی دھات سے بنے ہوئے ہیں۔ جب عملی زندگی میں ایسی آپا دھاپی ہو تو مطالعے کا شوق کیسے رہے گا اور کیوں رہے گا؟''

یہ بات ہے بھی درست، اور سچ پوچھیں تو ہمارے ذمہ داران کو اس سے کوئی غرض ہے بھی نہیں کہ ہماری نئی نسل کیا کرتی پھر رہی ہے اور اُن کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر منظم کرنے کے لئے کیا چارہ سازی کی جائے۔ خصوصاً اُن میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے تو کسی قسم کی قطعاً کوئی منصوبہ بندی دیکھنے میں نہیں آ رہی ہے۔

پاکستان نیشنل بک کونسل کی مساعی اس ضمن میں قابلِ ستائش ہیں کہ وہ اپنے قیام سے ہی مطالعہ کے فروغ کے لئے احسن اقدامات اُٹھاتی رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب اس ادارے نے نوجوانانِ پاکستان میں مطالعہ کے فروغ کا ذمہ اُٹھایا اور غیر نصابی کتب قابلِ ذکر رعایتی نرخوں پر مہیا کرنے کے لئے ''ممبر شپ کارڈ'' کا اہتمام کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار جی ایٹ میں تعلیمی چوک پر ممبر شپ کارڈ لینے گیا تو وہاں طالبانِ علم کا اِتنا بڑا جلوس موجود تھا جو آج کل اوسط درجے کی سیاسی جماعت کا ہوتا ہے۔ تعلیمی چوک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا لیکن گزشتہ برس جب میں ممبر شپ کارڈ کے حصول کے لئے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے دفتر گیا تو وہاں ہُو کا عالم تھا۔ میرا ممبر شپ کارڈ پانچ منٹوں کے اندر اندر بن گیا تھا۔ شائد ایسا اس لئے تھا کہ آئی ٹی کا سیلاب نوجوانوں میں سے مطالعے کا شوق بہا لے گیا تھا اور ادارۂ ہٰذا کے سامنے ''فروغِ مطالعہ'' کے بجائے ''احیائے مطالعہ'' کا مسئلہ درپیش تھا، تا ہم پھر بھی اس ادارے کا دم غنیمت تھا کہ جو بچا کھچا مطالعہ کا شوق باقی رہ گیا تھا اُس سے نئی کونپلیں پھوٹ سکتی تھیں۔ بد قسمتی سے گزشتہ برس سے ادارۂ ہٰذا اس کام سے بھی گیا، وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ''بجٹ'' نہیں ہے۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہماری حکومت کے پاس اللوں تللوں کے لئے وافر پیسہ موجود ہے لیکن فروغِ تعلیم کے لئے بجٹ نہیں؟ کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں؟؟

نوید ظفر کیانی

کرنل محمد خان

یہ نہ تھی ہماری قسمت...

یہ کالج کے دنوں کا واقعہ ہے۔
ایک دِن یکا یک ہماری کلاس یعنی ایم۔اے فائنل کے لڑکوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ہمارے ایک منحنی سے ہم جماعت مولوی عبدالرحمٰن کو ایف۔اے کی ایک طالبہ کی ٹیوشن مل گئی ہے۔ چرچا ٹیوشن کی وجہ سے نہ تھا بلکہ لڑکی کی وجہ سے، کیونکہ افواہ کی رو سے لڑکی حسین ہی نہ تھی، فطین بھی تھی۔ پانچ سال اپنے بیرسٹر باپ کے ساتھ ولایت رہ کرآئی تھی، فیشن کی کوئی ادا نہ تھی جو اسے یاد نہ ہو، انگریزی فرفر بولتی تھی اور کلاس میں اپنی پروفیسر کے کان بھی کترتی تھی۔ صرف اُردو میں کمزور تھی۔ یہ کمزوری بھی حُسن اور انگریزی کے زور سے کسی قدر پوری کرلی تھی اور باقی کی پورا کرنے کے لئے ٹیوشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

لڑکی کے کوائف سُن کر عبدالرحمٰن کے ہم جماعت رشک اور حسد سے حسبِ توفیق لال پیلے اور نیلے ہونے لگے۔ کئی ایک نے مولوی صاحب کی داڑھی کے متعلق نارواسی باتیں بھی کیں اور درمیان میں ان جانوروں کا ذکر لے آئے جن کی ٹھوڑی کے نیچے بال ہوتے ہیں، لیکن اس تمام غیبت سے مولوی عبدالرحمٰن کی داڑھی کا ایک بال تک بیکا نہ ہوا کیونکہ ہر روز کی دست وبرد سے آپ کے جو بال بیکا ہونے تھے، ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے، بظاہر پکے تھے چنانچہ اکثر حاسدوں نے مولوی عبدالرحمٰن پر داڑھی سمیت ہی رالیں بہالیں۔ ہم نے رال پر تو قابو رکھا لیکن اندرونِ خانہ ہم بھی ذرا حاسد ہی تھے۔۔۔ ہمیں قسمت سے اصل شکایت یہ تھی کہ اس ٹیوشن کے لئے ہم کیوں نہ چنے گئے۔ یعنی ہم کہ سُرخ و سپید، بانکے، بے فکرے چھ فٹ قد کے جوانِ رعنا تھے اور بیرسٹر صاحب کے گھر یوں لگتے جیسے رابرٹ ٹیلر کو ٹیوٹر رکھ لیا ہو، لیکن قرعہ پڑا تو مولوی صاحب کے نام جو اپنی موٹی چادر کی عینک میں یوں نظر آتے تھے جیسے شیشوں کے پیچھے سے اُودبلاؤ جھانک رہا ہو۔ ہمیں لڑکی کے ٹیوٹر چننوں کی بدمذاقی پر بہت غصہ آیا۔ مولوی عبدالرحمٰن کو کسی لڑکے یا بھینگی سی لڑکی کا ٹیوٹر چن لیا ہوتا تو ہمیں شکایت نہ ہوتی، لیکن ایک آہو چشمِ قتالہ کے لئے اس کا انتخاب قسمت کی سخت غلط بخشی تھی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ قسمت قد ناپ کر نعمتیں تقسیم نہیں کرتی، ہاں کبھی کبھی بی۔اے کے نمبر دیکھ لیتی ہے اور اس میں مولوی صاحب ہمیں کوئی دوسو نمبر پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ بہر حال نمبر کم سہی، ہمارے دل کے ارمان اتنے کم نہ تھے۔ اگر ہمارے نمبروں کے ساتھ ہماری حسرتوں کا شمار بھی کیا جاتا تو ایگریگیٹ میں ہم بڑی اونچی پوزیشن حاصل کرتے اور یہ ٹیوشن بھی، کیونکہ ہمارا ایک ارمان ایک ایسی ہی پیاری سی ٹیوشن کا تھا،

لیکن دل کے ارمانوں کا قدردان قیس کو نہ ملا، فرہاد کو نہ ملا، رانجھے کو نہ ملا۔۔۔ اور شائد اسی لئے کہ ان لوگوں نے میٹرک بھی پاس نہ کیا، ہمیں کیا ملتا؟ ہم رشک اور حسد کو بھی ہضم کر گئے اور ایک دن سامنے آتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن ملے تو انہیں مبارکباد پیش کر دی۔

مولوی صاحب نے حسد کے طوفانوں میں مبارکباد کی آواز سُنی تو سینے سے لگا لیا اور بولے ''ساری کلاس میں ایک تم ہی شریف لڑکے ہو۔''

میں نے جلدی سے سینے بلکہ داڑھی سے الگ ہو کر کہا ''اور آپ شریف ہی نہیں، قابل بھی ہیں، یہ ٹیوشن آپ ہی کو ملنی چاہیئے تھی۔''

مولوی صاحب نے اپنی زندگی میں تحسین کے پھول یوں برستے نہ دیکھے تھے، چنانچہ ایک دفعہ پھر مجھے سینے سے لگانے کی ناکام کوشش کی۔ اِدھر میں لڑکی کے متعلق کچھ جاننے کو بے تاب تھا۔ سہمے سہمے انداز میں پوچھا ''مولوی صاحب، لڑکی کیسی ہے؟''

بڑے دولت مند باپ کی بیٹی ہے، اُن کا ایک بنگلہ ہے، دو کاریں ہیں، تین نوکر ہیں۔۔۔''

مجھے باپ کے اعداد و شمار میں دلچسپی نہ تھی، لہٰذا بات کاٹتے ہوئے بولا ''مولانا، باپ نہیں لڑکی کیسی ہے؟''

اور لفظ لڑکی پر زور دے کر اسے خوب انڈرلائن کیا۔

مولانا کسی قدر حیرانی سے بولے ''تمھارا کیا مطلب ہے؟''

یوں دن دیہاڑے لڑکی کی خوبصورتی کے متعلق سوال سُن کر مولانا کے کان سُرخ ہونے لگے، بولے ''بھئی مجھے تو معلوم نہیں، میں نے تو اسے کبھی آنکھ بھر کر دیکھا نہیں۔''

''آنکھ بھر کر دیکھا نہیں؟ پڑھاتے وقت آپ اپنی شاگرد کے روبرو بیٹھتے ہیں یا پشت بہ پشت؟''

بیٹھتا تو سامنے ہوں مگر میں نے کبھی آنکھ نہیں اُٹھائی۔''

''کیوں نہیں اُٹھائی؟''

''بُری بات ہے۔''

''لیکن آنکھ جھکا کر اس کے پاؤں تو دیکھتے رہتے ہوں گے، یہ کیسی بات ہے؟''

''پاؤں میں تو چپل پہنتی ہے۔''

یہ کہہ کر مولوی صاحب ہماری سادگی پر مسکرا دیئے، گویا کہتے ہوں، کیا مسکت جواب دیا ہے۔ اس پر ہم نے مزید خراج ادا کرتے ہوئے کہا ''مولوی صاحب آپ بے شک نیک آدمی ہیں۔''

''آپ بھی تو ہیں۔''

یہ چار لفظوں کا جملہ مولوی صاحب نے اسی انداز میں ادا کیا جیسے حبیب بنک کے ٹی وی کے اشتہار میں ایک بچہ کہتا ہے ''میلا بھی تو ہے''۔۔۔ پھر رخصت ہونے سے پہلے آپ نے بالکل بچگانہ طور پر تیسری ناکام کوشش کی، جی ہاں، ہمیں سینے اور داڑھی سے لگانے کی۔

لیکن اب مولوی صاحب کی اور ہماری دوستی پکی ہو چکی تھی۔ ہر صبح مولوی صاحب سے گزشتہ شام کے سبق کی نہایت متشرع روداد سنتے، لڑکی بیچاری کی قسمت پر آنسو بہاتے لیکن جی کڑا کر کے مولوی صاحب کو داد دیتے اور وہ ہمیں دعا دیتے ہوئے رخصت ہو جاتے۔

ایک روز مولوی صاحب ذرا خلافِ معمول پریشان حال نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو بولے ''گاؤں سے اطلاع آئی ہے کہ ماں بیمار ہے۔ ماں کی عیادت بھی لازم ہے اور ٹیوشن میں ناغہ ہوا تو بیرسٹر صاحب کے ناراض ہونے کا خوف ہے۔''

میں نے کہا ''ناراض کیوں ہوں گے؟ آخر مجبوری ہے، آپ بیرسٹر صاحب سے بات تو کر لیں۔''

''کر لی ہے، کہتے ہیں سالانہ امتحان مین صرف دس دن باقی ہیں اور رضیہ اُردو میں بدستور کمزور ہے۔''

''تو کیا اُن کا خیال ہے کہ اگر رجیہ کی اردو کی کمزوری رفع نہ ہوئی تو دشمن ملک پر حملہ کر دے گا؟''

مولوی صاحب میرا سوال ٹال گئے، شائد سمجھ ہی نہ سکے اور

بولے ''بیرسٹر صاحب کہتے ہیں کہ اگر جانا لازم ہے تو اپنی جگہ کوئی موزوں آدمی دے کر جاؤ۔ اب میں موزوں آدمی کہاں سے لاؤں؟''

معاً ہمیں خیال آیا کہ ہم آدمی تو یقیناً ہیں، باقی رہی موزونیت تو چند اور خوبیوں کے علاوہ ہم اُردو بھی لکھ پڑھ بلکہ پڑھا سکتے ہیں۔۔۔مگر یہ ہمارا خیال تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا یہی خوبصورت خیال مولوی صاحب اور بیرسٹر صاحب کو بھی آ سکتا ہے؟ بلادعوت اپنی خدمات پیش کرنا تو شان کے خلاف تھا، چنانچہ امید کے دامن کا ایک تار تھام کر ہم نے کہا ''بے شک موزوں آدمی ملنا مشکل ہے البتہ یہ بات ناممکن نہیں۔''

مولانا بولے ''بس ایک ہی صورت ہے۔''

''مثلاً؟''

مثلاً یہ کہ اگر آپ زحمت نہ سمجھیں تو دو روز میری جگہ پڑھا آئیں۔''

یہ تو وہی بات ہوئی کہ دعا منہ سے نکلی نہیں اور اجابت نے دروازہ آ کھٹکھٹایا۔

لیکن ہماری مسرت سے کہیں زیادہ ہماری حیرت تھی۔ ہمارے منہ سے کسی قدر اضطرار مین نکلا ''میں یعنی خود پڑھا آؤں؟''

''جی ہاں، آپ خود۔''

''مولانا، آپ کی ذرّہ نوازی ہے اور مجھے انکار بھی نہیں لیکن یہ بتائیں کہ کیا بیرسٹر صاحب بھی اِتنے ہی ذرّہ نواز ہیں؟''

''میں نے برسٹر صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں، آج شام میرے ساتھ چلیے گا۔''

یہ وہی پرانی کہانیوں والا قصہ تھا، شہزادی سامنے قلعے میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے شہزادے کو فقط ایک اژدھے اور دو شیر ہلاک کرنے کی ضرورت ہے بلکہ شائد دونوں مہموں کی نسبت ایک بیرسٹر راضی کرنا زیادہ دشوار تھا۔ پھر مولوی عبدالرحمٰن صاحب رخصت ہونے لگے تو جیسے کچھ اچانک یاد آ گیا ہو، بولے ''ہاں ایک بات، اگر بُرا نہ مانیں۔''

''ارشاد۔''

''کیا ہی اچھا ہو اگر آپ سوٹ کی جگہ اچکن پہن کر آئیں۔''

''لیکن میرے پاس اچکن تو ہے نہیں۔''

''کہیں سے مانگ نہیں سکتے؟''

''مولانا، مانگ تو سکتا ہوں، پھر آپ کہیں گے کہ ایک داڑھی بھی مانگ لاؤ۔''

''داڑھی نہیں ٹوپی۔''

''قبلہ میں بیرسٹر صاحب کے گھر لڑکی پڑھانے جاؤں گا یا جمعہ پڑھانے؟''

''بات یہ ہے کہ ننگے سر ٹھیک نہیں ہوتا اور اچکن اور ٹوپی میں آدمی شریف لگتا ہے۔''

اب مولوی صاحب سے کیا بحث کرتے۔ ہم نے بڑے بڑے سمگلرون کو اچکن اور ٹوپی پہنے دیکھا تھا۔ بہرحال اُنھیں یقین دلایا کہ اُن کی خاطر۔۔۔جو دراصل اپنی ہی خاطر تھی۔۔۔اچکن اور ٹوپی کا انتظام بھی کریں گے اور آخر شام سے پہلے ڈھیلی سی بد رنگ سی اچکن اور پی سی تنگ سی ٹوپی پیدا کر لی۔

شام بیرسٹر صاحب کے دولت کدے پر پہنچے۔ مولوی صاحب کی نگاہیں دولت کدے سے سوگز اُدھر ہی جھک گئیں اور ایسی کہ پھر اُٹھانے کا نام نہ لیا۔ مولوی صاحب نے ہمیں بھی تلقین کی کہ نظریں اُٹھانے سے پرہیز کرنا لیکن ہم سے کوشش کے باوجود بدپرہیزی ہوتی رہی۔ بیرسٹر صاحب کے روبرو ہوئے تو مولوی صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ جواب میں بیرسٹر صاحب نے بظاہر تو مزاج پُرسی کی لیکن حقیقت میں ہمارا معائنہ کرنے لگے جو طبی معائنے سے بہت ملتا جُلتا تھا یعنی ہمیں تو بہت اُلٹ پلٹ کر نہ دیکھا لیکن خود بہت اُلٹے پلٹے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر زاویے سے فرضی ٹوپی لگا کر ہماری نیت کی رفتار ناپ رہے ہوں۔ آخر، غالباً ہماری اچکن اور ٹوپی سے متاثر ہو کر فرمایا ''لڑکا تو شریف ہی لگتا ہے۔''

پھر مولوی صاحب کو رخصت دے دی اور ہمیں رضیہ تک پہنچا

آئے۔

رضیہ ہماری توقع سے بھی زیادہ حسین نکلی اور حسین ہی نہیں، بلکہ فتنہ گرِ قد و گیسو تھی!

پہلی نگاہ پر ہی محسوس ہوا کہ initiative ہمارے ہاتھ سے نکل کر فریق مخالف کے پاس چلا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پہلا سوال بھی ادھر ہی سے آیا ''تو آپ ہیں ہمارے نئے نویلے ٹیوٹر؟''

اب اس شوخ سوال کا صحیح جواب تو یہ تھا کہ ''تو آپ ہیں ہماری نویلی شاگرد؟''

لیکن سچی بات ہے کہ حسن کی سرکار میں ہماری شوخی ایک لمحے کے لئے ماند پڑ گئی اور ہمارے منہ سے ایک بے جان سا جواب نکلا ''جی ہاں، نیا تو ہوں، ٹیوٹر نہیں ہوں۔ مولوی صاحب کی جگہ آیا ہوں۔''

''اس سے آپ کی ٹیوٹری میں کیا فرق پڑتا ہے؟''

''یہی کہ عارضی ہوں۔''

''تو عارضی ٹیوٹر صاحب۔ ہمیں ذرا اس مصیبت سے نجات دلائیں۔''

رضیہ کا اشارہ دیوان غالب کی طرف تھا۔ میں نے کسی قدر متعجب ہو کر پوچھا ''آپ دیوان غالب کو مصیبت کہتی ہیں؟''

''جی ہاں، اور خود غالب کو بھی۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ غالب پر یہ عتاب کیوں؟''

''آپ ذرا آسان اردو بولئے۔ عتاب کسے کہتے ہیں؟''

''عتاب غصے کو کہتے ہیں۔''

''غصہ؟ ہاں غصہ اس لیے کہ غالب صاحب کا لکھا تو شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر خدا جانے، پورا دیوان کیوں لکھ مارا۔''

''اس لیے کہ لوگ پڑھ کر لذت اور سرور حاصل کریں۔''

''نہیں جناب۔ اس لیے کہ ہر سال سینکڑوں لڑکیاں اردو میں فیل ہوں۔''

''محترمہ، میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے، فرمائیں آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟''

جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرع پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے دیکھا تو غالب کی مشہور غزل تھی

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

میں نے کہا ''یہ تو بڑی لاجواب غزل ہے۔ ذرا پڑھئے تو۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ ہی پڑھیں۔ میرے پڑھنے سے اس کی لاجوابی پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔''

مجھے افسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ باتونی بھی ہیں اور ذہین بھی، لیکن اردو پڑھنے میں غالباً اناڑی ہی ہیں۔ میں نے کہا ''میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہ ہوگا۔ آپ ہی پڑھیں کہ تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور سچ مچ جیسے پہلی جماعت کا بچہ پڑھتا ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وِصل۔۔۔

میں نے ٹوک کر کہا ''یہ وِصل نہیں، وصال ہے۔ وِصل تو سیٹی کو کہتے ہیں۔''

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم ذرا مسکرائے اور ہمارا اعتماد بحال ہونے لگا۔ رضیہ بولی ''اچھا، وصال سہی۔ وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں؟''

''وصال کے معنی ہوتے ہیں ملاقات، محبوب سے ملاقات۔ آپ پھر مصروع پڑھیں۔''

رضیہ نے دوبارہ مصرعہ پڑھا۔ پہلے سے ذرا بہتر تھا لیکن وصال اور یار کو اضافت کے بغیر الگ پڑھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا ''یہ وصال یار نہیں، وصالِ یار ہے۔ درمیان میں اضافت ہے۔''

''اضافت کیا ہوتی ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟''

''یہ جو چھوٹی سی زیر نظر آ رہی ہے نا آپ کو، اسی کو اضافت کہتے ہیں۔''

''تو سیدھا سادا وصالے یار کیوں نہیں لکھ دیتے؟''

''اس لیے کہ وہ علما کے نزدیک غلط ہے۔۔۔'' یہ ہم نے کسی قدر رعب سے کہا۔

''علماء کا وصال سے کیا تعلق ہے؟''

''اچھا جانے دیں علما کو۔ مطلب کیا ہوا؟''
''شاعر کہتا ہے کہ یہ میری قسمت ہی میں نہ تھا کہ یار سے وصال ہوتا۔''
''قسمت کو تو غالب صاحب درمیان میں یونہی گھسیٹ لائے ہیں۔ مطلب یہ کہ بیچارے کو وصال نصیب نہ ہوا۔''
''جی ہاں! کچھ ایسی ہی بات تھی۔''
''کیا وجہ؟''
''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''
''کیوں نہیں کہہ سکتے؟ آپ ٹیوٹر جو ہیں۔''
''شاعر خود خاموش ہے۔''
''تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی، مگر خوشخبری سنادی کہ وصال فیل ہو گئے؟''
''جی ہاں، فی الحال تو یہی ہے۔ آگے پڑھیں۔''
رضیہ نے اگلا مصرعہ پڑھا۔ ذرا اٹک اٹک کر مگر ٹھیک پڑھا ''اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا''
میں نے رضیہ کی دلجوئی کے لیے ذرا سرپرستانہ انداز میں کہا ''شاباش، آپ نے بہت اچھا پڑھا ہے۔''
''اس شاباش کو تو میں ذرا بعد میں فریم کروں گی۔ اس وقت شعر کے پورے معنی بتا دیں۔''
ہم نے رضیہ کا طنز برداشت کرتے ہوئے کہا ''مطلب صاف ہے۔ غالب کہتا ہے۔ قسمت میں محبوبہ سے وصال لکھا ہی نہ تھا۔ چنانچہ اب موت قریب ہے، مگر جیتا بھی رہتا تو وصال کے انتظار میں عمر کٹ جاتی۔''
''توبہ اللہ، اِتنا lack of confidence، یہ غالب اتنے ہی گئے گزرے تھے؟''
''گئے گزرے۔۔۔؟ نہیں تو۔ غالب ایک عظیم شاعر تھے۔''
''شاعر تو جیسے تھے، سو تھے، لیکن محبت کے معاملے میں گھسیارے ہی نکلے۔''
''لاحول ولاقوۃ۔ آپ غالب کو گھسیارہ کہتی ہیں؟ وہ نجم الدولہ تھے۔''
''شاہ دولہ ہوں گے۔ بے چارے عمر بھر وصال کو ترستے رہے۔''
''محترمہ شاعری میں تو فرضی باتیں ہوتی ہیں۔ غالب نے شعر لکھا ہے عدالت میں حلفیہ بیان نہیں دیا۔''
''وکیل صفائی صاحب۔ آپ ملزم سے بھی زیادہ چست نظر آتے ہیں۔ یہ فرمائیں، آپ کے نجم الدولہ صاحب کی شادی بھی ہوئی یا نہ؟''
''یقیناً ہوئی۔''
''کسی بوڑھی کزن سے ہوئی ہوگی۔''
''نواب زادی تھی اور بوڑھی بھی نہ تھی، مگر خود لونڈے ہی تھے۔''
''میں نہ کہتی تھی کہ کچھ mal-adjustment ضرور تھی۔''
''لیکن محترمہ آپ کا پرچہ غالب کی شادی پر نہیں، غالب کی شاعری پر ہوگا۔''
''شاعر کو شاعری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔''
''لیکن اگر آپ نے امتحان سے پہلے دیوان ختم کرنا ہے تو جدا کرنا پڑے گا۔''
''مجھے امتحان کی فکر نہیں۔ پہلے غالب کا فیصلہ ہونا چاہیے۔''
''بہت اچھا، تو فرمائیں، غالب نے کیا قصور کیا ہے؟''
''غالب نے محبت میں مار کھا کر بے معنی شعر لکھے ہیں اور لوگوں کو الو بنایا ہے۔''
''محترمہ، الو بڑا غیر پارلیمانی پرندہ ہے اور غالب کے چاہنے والوں میں تو اچھے اچھے لوگ ہیں۔ مثلاً۔۔۔''
''آپ اچھے لوگوں کی فکر نہ کریں۔ ویسے میں نے آپ کو ان پرندوں میں شامل نہیں کیا۔) چھوٹے سر وار چھوٹے قد کی فاتر العقل مخلوق جسے ایک بزرگ کی نسبت سے شاہ دولہ یا شاہ دولہ کے چوہے کہتے ہیں''
''مجھ پر یہ نظرِ عنایت کیوں؟ میں بھی تو غالب پرست ہوں۔''

''آپ کی جگہ اصلی ٹیوٹر نے لے رکھی ہے۔''

''تو آپ مولوی عبدالرحمٰن کو الو سمجھتی ہیں؟''

''غالباً ان کا اپنا یہی خیال ہے''

''محترمہ ٹیوٹر اور الو؟''

''جی ہاں، وہ تہہ دل سے چغد ہیں۔''

''اور ہم؟''

''آپ کی بات اور ہے۔''

''ہماری کیا بات ہے۔''

''بس آپ چغد نہیں۔''

''بڑی رعایت کی آپ نے ہم پر۔''

''تو آپ شاہین بننا چاہتے ہیں کیا؟''

''ہم ہیں ہی شاہین!''

''تو پھر بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔''

''اور اگر یہاں آنا چاہیں تو؟''

''تو براہ مہربانی یہ خوبصورت اچکن بدل کر آئیں۔''

ساتھ ہی رضیہ نے ہماری ٹوپی سے لے کر اچکن کے نچلے سرے تک دیکھا اور بے اختیار ہنس دی۔ اتنے میں ساتھ کے کمرے سے بیرسٹر صاحب کی آواز آئی ''بیٹا رضیہ، آپ کی پڑھائی کا وقت ختم ہوا۔ اب آ چلیں باہر۔''

رضیہ نے کتاب بند کر دی اور بولی ''تو عارضی ٹیوٹر صاحب، خدا حافظ۔''

''گویا آپ کا مطلب ہے کل نہ آؤں؟''

'' اتنے عارضی بھی نہ بنیں۔ کل آیئے۔ پرسوں آیئے اور آتے رہیئے۔''

''پرسوں تو مولوی صاحب آ جائیں گے۔''

''اللہ تعالیٰ اُن کی والدہ کو دو دن ٹھہر کر شفا دے دے گا۔''

اتنے میں بیرسٹر صاحب کی آواز کی بجائے ان کا چہرہ نمودار ہوا اور میں نے آہستہ سے خدا حافظ کہہ کر رخصت لی۔

ہم دوسرے روز کپڑے بدل کر پڑھانے گئے۔ سبق تو دوسرے شعر سے بہت آگے نہ بڑھا لیکن باہمی مفاہمت میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ تیسرے روز مولوی صاحب آ گئے اور ہمیں دوستوں نے آ گھیرا کہ دو روزہ ٹیوشن کی روداد سنا۔ ہم نے روداد سنائی تو دوست ہماری خوبی قسمت پر خوشی سے جھوم اٹھے۔ ہم کہانی سنا چکے تو ہماری کلاس کے ذہین مسخرے، لطیف نے باقی لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''دوستوں خاموشی اور ذرا توجہ سے سنئے۔''

ساری کلاس خاموش ہو گئی تو لطیف نے بولنا جاری رکھا '' میرا ستاروں کا علم کہتا ہے کہ اگلے سال ہمارے اِس خوش نصیب ہم جماعت کی شادی ہو جائے گی۔ ذرا بتاؤ تو سہی اس کی دلہن کا کیا نام ہوگا؟''

ساری جماعت نے یک زبان ہو کر کہا ''رضیہ!''

اس پر بے پناہ تالیاں بجیں۔ لڑکوں نے مجھے کندھوں پر اٹھایا اور خوب اودھم مچایا۔

قارئین، کیا آپ کو بھی میرے ہم جماعتوں سے اتفاق ہے؟ سنئے اگلے سال رضیہ سچ مچ، دلہن تو بنی لیکن ہماری نہیں، مولوی عبدالرحمٰن کی! حادثہ یہ ہوا کہ ٹیوشن کے بعد مولوی عبدالرحمٰن اور ہم سی ایس پی کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور مولوی صاحب ہمیں یہاں بھی دو سو نمبر میں پیچھے چھوڑ گئے۔ اس کامیابی کے بعد ان کے لیے رضیہ سے شادی میں ایک ہی رکاوٹ تھی اور مولانا نے یہ رکاوٹ برضا و رغبت نائی کے ہاتھوں دور کرا دی۔ برضا و رغبت اس لیے کہ بقول مولوی صاحب، ایک دن انھوں نے کانی آنکھ سے رضیہ کو دیکھ لیا تھا اور پھر دل میں عہد کر لیا تھا کہ داڑھی کیا چیز ہے یہ لوح و قلم تیرے ہیں۔ اِدھر بیرسٹر صاحب تو مولوی عبدالرحمٰن کے نام کے ساتھ ایس پی دیکھ کر داڑھی کی قربانی پر مصر نہ تھے۔ رہے ہم تو جونہی مولوی صاحب اپنی دلہن کو لے کر ہنی مون پر روانہ ہوئے، ہم دیوان غالب کھول کر ایک لاجواب غزل الاپنے لگے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

شوکت علی مظفرؔ

سیاستدانوں کی ورائٹی

انسان کہلانے کیلئے امریکی ہونا شرط ہے جبکہ سیاستدان ہونے کیلئے پاکستانی ہونا۔

انسانوں اور سیاستدانوں میں وہی فرق ہے جو صابن اور جھاگ میں ہوتا ہے۔ صابن سے جھاگ بنایا جاسکتا لیکن جھاگ سے صابن نہیں بنایا جاسکتا اور یہی کچھ سیاستدان کرتے ہیں، وہ عوام کو انسانی حقوق فراہم کرنے کے دعوے کرتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دعویٰ کوئی قرآن وحدیث نہیں ہوتا۔

اس دنیا میں جتنے مسائل ہیں اتنے ہی سیاستدان ہیں اور سب بڑا مسئلہ عوام خود ہیں۔ ہر بندہ اپنے اندر سیاسی صلاحیتیں پیدائش کے ساتھ ہی لے کر دنیا میں نمودار ہوتا ہے۔ آتے ہی رونا شروع کردیتا ہے کہ اسے ''روٹی، کپڑا اور مکان'' چاہیے۔ جیسے ہی ننھا سیاستدان جھولے میں لیٹتا ہے، ہاتھ میں فیڈر پکڑ کر پیتا بعد میں، ہنستا پہلے ہے کہ کیسا رو رو کر سب کو بے وقوف بنالیا۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا ہے سیاست کے جراثیم بھی بڑھ جاتے ہیں، اسکول اس شرط پر جاتا ہے کہ اسے نیا یونیفارم ملے نہ ملے لنچ باکس اور خرچی ضرور ملنی چاہیے۔ کالج میں سیاست کے انداز نرالے ہوجاتے ہیں، لنچ باکس اور خرچی سے زیادہ اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ مخالف جنس کا ''ووٹ'' اپنی طرف کیسے مائل کیا جائے۔ یہاں ووٹ کی اصطلاح عموماً دل اور پیار استعمال کی جاتی ہے۔

اصل سیاست شادی کے بعد شروع ہوتی ہے جب ایک بہو کو ساس کے وار سے بچنے کیلئے سیاسی چالیں چلنا ہوتی ہیں، جبکہ ساس اپنے ''باغی بچے'' کا ووٹ اپنے حق میں کرنے کیلئے بہورانی کے مختلف کارناموں کی تختیاں دکھاتی رہتی ہیں۔ جبکہ اصل سیاسی امیدوار شوہر ہوتا ہے جو بیک وقت دو مختلف پارٹیوں کو بے وقوف بنانے کے ساتھ ساتھ بچہ لوٹا قسم کے سیاسی جھمیلوں سے بھی نبرد آزما رہتا ہے۔ بہرحال آج ہم نے سیاست کے لنڈا بازار سے سیاستدانوں کی مختلف اقسام چھانٹی کرنے کی کوشش کی ہے، کسی سیاستدان کی نشانی کسی سے بھی اتفاقیہ مل جانا اس کی اپنی ذمہ داری ہے۔

عوامی سیاستدان

یہ سیاستدان ہمیشہ عوام کے حق میں بات کرتے ہیں اور موقع ملتے ہی عوام سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ جب تک اقتدار میں رہیں عوامی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی بھی کام ایسا نہیں کریں گے جس سے ان کی اپنی ذات کو فائدہ نہ ہو۔ عوامی سیاستدان خود کو بھی ایک عام فرد کے درجے پر سمجھتے ہوئے پہلے

اپنے گھر سے خیرات بانٹنا شروع کرتا ہے اور جب اپنے رشتہ داروں کی تمام فرمائشیں اور ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو پھر عوام کی طرف دیکھ کر دوبارہ نئے جذبے سے اپنے رشتہ داروں کے مسائل حل کرنے میں جت جاتا ہے۔ ایسے سیاستدان ہمیشہ اپنا بیان، حلقہ اور پارٹی بدلنے میں دیر نہیں لگاتے۔

ہرفن مولا سیاستدان

اس قسم کے سیاستدان عوام کے مسائل حل کرنے میں سب سے آگے آگے ہوتے ہیں لیکن جوں ہی مسئلہ حل ہوتا نظر آجائے یہ سب سے پیچھے دکھائی دیں گے اور مسئلہ حل کرنے والوں کی ٹانگیں کھینچنا شروع کر دیں گے۔ ٹانگیں کھینچنے میں ناکامی ہو تو مسئلے کو کھینچ کر بڑا کر دیں گے۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ مسائل حل ہونے کیلئے نہیں ہوتے، کیش کرنے کیلئے ہوتے ہیں۔

جلالی سیاستدان

یہ سیاستدان مائیک سامنے دیکھتے ہی جلال میں آجاتے ہیں۔ عوام کو رعب میں لینے کیلئے مائیک پر ہاتھ مار کر انہیں گرانے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں جس طرح پہلوان مخالف پہلوان کو لنگوٹی ڈال کر گراتا ہے۔ بعد میں مائیک ٹوٹنے کا خرچہ بھرتے ہوئے ان کے آنسو نکل آتے ہیں جنہیں ان کے رفقائے کار عوام کی بدحالی دیکھ کر غمزدہ ہونا بتاتے ہیں جب کہ مخالفین مگرمچھ کے آنسو قرار دیتے ہیں۔

نامعلوم سیاستدان

یہ سیاستدان اکثر نامعلوم حرکتیں رہتے ہیں جو آئے روز میڈیا کی زینت بنی رہتی ہیں۔ یہ جادوگر قسم کے سیاستدان ہوتے ہیں، سب کے سامنے ہوتے ہوئے بھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ زیادہ تر ٹیلی سیاست سے کام چلاتے ہیں، دوسرے سیاستدانوں کے اشارہ آبرو پر ان کے حامی کچھ بھی کر سکتے ہیں تو نامعلوم سیاستدانوں کو تو اشاروں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، ان کے سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے ماحول بنتا اور بگڑتا ہے۔ آج کل سیاست میں ان کا ہی بول بالا ہے کیونکہ بول بچن ہی ان کی پہچان ہوتی ہے۔

لیچڑ سیاستدان

اس طرح کے سیاستدان عموماً بڑے عہدوں پر پائے جاتے ہیں اور کرسیوں پر چپک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انہیں کاموں سے چڑ اور فنڈ سے محبت ہوتی ہے۔ کرسی چھن جائے تو روتے بعد میں ہیں پہلے سرکاری سامان ٹرک میں لوڈ کر محفوظ مقام پر منتقل کرواتے ہیں۔ اتنا موت سے نہیں ڈرتے جتنا کرسی چھن جانے سے ڈرتے ہیں۔ کرسی چھن جائے تو دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنا لیتے ہیں۔

معصوم سیاستدان

ایسے سیاستدان، سیاست کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ جو وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں لیکن عقل مند اتنے ہوتے ہیں کہ کوئی وعدہ نہیں کرتے۔ مسائل کو چٹکیوں میں حل کر دیتے ہیں لیکن پہلے عوام کو یہ ثابت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے کہ مسئلہ اصل میں ہے کیا؟ عوام کے غم میں ہر وقت گھلتے رہتے ہیں۔ غریب عوام کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے، اسی لیے زیادہ تر دوروں پر رہتے ہیں۔ جب حالات اور ماحول سازگار ہو تو ملک کا دورہ بھی کر لیتے ہیں۔ یہ اتنے معصوم ہوتے ہیں کہ روزانہ کی بنیاد پر کرپشن ہو جائے تب بھی اسے غلطی سمجھتے رہتے ہیں، ایسی غلطیاں دہرانا بھی ان کے نزدیک بھولپن قرار پاتا ہے۔

شی میل سیاستدان

ایسے سیاستدان باتیں مردوں جیسی کرتے ہیں لیکن عملی طور پر عورتوں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ سیاست میں لین دین کو برا سمجھتے ہیں اس لیے بیان دینے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ساری زندگی شادی نہیں کرتے لیکن شادی کا نام سن کر ان کہ شرماہٹ دیکھنے لائق ہوتی ہے، لیکن خود کسی لائق نہیں ہوتے۔ پروٹوکول انہیں سخت ناپسند ہوتا ہے، ہر معاملے کو تنہائی میں نمٹانے کے خواہش مند ہوتے ہیں اس لیے جو بھی معاملہ نمٹانے بیٹھیں بس بیٹھے ہی رہ جاتے ہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان ہوتے ہیں لیکن ایسے نیم سیاستدان خطرۂ جانشین ہوتے ہیں۔ ایسے سیاستدان کارنامہ انجام دینے کی بجائے نام کی تختی لگانے سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ جتنا پیسہ تختی پر آتا ہے، اس سے یہ اپنی جیب گرم کر لیتے ہیں۔

فی میل سیاستدان

جس طرح عورت کائنات کا رنگ ہے اسی طرح سیاست بھی عورت کے بغیر نامکمل ہے۔ فی میل سیاستدان معاشرتی مسائل سے زیادہ اپنے چہرے کے کیل مہاسوں کیلئے پریشان ہوتی ہے۔ سڑکوں کی تعمیر کا ٹھیکہ پاس کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیتی ہیں کہ انہوں نے خود تو اس سڑک سے نہیں گزرنا، اگر گزرنا ہو تو پھر جمپ نہ رکھنے کی شرط لازمی رکھتی ہیں۔ فی میل سیاستدان اخبارات سے دور بھاگتی ہیں، کیونکہ اخبار والے ان کی بات پوری سنتے ہی نہیں، سنتے ہیں تو پوری چھاپتے نہیں۔ پھر بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر اخبار میں بہت سی سرخیاں ہوتی ہیں جبکہ انہیں ایک وقت میں صرف ایک ہی سرخی استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ملنگ سیاستدان

جو زندگی سے تنگ ہو جاتا ہے وہ ملنگ ہو جاتا ہے اور سیاست کے دربار میں بھی بہت سے ملنگ سیاست دانوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ ایسے سیاستدان قوم کی تقدیر دعاؤں سے بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں، دعا اس لیے نہیں کرتے کہ کہیں قبول ہی نہ ہو جائے۔ انہیں کرسی مل جائے تو اسے بھی گدی سمجھتے ہیں، یعنی اس پر بھی اپنی اولاد کا حق سمجھتے ہیں۔ انہیں سیاست کی خدمت کرنے کا کہا جائے تو سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔

رنگیلے سیاستدان

یہ سیاستدانوں کی وہ قسم ہے جو سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کی ٹانگیں قبر میں بھی ہوں تو بھی آنکھیں وینا کی خبر پر ہوں گی۔ سیاست میں آنے سے پہلے یہ بسوں میں سفر کر کے نوکریاں ڈھونڈنے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے سیاست میں آ کر جہاز میں اگلی سیٹوں پر یہ سوچ کر بیٹھتے ہیں کہ یہ لیڈیز کی جگہ ہے۔ فیملی سیاست سے اس لیے الرجک ہیں کہ اس میں فی میل اپنے گھر کی ہوتی ہیں۔ خواتین امیدواروں کو ٹکٹ دینے کی خاطر اپنی ذاتی پارٹی بنا لیتے ہیں۔ اکثر ان کا انجام بہت برا ہوتا ہے، اتنا برا کہ کسی سیاستدان خاتون سے ہی ان کی شادی ہو جاتی ہے اور بالآخر دونوں کا سیاسی کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔

خانزادہ خان

چوزہ بھی ایک کردار ہے

فارسی زبان کی کہاوت ہے ''کار نہ دارد بز بخر'' کہ ''اگر تمہیں کوئی کام نہ ہو تو بکری پالو'' بکریاں پالنے والوں کا کہنا ہے کہ بزدار کو عید کے دن بھی چھٹی نہیں ملتی۔ صحرائی لوگوں کا کہنا ہے: ''جو لوگ گھوڑے پالتے ہیں اُن میں تکبّر آ جاتا ہے، جو اونٹ پالتے ہیں اُن میں بُردباری اور استقامت پیدا ہوتی ہے جبکہ بکریاں پالنے والوں میں حوصلہ اور توازن جیسی صفات پیدا ہوتی ہیں''۔

اگر آپ کو کبھی گھوڑا، اونٹ یا بکری پالنے کی بجائے کوئی چوزہ پالنا پڑ جائے تو آپ ایک نئے تجربے سے گزریں گے، جو کہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ ہوگا۔ چند روز پہلے کی بات ہے، ہُوا یوں کہ گلی میں چوں چوں کی آواز اُبھرتی چلی گئی۔ چند لمحے بعد ایک گھبرایا ہوا اور بے چین سا چوزہ گیٹ کے نیچے سے گزر کر ہمارے آنگن میں وارد ہوا۔ میرے چھوٹے بچوں جویریہ، وقار اور زہرہ نے اِس چوزے کا جو خیر مقدم کیا وہ بچوں کے ہاتھ سے ہی لکھا جا سکتا ہے۔

گلی میں وائی فائی کی طرح گھومتی اور جھومتی بلیوں سے معلوم نہیں یہ کیسے بچ نکلا، حالانکہ یہ چوں چوں کے الارم بجا کر بلیوں کو دعوتِ نوالہ بھی دے رہا تھا اور اُس کے پروں پر لگا ہوا شیشی رنگ بھی بتی کی طرح لشکارے مار رہا تھا۔ بہر حال ممتا سے محروم یہ فارمی چوزہ بچوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر کسی حد تک سکون پانے لگا۔ یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ یہ چوزہ اڑوس پڑوس کے کِس گھر سے آیا ہے؟ بچوں نے گھر میں موجود چاول، دال، روٹی کے ٹکڑے، تل اور ایک بڑی ٹرے میں پانی لا کر اِس کے آگے لا کر رکھ دیا۔ چوزے نے اِن تمام چیزوں کو سیر چشمی سے دیکھا۔ دال، چاول پر زیادہ چونچیں نہیں ماریں، تھوڑے سے تل چگنے کے بعد ایک مکھی پر کامیاب وار کیا جس پر بچوں نے تالیاں بجا کر اِسے بھرپور داد دی۔ بچوں کا خیال تھا کہ یہ چو مکھی جنگ جاری رہے گی لیکن چوزے نے صرف مکھیوں پر یہی واضح کرنا تھا کہ دخل در ''ماکولات'' قبول نہیں۔

اڑوس پڑوس سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ چوزہ اِس محلے کے کسی گھر کا نہیں ہے تو بچوں کو قدرے سکون ہوا۔ بچوں نے اِس کے لیے ایک ڈربہ بنانے کے مختلف منصوبے پاس کیے۔ سب سے آسان اور وقتی حل یہ نکالا کہ قریبی دُکاندار سے ایک خالی ڈبہ لایا جائے۔ بچے چونکہ قریبی دُکانداروں سے چپس اور ملائیاں کھاتے رہتے ہیں اِس لیے دُکاندار اُن کی بڑی عزت کرتے ہیں، یوں ایک اچھی کوالٹی کا ڈبہ انہیں مفت میں مِل گیا۔

کہا جاتا ہے مشہور سائنسدان نیوٹن کو اصیل مرغے پالنے کا شوق تھا۔ ایک دفعہ اُس نے بھی مرغوں کے ایک جوڑے کے لیے ڈربہ بنانا چاہا تھا کیونکہ نیوٹن کے زمانے میں پاپڑ، ملائیاں اور گتے کے ڈبے نہیں ہوا کرتے تھے، اِس لیے نیوٹن کچھ لکڑیاں اور تختے لے کر ایک بڑھئی کے پاس گیا اور اُسے کہا کہ میری مُرغی اور مرغے کے لیے ایک ایسا ڈربہ بناؤ جس کے دو دروازے ہوں ایک مرغی کے لیے اور دوسرا مرغے کے لیے اور ہاں دیکھنا جو دروازہ مرغے کے لیے بناؤ گے وہ ذرا بڑا ہو کیونکہ مرغا جسامت میں کچھ زیادہ

ہے۔تین چار دن بعد نیوٹن جب ڈربہ لینے گیا تو وہ یہ دیکھ کر پریشان سا ہوگیا کہ ترکھان نے ڈربے کا صرف ایک ہی دروازہ بنایا ہے۔اُس نے ترکھان سے شکوہ کیا کہ تُو نے مرغی کے لیے دروازہ کیوں نہیں بنایا۔ترکھان نے نیوٹن کو سمجھایا کہ جو دروازہ مرغے کے لیے بنا ہے وہی مرغی کے بھی کام آئے گا،تو نیوٹن کو شرمندگی ہوئی۔معلوم نہیں وہ ڈربے کا آرڈر دیتے وقت کون سی چوتھی مساوات سوچ رہا تھا؟ سچ ہے کہ اکثر بڑے لوگ غبی ہوا کرتے ہیں۔

ہمارا چوزا دو ہفتے تک تو ہر قسم کی زمینی آفتوں (بلیوں) سے تو بچا رہا لیکن فارسی کے مشہور شاعر انوری کی طرح آسمانی آفتوں کی زد میں آ گیا۔ ہوا یوں کہ دو کوؤں کی نظرِ بد اس پر پڑ گئی۔ براہ راست حملہ کرنے سے پہلے انہوں نے ٹی وی انٹینا کو بطورِ مستقر استعمال کیا جیسے انگریزوں نے ہندوستان پر پنجہ مارنے سے پہلے کلکتہ میں ٹھیکی لی تھی۔ یہ انٹینا تو اپنی گردن اُٹھا کر رکھے ہوئے تھا اور کلکتہ کی طرح اِسے اپنے اگلے جنم میں کولکتا بننا گوارا نہ تھا، چین کے طوطے کی طرح سیدھا زمین پر بے سدھ گر گیا، میں باہر دوڑا، اِس دوران کوؤں نے چوزے کو دبوچا ہی تھا کہ میں اِسے زخمی حالت میں چھڑوانے میں کامیاب ہو گیا۔ گردن اور پروں کے بیچ گہری چونچ لگنے سے یہ جہاں زخمی ہوا وہیں اب گردن کو سیدھی نہیں رکھ سکتا۔اس کی چوں چوں میں جو ٹھہراؤ آ چکا تھا اب اُس میں کسی انجانے واہمے نے خوف سا شامل کر دیا ہے گویا اِس چوزے نے اِس دنیا کو جیسا سوچا سمجھا تھا یہ ویسی نہیں ہے اور جیسے اُس پر یہ بھی کھلا ہو کہ آفتیں زمینی ہی نہیں آسمانی بھی ہوا کرتی ہیں۔

میری بیٹی زہرہ جو ابھی سکول نہیں جاتی، اُس کا خیال ہے کہ اگر ہمارے پاس ٹوٹی (اسٹیتھوسکوپ) ہوتو ہم اس کا علاج کر سکتے ہیں۔ جبکہ وقار اور جویریہ جو پہلی اور تیسری میں پڑھتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اس کے علاج میں ہمیں دیر نہیں لگانی چاہیے۔ بچے مختلف ڈاکٹروں پر غور کر رہے ہیں۔ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ اگر اُس کے پاس لے جائیں تو وہ اتنی زیادہ دوائیاں دے گی کہ کئی ہفتوں تک اِس کو دانے دُنکے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ بچوں نے ایک اور ڈاکٹر کے متعلق بھی معلومات حاصل کر رکھی ہے کہ جس نے حال ہی میں کلینک کھولا ہے اُن کا خیال ہے کہ یہ نیا ڈاکٹر بہت ہی کم دوائیاں لکھ کر دیتا ہے۔

جب سے چوزہ زخمی ہوا ہے بچوں نے اِسے گھر کی چیزیں کھلانے کی بجائے بازار سے چوگ، باجرہ لا کر کھلانا شروع کر دیا ہے۔ بچے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ یہ چوزہ بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ میں نے بچوں سے کہا کہ پاکستان میں تو ہر چوزہ بڑا ہو کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا پسند کرتا ہے یہ تو اسی کو پتہ ہوگا!۔ بچے کہتے ہیں ہمارا مطلب ہے کہ یہ مرغی بنے گا یا مرغا؟۔۔میں بچوں کو سمجھاتا ہوں کہ دیکھئے! اگر اِس نے گھریلو اور سادہ خوراک کھائی تو پھر یہ مرغی یا مرغا بن پائے گا اگر فارمی اور بازاری چیزیں ہی کھاتا رہا تو پھر نہ مرغا بنے گا نہ مُرغی بلکہ چوزے کا چوزہ ہی رہ جائے گا۔بچوں نے کہا ہمیں اسے بلی اور کوؤں سے بھی بچانا ہوگا۔ بلی سے بچانے کے لیے بچے گلی کا دروازہ تو پہلے دن سے ہی بند رکھتے تھے اب وہ کوؤں پر بھی نظر رکھنے لگے ہیں۔ مجھ پر پہلی دفعہ واضح ہوا کہ سیکوریٹی ایک احساس کا نام ہے اور زندہ رہنے کے لیے یہ احساس اُتنا ہی ضروری ہو چکا ہے جتنا کہ غذا، پانی اور آکسیجن ضروری ہے، زندگی تو بجائے خود اِس چوزے ہی کی طرح معصوم سی چیز ہے۔

چوزہ یہ بات جان چکا ہے کہ یہ ننھے منھے بچے اُس کے مونس اور ہمدرد ہیں اسی لیے وہ اُن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ بچے سیماب پا ہوتے ہیں لیکن وہ ہر لحظہ اِس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ یہ پاؤں کے نیچے کُچلا نہ جائے، گویا اِس چوزے نے اُنہیں زمین پر دھیان سے چلنے کا گُر سکھا دیا ہے کہ ۔

یہ وہ مقام ہے میاں یاں ہر گھڑی دھیان رکھ

یوں لگتا ہے کہ زندگی کے متعلق انسان اور چوزہ ایک ہی جیسی تشکیک میں مبتلا ہیں۔ اُستاد دامن نے خوب ہی کہا تھا:

خون جگر دا تلی تے رکھ کے دھرتی پوُجدے پوجدے گزر چلے
ایتھے کیویں گزاریئے زندگی اے گل سوچدے سوچدے گزر چلے

نادر خان سرگروہ

دُم سا نہیں دیکھا

خیالِ خام ۔۔۔ عام ہے کہ دُم میں کچھ نہیں ہوتا، یعنی دُم میں دَم نہیں ہوتا۔ پھر بھی ہر جانور کے ساتھ یہ دُم کی طرح لگی ہوتی ہے۔ دُم کا سِرا پکڑ کر جب ہم نے سوچنا شروع کیا تو لٹکتے، جھولتے اِس نتیجے پر پہنچے کہ دُم کے ہونے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جانور اَب یہاں آکر ختم ہو چکا ہے۔ اِس کے علاوہ یہ جانوروں کی ستر پوشی اور مکھیاں اُڑانے کا کام بھی کرتی ہے۔ اور کبھی کوئی چشمِ بینا کسی جانور کی شناخت کے مسئلے میں اُلجھے تو یہ دُم ہی صحیح پہچان بتانے میں اُس کی مدد کرتی ہے۔ لیکن کبھی وہ دَم سادھے گھوڑے کی پچھاڑی سے اُسے پہچاننے کی غلطی کرے تو گھوڑا اچھے سے اُکھڑ جاتا ہے اور بلا سمجھے بوجھے عینی شاہد کا دَم اُکھاڑ دیتا ہے۔

دُم اور دَم، دیکھنے میں ایک جیسے، اگر فرق ہے بھی تو ہاتھی کی دُم برابر۔ دُم کی دال زیر پیش اور دَم کی دال زیر زبر ہوتی ہے۔ ویسے جب دُم کا ذکر آتا ہے تو کُتا پیش پیش ہوتا ہے اور اُس کی دُم زیرِ بحث ہوتی ہے (بحث اکثر ٹیڑھے موضوعات پر ہی ہوتی ہے، جس میں ایک دوسرے کو زیر کرنا پیش نظر ہوتا ہے)۔

بے چارے کتے کا دَم نکل جاتا ہے، مگر اُس کی ٹیڑھی دُم ۔۔۔ مزید ٹیڑھی نہیں ہوتی۔ ہمیں تو اِس کتے کے بچے کی ٹیڑھی دُم کا محاوروں اور ضرب الامثال میں استعمال کے علاوہ کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ ہمارے دوست پُر جوش پُوری یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ وہ اسی کو ہلا کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے، اور جب مالکان اِس پر تکیہ کر کے سوتے ہیں تو یہ اُونگھتے سُونگھتے، نگہبانی کرتے ہوئے دُم ہلا ہلا کر اپنی خبرداری کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ عافیت اِسی میں ہے کہ یہ ہلتی رہے، ایسا نہ ہو کوئی دُم پر پاؤں رکھ دے۔ اِسی لیے کتا جب موت کی نیند سو رہا ہو تب بھی ۔۔۔ ''حرکتِ کلب' بند نہیں ہوتی۔''

ایک جانور ٹیڑھا ۔۔۔ جس کا سیدھا سیدھا رشتہ ہم انسانوں سے بتایا جاتا ہے۔ یہ اپنی دُم سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتا ہے، جھٹکنے سے لے کر لٹکنے تک۔ اِس کی دُم اِس کا تیسرا ہاتھ ہوتا ہے یا تیسری ٹانگ ہوتی ہے، جسے یہ جا بہ جا اُڑاتا رہتا ہے۔ چوں کہ بندر ایک مصروف ترین جانور ہے، اِس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو تب بھی یہ بہت کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ فراغت میں بھی اِسے سَر کھجانے 'سے' فُرصت نہیں ملتی۔ اپنا نہیں تو ساتھی بندر کا سَر کھجا کھجا کر اُس کے کان پر رینگنے کے لیے ایک بھی جُوں نہیں چھوڑتا۔ ایسے میں بندر کی دُم ایک اہم موقع پر اُس کا ساتھ دیتی ہے۔ دُم کا پھندا درخت کی شاخ میں ڈال کر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی نقل اُتارنے والوں کی نقل اُتارتا ہے۔

کینگرو کی دُم اُتنی ہی لمبی ہوتی ہے جتنا لمبا کینگرو خود ہوتا

مچھلیاں اور دیگر آبی جاندار اپنی دُم کو تیراکی اور رُخ بدلنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آبی جاندار سے یاد آیا کہ شکاریات کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ برازیل میں دریائے امیزن کیکنارے رہنے والے مقامی باشندے، چھوٹے چھوٹے مگرمچھ زندہ پکڑ کر گھروں کے سامنے رسیوں سے باندھ دیتے ہیں اور حسبِ ضرورت تھوڑی تھوڑی دُم کاٹ کر کھاتے رہتے ہیں۔ اِس عمل کے دوران مگرمچھ زندہ رہتا ہے۔ جب پوری دُم ختم ہو جاتی ہے تو مگرمچھ کو مار کر بڑی دعوت کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ مگرمچھ کو دُم سے قسطوں میں ذبح کرتے ہیں۔ ایک دَم سے ذبح نہیں کرتے۔

ہاتھی دوڑتے وقت یا کسی خطرے کی صورت میں اپنی چھوٹی سی دُم کو علَم کی طرح اُٹھائے رکھتا ہے، تاکہ بے تحاشا دوڑنے میں کہیں اٹک نہ جائے، لیکن اتنی چھوٹی دُم اُس کے شایانِ شان نہیں۔ اگر دُم بھی سونڈ کے برابر ہوتی تو اُس سے ایک وقت میں دو۔۔۔ دو شہتیر اُٹھوائے جا سکتے تھے، لیکن اگر غور کیا جائے تو اِس میں بھی خیر کا پہلو نکلتا ہے، کیوں کہ اِتنی چھوٹی ہونے کے باوجود بھی یہ اکثر اَٹکی رہ جاتی ہے۔

دنیا میں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن میں ہاتھی نکل جاتا ہے، مگر دُم اَٹکی رہ جاتی ہے اور اُسی دُم کے نکالنے میں انسان کا دَم نکل جاتا ہے۔ کبھی کبھی انسان کی پوری زندگی میں اُس کے مقصد کی صرف دُم ہی نکل پاتی ہے اور پورے کا پورا ہاتھی اٹکا رہ جاتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کاتبوں کی ''غلط نوازیوں'' سے بہت دل برداشتہ خاطر رہتے تھے۔ مولانا ظفر الملک علوی (ایڈیٹر ماہنامہ الناظر) کو ایک خط (مطبوعہ الناظر، یکم جنوری ۱۹۱۰ء) میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اپنے مسودات خود نہیں پڑھ سکتا۔ کاتب کو ہدایت میں نہایت دقت ہوتی ہے۔ کاتب صاحب ایسے ''ذی استعداد'' ہیں کہ ''کونسلوں میں سیٹ'' کو ''گھونسلوں میں بیٹ'' لکھ دیتے ہیں۔''
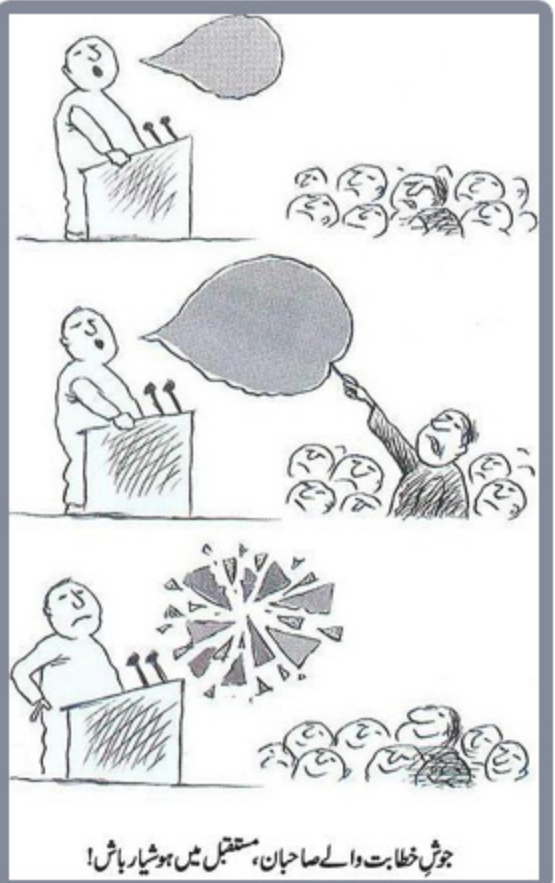
جوشِ خطابت والے صاحبان، مستقبل میں ہوشیار باش!

ہے۔ یعنی اگر کہیں سے کینگرو نکل جائے اور اُس کی دُم رہ جائے تو ہم کہیں گے کہ آدھا کینگرو اَٹکا رہ گیا ہے۔ اَڑتالیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جست لگانے والا یہ جانور اِسی مضبوط دُم سے اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ اِس پُرجوش پُوری حیرت کا اظہار یوں کرتے ہیں، ''واہ بھئی! کیا دَم دار دُم ہے!''

چھپکلی کی دُم کٹنے کے بعد بھی کچھ دیر تک تڑپتی رہتی ہے۔ بندہ اِسے دیکھ کر دَم بخود رہ جاتا ہے۔ چھپکلی جب چاہے اپنی دُم کو اپنے جسم سے علیٰحدہ کر سکتی ہے، جب کہ چُوہے کی دُم چھپکلی کی دُم سے قدرے مضبوط ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک طرف سے آپ زور لگائیں اور دوسری طرف سے چُوہا، تو دُم اُکھڑ بھی سکتی ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے چُوہے کا تعاقب کرتے ہوئے اُس کی دُم پر پاؤں رکھا۔ اُس نے تڑپ تڑپ کر زور لگایا اور وہیں۔۔۔ دُم توڑ کر نکل گیا۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈاکٹر کی فیس

انگریز سرمایہ داری نظام کا پروردہ ہے اور حقیقت میں ایلوپیتھک یا جدید طبی علاج بھی اس ہی کی دریافت ہے۔ لہذا ڈاکٹر کے ساتھ اس کی فیس کا تصور پہلے ہی دن سے وجود میں آ گیا جب کہ اس کے برعکس حکمت کا شعبہ اس کاروباری انداز سے دور رہا (البتہ آج کل کے دور میں یہ بھی اس کاروباری نظام میں اتنا ہی آلودہ ہے) لہذا سو سال قبل کے اکبر الہ آبادی ہوں یا پچاس سال پہلے کے اختر شیرانی یا ظریف جبلپوری یا عہدِ حاضر کے سرفراز شاہد، انعام الحق جاوید،، اسد جعفری، امیر الاسلام ہاشمی خاور نقوی یا فاخرہ بتول سب کے کلام میں ڈاکٹر کی فیس کی چبھن کی ایک جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ انگریزی اقدار کا مضحکہ اڑانے میں اکبر الہ آبادی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ڈاکٹری یا جدید ایلوپیتھک طریقہء علاج بھی انگریزوں کی ایجاد ہی سمجھا گیا لہذا اکبؔر کا یہ شعر آج بھی حقیقت حال کا اتنا ہی غماز ہے جتنا کہ ایک صدی پہلے تھا:

اُن کو کیا کام ہے مروت سے
اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے
جان شائد فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس کو نہ چھوڑیں گے

اختر شیرانی اگرچہ شاعرِ رومان کے نام سے پہچانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے ظریفانہ اشعار بھی کہے ہیں۔ فیس سے متعلق ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے

فیس پہلے جب تلک رکھوا نہ لے
ڈاکٹر اپنے بھی گھر جاتا نہیں

اور اسی بات کو دورِ حاضر کے مزاحیہ شاعر سرفراز شاہد نے اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح سمویا ہے

دیتا نہیں ہے مفت کسی کو وہ مشورہ
محتاط ہو کے اس سے ذرا بات کیجئے
وہ ڈاکٹر تو گھر میں بھی کچھ گفتگو کے بعد
بیوی سے کہہ رہا ہے مری فیس دیجئے

ظریف جبلپوری ڈاکٹر کی فیس کو اس کی دوا سے یوں منسلک کرتے نظر آتے ہیں

ہماری مفلسی اور دل کی بیماری ارے توبہ
مسیحا کے مطب سے جو دوا آئی اُدھار آئی

مسٹر دہلوی قدیم و جدید ڈاکٹر حضرات کے درمیان موازنہ کرتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ

ڈاکٹر پہلے بھی تھے آج بھی ہیں
فرق لیکن ہوا ہے یہ فی الحال
اُن کا مقصود تھا مرض کا علاج
اِن کے پیشِ نظر مریض کا مال

امیر الاسلام ہاشمی کے ہاں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کی

ضرورت برائے رشتہ

ایک دوشیزہ جس کی عمر ۱۸ برس (گزشتہ دس سال سے)، اعلیٰ تعلیم یافتہ (ایم اے۔ٹی۔ آر۔ آئی۔ سی)، دراز قد (ساڑھے تین فٹ) حسین و جمیل (خود کو سمجھتی ہے) کو ایسا لڑکا جو اعلیٰ تعلیم یافتہ (عامر لیاقت جیسا) رنگت جیسی بھی ہو (کالی نہ ہو)، شکل میں شاہ روخ جیسا، باڈی میں سلمان جیسا، قد میں سنجے دت جیسا، آواز میں عاطف اسلم جیسا، دولت میں بل گیٹس جیسا، نیک سیرت مولانا طارق جمیل۔۔۔ جیسا درکار ہے۔ عمر کی کوئی قید نہیں (۳۰ سے زیادہ نہ ہو)۔

نوٹ اِن تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ گونگے اور بہرے کو ترجیح دی جائے گی۔

ارسلان بلوچ

تیز کاٹ بھی ملتی ہے۔ فیس کے ذیل میں اُن کے اشعار ان کی رائے سمجھنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوں گے

ہے اب بھی فرق اتنا ڈاکٹر میں اور قصائی میں
اگرچہ صرف کھالیں کھینچنا دونوں کا پیشہ ہے
قصائی پھر بھی بہتر ہے ذبح کرنے سے کچھ پہلے
کم ازکم زور سے اللہ اکبر پڑھ تو لیتا ہے

اور

سرجن کی فیس دے کے کہا اِک مریض نے
توبہ ہے میری اور مرے ابا کے باپ کی
جو کچھ تھا میری جیب میں دس جیبیں کاٹ کر
وہ فیس اُس نے ایک ہی جھٹکے میں کاٹ لی

اور ذرا اُن کا یہ قطعہ تو ملاحظہ فرمائیں۔

پوچھا یہ اک طبیب نے اپنے مریض سے
میری دوا سے فائدہ کتنا ہے آپ کو
ہنس کے مریض بولا کہ بہتر تو ہوں مگر
اتنا نہیں ہے فائد جتنا ہے آپ کو

سرفراز شاہد ہمارے عہد کے وہ مزاحیہ شاعر ہیں جن کے ہاں جدید دور کی سائنٹفک اصطلاحات بہت زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ سائنس کے ساتھ ساتھ مثبت تہذیبی اقدار کا فروغ بھی ان کے اشعار کا موضوع رہا ہے۔ ڈاکٹر کی بے جا فیس پر اُن کے ہاں ہمیں کافی اشعار نظر آتے ہیں۔

تم چارہ گر سے برسرِ پیکار کیوں ہوئے
پیسے نہیں تھے پاس تو بیمار کیوں ہوئے
خوب سوجھا ہے مسیحا کو گرانی کا علاج
فیس کردی ہے ڈبل اُس نے مسیحائی کی

؎

اُن کو ہے بس فیس سے مطلب
چارہ گر بیمار کے خوش ہیں

؎

آیا کوئی مریض تو مرغا سمجھ لیا
چارہ گروں کے واسطے چارہ ہے آدمی

؎

سُنی جب فیس تو بیمار بولا
ضرورت اب نہیں مجھ کو دوا کی

؎

فقط ایک بل ہی نہیں ڈاکٹر کا
دواؤں کی کچھ پرچیاں اور بھی ہیں

فیس ہی کے ضمن میں انعام الحق جاوید، اسد جعفری اور نیاز سواتی بالترتیب یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

جھلا کے ڈاکٹر نے کہا اک مریض سے
کرتا ہے میرے کام کو دشوار کس لئے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا ہوا ہے تو بیمار کس لئے
(انعام الحق جاوید)

جیب کو دیکھ کے ہوتا ہے مریضوں کا علاج
کتنا ناداں ہے اسد نبض دکھانے والا
(اسد جعفری)

نہ فیس جا کے کلینک میں تو اگر دے گا
کوئی بھی تجھ پہ توجہ نہ ڈاکٹر دے گا
(نیاز سواتی)

اندرونِ مُلک اور بیرونِ ملک ڈاکٹر کی فیس کا ایک ہی حال ہے۔ لہٰذا مریض یورپ میں بھی بیمار پڑ جائے تو اس کو بھی فیس کی چبھن ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کہ اپنے دیس میں۔ اطہر راز کے اس شعر میں اس کھلے راز کی طرف یوں نشاندہی کی گئی ہے

لندن میں بھی علاج کا ڈھانچا بدل گیا
اِک ڈاکٹر کے پاس مرا دوست کل گیا
دل کے مریض کو ملی اُمید سے نجات
بل ڈاکٹر کا دیکھتے ہی دم نکل گیا

جدید ترین دور کے مزاح نگار بھی اس مضمون کو اپنی شاعری میں اس طرح سموتے ہوئے نظر آتے ہیں:

فیس معالج کی سن کر
کانپ اٹھا بے کس بیمار
ایک ہی نسخے نے اس کو
کردیا فوراً ٹھنڈا ٹھار
(خاور نقوی)

اب معالج بھی جیب کو دیکھے
نبض کس کو بھلا دکھائیں ہم
برفباری میں کوئٹہ جاکر
گیلا کمبل کہاں سکھائیں ہم
(فاخرہ بتول)

زور آور شاعر

وہ اپنے مکان کے چبوترے پر ڈھکی لگائے بیٹھے رہتے تھے کہ کوئی شاعر ادھر سے گزرے اور وہ اس کو اپنا کلام سنائیں۔ اور جب کوئی شاعر ان کے ہتھے چڑھ جاتا تھا وہ اس کو اپنے کمرے میں لے آتے، بڑی مدارت کرتے اور اپنا کلام سنانے لگتے تھے یہاں تک تو کوئی عجیب بات نہیں تھی، ہزاروں شاعروں کو ہَوکا ہوتا ہے اپنا کلام سنانے کا مگر ان میں یہ عجیب بات تھی جب وہ کسی شاعر کو پھانس کر اپنے کمرے میں لے آتے تھے تو ان کا سدھا ہوا ملازم کمرے کے تینوں دروازوں میں باہر سے زنجیر لگا دیا کرتا تھا کہ پھنسا ہوا شاعر بھاگ نہ سکے۔ جب باہر سے دروازے بند ہو جاتے تھے تو وہ الماری کھول کر اپنا دیوان نکال لاتے اور غزلیں سنانا شروع کر دیا کرتے تھے اور سننے والا جب ان کو داد دیتا تھا تو ہر داد پر، بڑے تحکمانہ انداز سے وہ حکم دیتے تھے ''کھڑے ہو جایئے'' اور جب وہ حیرت زدہ ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا تو اس کو اس طرح بھینچ کر گلے لگاتے تھے کہ ان کی پسلیاں بولنے لگتی تھیں۔

ذرا تصور کی آنکھوں سے یہ سماں دیکھیے کہ گمنام پٹھان شاعر صاحب، اپنا کلام سنا رہے ہیں اور سننے والا واہ، واہ، سبحان اللہ کہہ رہا ہے اور اس بیچارے داد دینے والے کو بار بار یہ حکم دیا جا رہا ہے ''کھڑے ہو جایئے، کھڑے ہو جایئے'' اور جب وہ تھکا ماندہ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑے زور سے گلے لگایا جا رہا ہے۔ العظم باللہ، کوئی حد بھی اِس عذابِ مسلسل کی۔

اور ایک صاحب نے تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ جب بار بار کھڑے ہونے اور ہر بار گلے ملنے سے تھک کر انھوں نے یہ کہا کہ اب مجھ میں بار بار کھڑے ہونے کا دم باقی نہیں رہا ہے تو ان پٹھان شاعر صاحب نے اپنے تنبیہ الغافلین ڈنڈے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا ''اٹھیے نہیں تو اس سے آپ کا سر توڑ دوں گا۔''

یادوں کی بارات از جوشؔ ملیح آبادی

حماد احمد، لاہور

خواتین کی شاپنگ

میرے پاس کپڑوں کے لاتعداد جوڑے موجود ہیں۔ ڈھیروں جوتے شو ریک میں سجے ہوئے ہیں۔ ذاتی آرائش وزیبائش کا دیگر سامان بھی وافر مقدار میں میرے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ بیڈ شیٹس، پردے، فرنیچر اور دیگر گھریلو سامان بھی اس قدر دستیاب ہے کہ سنبھالنے کے لئے عموماً جگہ بھی کم پڑ جاتی ہے"۔

معلوم نہیں کہ یہ قولِ ذریں کس کا ہے، مگر یہ میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ کم سے کم یہ گل پاشی کسی خاتون کے لبوں سے ہرگز نہیں ہوئی۔

کہتے ہیں کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ جب تک یہ دونوں پہیے ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوئے اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھائیں، تب تک گھر کی گاڑی بھی توازن سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس مجرب نسخے پر عمل کرتے ہوئے اکثر گھروں کے سمجھدار میاں بیوی مل کر "ورک شاپ" چلاتے ہیں۔۔۔ ورک شاپ سے مراد یہ ہے کہ شوہر صاحب "ورک" کرتے ہیں، جہاں سے ملنے والی آمدن سے بعد ازاں اہلیہ محترمہ اپنی پسند کے مطابق "شاپ" کر لیتی ہیں۔ اس "ورک شاپ" کے عقل مند "ورکر" یعنی شوہر گھر کے اندر اپنی بیویوں کا ہاتھ ہمیشہ تھام کر رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایسا وہ محبت کی وجہ سے ہرگز نہیں کرتے بلکہ صرف اور صرف اس خدشے کی وجہ سے کرتے ہیں کہ اگر "کرماں والی" کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ شاپنگ کے لئے نکل کھڑی ہو گی۔ بالکل اسی طرح شوہر حضرات اپنی بیویوں کو ڈیپریسڈ (depressed) یا ٹینسڈ (tensed) ہونے سے بچانے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ دراصل وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ پریشان حال خواتین زیادہ کھاتی اور زیادہ شاپنگ کرتی ہیں، اور دونوں صورتوں میں نقصان بہر حال مرد کا ہی ہوتا ہے۔

شاپنگ سے قبل خواتین ضروری اشیاء کی لسٹ ضرور بناتی ہیں۔ کبھی کبھار غلطی سے وہ یہ لسٹ اپنے ساتھ شاپنگ پر بھی لے جاتی ہیں، ورنہ عموماً اسے گھر میں ہی بھول جاتی ہیں۔ یوں انہیں مارکیٹ میں جا کر ضروری اشیاء خریدنے کی بجائے "مجبوراً" وہ چیزیں خریدنا پڑ جاتی ہیں، جو انہیں وہاں جا کر زیادہ پسند آ جائیں۔ آخر شاپنگ کے لئے جو پیسے لے کر گئی ہیں، وہ شاپنگ کی مد میں ہی خرچ بھی تو کرنے ہیں نا۔

جیسے "کڑی سے کڑی"، "سلسلے سے سلسلہ" اور "ہاتھ سے ہاتھ" ملائے جاتے ہیں، بالکل اسی طرح خواتین شاپنگ کے دوران "چیزوں سے چیزیں" بھی بخوبی ملاتی ہیں۔ ایک خاتون شاپنگ کے بعد گھر واپس آئیں تو اپنے شوہر کو شاپنگ کی کارگزاری سناتے ہوئے بولیں "تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں محض اپنے لئے ایک اچھا سا سوٹ خریدنے مارکیٹ گئی تھی۔

لیکن وہاں ایک دکان پر مجھے ایک خوبصورت سا ہینڈ بیگ (پرس) نظر آ گیا، لہذا میں نے کافی سوچ و بچار کے بعد جوتوں کا یہ جوڑا خرید ہی لیا"۔

جب خواتین شاپنگ میں مصروف ہوں تو اس دوران ان کے "ہنس بینڈ" حضرات کو سکون کے چند لمحات بھی میسر آ ہی جاتے ہیں۔ کچھ ڈیپارٹمنٹل سٹورز کے ایک کونے پر "مینز کارنر" بھی ہوتا ہے، جہاں مرد حضرات کو "کھڈے لائن" لگانے کے لئے "بینچ" رکھے گئے ہوتے ہیں۔ بیگمات کی شاپنگ کے دوران شوہر جیسی "مفلوک الحال قوم" وہاں بخوشی سر ٹکا کر سو جاتی ہے۔۔۔ اس دوران جتنا بے فکری اور سکون سے وہاں شوہر سوتا نظر آتا ہے، اس کی مثال کہیں اور ملنا ممکن نہیں۔۔ اس بیچارے کو یقین ہوتا ہے کہ زوجۂ محترمہ اپنی مطلوبہ اشیاء کی شاپنگ پر کم سے کم دو سے تین گھنٹے تو ضرور صرف کرے گی۔ کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ پانی میں گئی ہوئی بھینسیں اور شاپنگ کی غرض سے دکان میں گئی ہوئی عورتیں کبھی بھی جلدی باہر نہیں آتیں۔

پیار و محبت سے خواتین کا اتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے کہ ایک سائنٹیفک ریسرچ کے مطابق ہر عورت دن میں اوسطاً سات مرتبہ پیار کرتی ہے۔ جس میں سے چھ مرتبہ اس کا پیار شاپنگ کر کے لائی گئی اشیاء سے ہوتا ہے۔

ایک اور تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ دنیا میں صرف اور صرف دو ہی ایسی چیزیں ہیں جو خواتین کا خراب موڈ بدل کر اچھا کر سکتی ہیں۔

پہلی چیز شوہر کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ہیں کہ "مجھے تم سے محبت ہے"۔

دوسری چیز کسی بھی دکان پر لگے ہوئے "پچاس فیصد ڈسکاؤنٹ" کا بورڈ ہے۔

خواتین کسی بھی جگہ لگی ہوئی 'سیل' پر ضرور نظر رکھتی ہیں۔ مطلوبہ مقام پر جا کر اگر ان کا پسندیدہ لباس "سیل" پر نہ دستیاب ہو تو ان کی زبان پر حرف شکایت ضرور آ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مطلوبہ لباس "سیل" میں دستیاب تو ہو مگر ان کے مطلوبہ سائز میں نہ میسر ہو، پھر تو ان کا دل بھی خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

خواتین تو سیل کی اس قدر شیدائی ہوتی ہیں کہ اگر کسی پرس کے اوپر پانچ سو روپے قیمت لکھی ہو تو ممکن ہے کہ وہ اسے خریدنا فضول خرچی قرار دے دیں۔ لیکن اگر اسی پرس کے اوپر پہلے ایک ہزار روپے، اور پھر اسے کاٹ کر چھ سو روپے قیمت لکھی گئی ہو تو خواتین "چار سو روپے" یا "چالیس فیصد" کی "عظیم بچت" کی خاطر وہ پرس بخوشی خرید لیتی ہیں۔

اگر کوئی شادی شدہ جوڑا شاپنگ کے لئے نکلا ہوا ہو اور خاتونِ خانہ کسی بھی دکان کے باہر "سیل" کا بورڈ پڑھ لیں تو شوہر سے اجازت مانگے یا اسے اطلاع دیئے بغیر ہی دکان کے اندر گھستی چلی جاتی ہیں۔ دراصل ایسی خواتین کا یہ ماننا ہوتا ہے کہ پاکستانی روپیہ دن بدن اپنی قدر کھو رہا ہے، لہذا روپے کی قدر مزید کم ہونے سے پہلے پہلے اسے سیل پر لگی ہوئی چیز خرید کر محفوظ بنا لینا چاہیے۔

خواتین اگر "بچہ لیس" ہوں یا پھر اگر بچے ہوتے ہوئے بھی بچوں کے لئے کچھ خریدنے کا ارادہ نہ ہو، تب بھی کسی "چائلڈ گارمنٹس" پر لگی ہوئی سیل انہیں اپنی جانب ضرور متوجہ کر لیتی ہے۔ اگر انہیں سیل میں بچیوں کی کوئی فراک پسند آ جائے تو دکاندار سے کہتی ہیں کہ یہ والی فراک "ایک ننھی سی، پینتالیس سالہ بچی" کے سائز میں پیک کر دینا۔۔۔ سیانے کہتے ہیں کہ مرد نے کبھی کوئی کپڑا خریدنا ہو تو وہ یہ سوچتا ہے کہ کیا یہ کپڑا مجھے پورا آ جائے گا؟ لیکن اس کے برعکس خواتین کو جب کوئی کپڑا پسند آئے تو وہ یہ سوچتی ہیں کہ کیا میں اس کپڑے میں پورا آ جاؤں گی؟

خواتین کو سیل کا ایسا چسکا ہوتا ہے کہ بعض اوقات تو اُنہیں یہی علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا چیز خرید رہی ہیں۔ ایسے میں گھر واپس آنے پر جب شوہر یہ پوچھتا ہے کہ یہ خریدی گئی چیز آخر کیا ہے اور کیوں خریدی گئی ہے تو جواب ملتا ہے "مجھے نہیں علم، یہ کیا ہے، مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس پر میں نے ستر فیصد کا "گریٹ ڈسکاؤنٹ حاصل کیا ہے"۔

بات صرف سیل کی ہی نہیں ہے۔ جس جگہ سیل نہ بھی لگی ہو،

وہاں بھی خواتین کا ''ندیدہ پن'' لاجواب ہوتا ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ مرد دکان پر صرف اور صرف وہ چیز لینے جاتے ہیں، جو انہیں درکار ہوتی ہے، لیکن اس کے برعکس خواتین یہ جاننے کے لئے ہی دکان پر جاتی ہیں کہ آخر انہیں کیا کیا چیز درکار ہے؟''۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ خواتین مردوں کی نسبت لمبی عمر کیسے پا لیتی ہیں؟ دراصل شاپنگ کرنے سے کبھی بھی ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔ لیکن شاپنگ کے پیسے ادا کرنے والے کو ہارٹ اٹیک ہونے کا چانس بہرحال موجود رہتا ہے۔۔ اور پیسے ادا کرنے کا فریضہ عموماً مرد حضرات ہی انجام دیتے ہیں۔

کچھ خواتین کپڑوں کی دکان پر جا کر انگلی کے اشاروں سے باری باری ''وہ والا''۔۔۔۔۔۔''وہ والا''۔۔۔۔۔''وہ والا'' کہہ کر دکان کے آدھے تھان کامیابی سے کھلوا لیتی ہیں۔ جب دکاندار ''شڑ ڑ ڑ ڑ ر۔۔۔۔ ''شڑ ڑ ر۔۔۔ شڑ ڑ ڑ'' کر کے سارے تھان کھول دیتا ہے تب یہ محترمائیں بغیر کوئی سوٹ خریدے ہی دکان سے باہر نکل جاتی ہیں۔ دراصل ان کا دکان میں آنے کا واحد مقصد ہی کچھ دیر کے لئے مفت میں اے سی کی ٹھنڈک انجوائے کرنا ہوتا ہے۔

کپڑوں کی دکان پر تو اگر خواتین کو من پسند چیز مل بھی جائے تو بھی قیمت کے معاملے میں بحث و مباحثہ کر کے دکاندار کو اپنا سر پکڑنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔۔ ایسی ہی ایک خاتون کو ایک دکان پر دوپٹہ پسند آ گیا۔۔ دکاندار نے خاتون کی فرمائش پر ایک ہزار روپے کے اس دوپٹے کی قیمت کم کر کے نو سو روپے کر دی مگر خاتون آٹھ سو روپے سے اوپر ایک دھیلا بھی دینے کو تیار نہ تھی۔ کچھ دیر تک بارگیننگ چلتی رہی، بعد ازاں دکاندار نے ہتھیار ڈال ہی دیئے اور دوپٹہ آٹھ سو روپے پر دینے کو تیار ہو گیا۔ ابھی وہ شاپنگ بیگ میں دوپٹہ ڈال ہی رہا تھا کہ خاتون بول پڑیں کہ، دیکھو اس کے کنارے پر جھری ہے، لہذا میں تو اس کے چھ سو روپے ہی دوں گی۔ دکاندار نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ جھری دوپٹے کی مطلوبہ پیمائش کے بعد اور تھان کے آخری حصے میں ہے، لیکن خاتون نے ایک نہ مانی۔ اب کی بار بھی دکاندار نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور چھ سو روپے میں راضی ہو کر وہ دوپٹہ خاتون کے حوالے کر دیا۔ خاتون نے پیسے ادا کرنے سے قبل دوپٹہ شاپنگ بیگ سے باہر نکالا اور ایک بار پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ کافی دیر تک دوپٹے کا معائنہ کرنے کے بعد بولی: یہ دیکھو، اس پھول کی یہ والی پتی دوسری پتیوں کی نسبت زیادہ چھوٹی ہے لہٰذا مجھے یہ عیب دار دوپٹہ ہرگز نہیں چاہئے، لیکن پھر بھی میں تمہارا بھلا سوچتے ہوئے کہہ رہی ہوں کہ اگر تو تم نے اس دوپٹے کے چار سو روپے لینے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اپنے

کچھ دنوں میں ایک دوست کی شادی ہونے والی تھی۔
میں نے پوچھا ''یار مجھے اپنی شادی پے دعوت دو گے کہ نہیں۔''
بڑی معصومیت سے کہنے لگا ''یار لڑکی والوں نے تھوڑے لوگ مانگے ہیں پتا نہیں مجھے بھی ابولے کے جاتے ہیں کہ نہیں۔''
ارسلان بلوچ

پاس ہی رکھو۔۔اب تک دکاندار بھی اس فضول اور بے تکی بحث سے عاجز آچکا تھا، لہذا اجھلا کر بولا کہ ''محترمہ آپ نے چارسو روپے بھی کیوں دینے ہیں، ایسا کریں کہ اسے مفت ہی لے جائیں''۔۔۔فورا سے پیشتر خاتون کی آواز گونجی ''یہ ہوئی نا بات۔۔فوراسے پیشتر ایسے تین دوپٹے پیک کردو۔''

آپ کو اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً کچھ لوگ ادبی انداز سے باتیں کرتے ضرور نظر آتے رہتے ہوں گے لیکن آپ خواتین کی عظمت کا اندازہ لگائیں کہ وہ بولنے کے علاوہ سوچتی بھی ادبی انداز سے ہیں اور تو اور شاپنگ بھی مفید سوچ اور عقلمندانہ الفاظ استعمال کر کے ہی کرتی ہیں۔ایک خاتون اپنے شوہر سے کہنے لگی کہ: مجھے بلاوجہ شاپنگ کرنے اور پیسے خرچ کرنے سے شدید نفرت ہے۔لیکن چونکہ پیسوں کے سرکولیشن سے ملکی معیشت مضبوط ہوتی ہے۔لہذا اگر شاپنگ پر میرے پیسے خرچ کرنے کی وجہ سے قومی معیشت میں بہتری آسکتی ہے تو ملکی محبت میں یہ سودا مہنگا ہرگز نہیں''۔۔

اکثر میاں بیوی آپس میں ہنسی مزاق اور کھیل کود بھی کرتے رہتے ہیں۔کرنا بھی چاہئے کیونکہ ایسا کرنا ازدواجی رشتے کو مزید مضبوط بھی بناتا ہے۔لیکن جب خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ کھیل کود یا ہنسی مزاح میں مصروف ہوں وہاں بھی ان کے عجیب و غریب ڈائیلاگز سننے کو ملتے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ اپنے شوہر سے یہ کہتی ہیں، ''چلو ایسا کرتے ہیں کہ میں چھپتی ہوں، اور پھر تم مجھے ڈھونڈنا۔اگر تم نے مجھے ڈھونڈ لیا تو پھر ہم اکٹھے شاپنگ کرنے چلیں گے''۔

یہ سن کر شوہر کی آنکھیں ابل کر باہر کو آجاتی ہیں لیکن وہ ''بچت کا راستہ'' نکالنے کے لئے بیوی سے پوچھتا ہے: ''اور اگر میں تمہیں نہ ڈھونڈ سکا تو پھر ہم کیا کریں گے؟''۔

بیوی جھٹ سے جواب دیتی ہے: ''آپ ایسا ہرگز مت سوچیں پیارے سرتاج۔میں آپ کو ہارتا ہوا کبھی بھی نہیں دیکھ سکتی۔یاد رکھیں کہ میں سامنے والے ستون کے پیچھے ہی چھپوں گی۔لہذا آپ آرام سے مجھے تلاش کر لینا''۔

آج کل آن لائن شاپنگ کرنے کا بھی رواج چل رہا ہے۔آن لائن شاپنگ کے دوران خواتین کی یہی کوشش رہتی ہے کہ کسی قسم کا خرچہ بھی نہ کرنا پڑے اور چند سیکنڈوں کے اندر ہی مطلوبہ چیز ان کے پاس بھی پہنچ جائے۔ ایسی ہی ایک خاتون کے متعلق سنا ہے کہ وہ گوگل پر

How to download imported lawn suit directly Amercia to my wardrobe within second.

سرچ کر رہی تھیں۔

الغرض یہ کہ شاپنگ خواتین کی کمزوری ہے اور شاپنگ کا نام لے کر خواتین سے کوئی بھی کام لیا اور نکلوایا جا سکتا ہے۔اب یہ مردوں پر منحصر ہے کہ وہ خواتین کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے، کس طرح مفید بنا سکتے ہیں۔۔ایک خاوند دفتر سے گھر واپس آیا تو دیکھا کہ بیگم صاحبہ فارغ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہیں اور انہوں نے کھانے کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا۔۔شوہر کو دیکھتے ہی بیگم نے جھٹ سے منہ کا عجیب وغریب ڈیزائن بنایا اور بہانہ مارتے ہوئے بولی:۔''سنئے، آج مجھے اپنی طبیعت بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہی''۔۔

خاوند اسے تسلی دیتے ہوئے بولا: ''اوہ، کوئی بات نہیں۔۔اپنا خیال رکھو اور آرام کرو۔۔۔ورنہ میں تو تمہیں آج شاپنگ پر لے جانے کا سوچ رہا تھا''۔

شاپنگ کا سن کر بیوی کی رال ٹپکی اور وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی ''میں تو مذاق کر رہی تھی سرتاج۔الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں''۔

خاوند بھی سیانا تھا۔۔جھٹ سے بولا ''اچھا، تو میں بھی مذاق ہی کر رہا تھا ملکہ رانی۔۔۔چل اٹھ۔۔آٹا گوندھ اور روٹی پکا''۔

مرزا یاسین بیگ

اپنی تعزیت آپ

میری موت پر میرے صحافی دوستوں نے مقامی خبروں والے صفحے پر سیاہ حاشیہ میں دو کالمی خبر لگائی ''دوسروں کی خبر لگانے والا آج خود خبر اور قبر بن گیا۔''

ایک نے متن میں لکھا ''مرحوم نے اپنے پیچھے صرف ایک بیوہ، دو خوش و خرم بچے، یاہو کی دو، جی میل کی ایک اور ہوٹ میل کے تین اکاؤنٹس، ایک فیس بک اور ٹیوٹرا کاؤنٹ اور نیٹ پر اپنی لاتعداد ایسی تصاویر چھوڑیں جسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی سے بیزار تھے۔''

میرے اپنے اخبار نے لکھا'' آج ہم مرحوم کی آخری خواہش کے احترام میں ان کے انتقال کی خبر پانچ کالمی لیڈ کی شکل میں لگا رہے ہیں جو انھوں نے زندگی کے آخری ایام میں خود تیار کی تھی۔ مرحوم کو بہت شوق تھا کہ وہ کوئی ایسا کارنامہ کرتے کہ ان کا نام اخبارات کی سرخی بنتا، ہمارا خیال ہے ان کی موت سے ان کی یہ فرمائش پوری ہوگئی''۔

ایک کالم نگار دوست نے تعزیتی کالم میں لکھا'' مرحوم آخری برسوں میں ''زن'' سے انتہائی نفرت کرنے لگے تھے۔ اگر کسی خبر میں زن لکھنا ہوتا تو چہرے کو ستر کے زاویے پر گھما کر حقارت کے ساتھ ''ظن'' لکھتے۔ کہتے تھے جو جوانی میں نہ ملی اب اس کے بارے صرف سوچ کر آخرت کیوں برباد کروں؟ سوائے کھانے اور فیس بک کے ہر چیز سے بدظن ہوگئے تھے۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر گھنٹوں فیس بک کی زیارت کرتے اور یہی دو چیزیں ان کی عین بڑھاپے میں موت کا باعث بنیں۔ ڈاکٹرز اور الطاف حسین سے انھیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ کہتے تھے زندگی چاہتے ہو تو ان سے دور رہو۔ ڈاکٹر ذوالفقار مرزا، ڈاکٹر بابر اعوان، ڈاکٹر فاروق ستار، ڈاکٹر عاصم اور ڈاکٹر رحمان ملک ان کی قلم کی ہٹ لسٹ پر تھے۔

مرحوم کو آخری عمر میں پینٹنگ کا شوق ہوگیا تھا، ہر وقت اپنے بالوں کو رنگتے رہتے تھے۔ فخریہ کہا کرتے تھے میرے بالوں نے آخری وقت تک میرا ساتھ دیا ہے میں ان کا رنگ سفید ہونے نہیں دوں گا۔ مرحوم کو کفن میں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کاش اِتنا صاف لباس انھیں زندگی میں پہننے کو مل جاتا۔ لانڈری سے چڑتے تھے، کہتے تھے انسان کو اپنے ذہن، کان اور کپڑوں کا میل خود اپنے ہاتھوں سے نکالنا چاہیے۔ یہ اور بات کہ اس کام کیلئے وہ اپنے ہاتھوں کو سال میں صرف دو بار زحمت دیتے تھے۔

مرحوم کی مزاح کے صنف کیلئے بڑی خدمات تھیں۔ زندگی میں تین بار اپنی بتیسی تبدیل کی۔ کہتے تھے آدھی عمر بیوی اور آدھی عمر بتیسی کی خدمت میں گذر گئی۔ اخبار اور کھانے کی پلیٹ چاٹنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ پاکستانی سیاست دانوں اور شوبز شخصیات کے تمام اسکینڈلز انھیں حفظ تھے۔ وہ برائیوں کی چلتی

بھی دم توڑ گئی۔ خراٹوں کے بغیر انھیں قبر میں سوتا دیکھ کر خوشی سے میرے آنسو بہنے لگے۔''

ایک ٹیکسٹ یوں تھا ''مرحوم اگر جوانی میں فوت ہوتے تو بیوہ سے تعزیت میں زیادہ مزہ آتا۔ وہ اتنا خودغرض تھا کہ اتنی دیر سے مرا کہ بیوہ کی دوسری شادی کا ارمان بھی فوت ہوگیا۔''

ایک کرپٹ سیاستدان نے لکھا ''یہ کوئی عام موت نہیں ہے۔ اس شخص نے ہمیں حرام کا ایک لقمہ بھی چین سے کھانے نہیں دیا۔ آج حرام کھانے والوں کی آزادی کا دن ہے۔''

ایک شرابی دوست نے لکھا ''مرحوم کو ہم نے کبھی پیتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ شراب کی بھری بوتل ساتھ لے جایا کرتے تھے۔''

ایک نے فیس بک پر لکھا ''مرحوم دوسروں کو برائی کرتے نہیں دیکھ پاتے تھے۔ کہتے تھے اس کام کیلئے میں پیدا کیا گیا ہوں۔ مرحوم ہر کام میں دیر کر دیتے تھے۔ وہ خودکشی کے شوقین تھے۔ کہتے تھے اس سے پہلے کہ خدا مجھے اپنی دنیا سے نکالے میں خود یہ دنیا چھوڑ دوں گا مگر موصوف نے یہاں بھی دیر کر دی۔''

ایک اور پیغام تھا ''ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے تین موٹے بھی مل کر پورا نہیں کر پائیں گے۔ میں حیران ہوں کہ کرین کے بغیر وہ لحد میں کیسے اتار دیئے گئے۔''

ایک نے لکھا ''وہ ہمارا دوست تھا۔ میں اس کی موت کا سن کر ایک منٹ کیلئے غمگین ہوگیا۔ اگلے منٹ میرا بلیک بیری بج اٹھا، ایک اور دوست مجھے ''ڈرٹی پکچرز'' دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ مووی دیکھنے کے بعد ہم مرحوم کے گھر تعزیت کیلئے چلے گئے۔''

ایک ایس ایم ایس تھا ''مرحوم قبرستان سے خوف کھاتے تھے اس لئے بہت کم جنازوں میں شرکت کی۔ آج ان کے جنازے میں بھی قلیل لوگ شریک تھے کیونکہ لوگ ان سے خوف کھاتے تھے۔''

ایک تعزیت کچھ ایسی تھی ''اللہ کے رحم کو چیلنج نہ کرو یہ دعا مانگ کر کہ اللہ انھیں جنت نصیب کرے۔''

پھرتی وکی پیڈیا تھے۔ کسی کی ذاتیات پر ڈرون حملہ کروانا ہوتو انھیں ''چھو'' کہنا کافی ہوتا تھا۔ وہ اگر ہکلے نہ ہوتے تو آج کل کے ٹاک شوز کے مقبول سیلیبریٹی ہوتے۔ مرحوم جب بھی منہ کھولتے پان، چھالیہ، چیونگم یا گالیاں نکلتیں۔ کلمہ صرف آخری وقت کیلئے رکھ چھوڑا تھا۔ پان کے شیدائی تھے۔ مرحوم کی موت پر پان والے ہی سب سے زیادہ غمگین تھے۔ مرحوم کا کوئی دوست تھا نہ دشمن کیونکہ مرحوم ادھار دینا پسند کرتے تھے نہ ادھار لینا۔''

میری موت کا میرے دوستوں نے گہرا اثر لیا۔ ہر ایک نے میری موت کی خبر پر فوری سینکڑوں ٹیکسٹ میسیجز کیئے۔ بہت سوں نے اپنی فیس بک کی وال پر تعزیتی پیغامات لکھے۔

ایک دوست کا ٹیکسٹ میسیج تھا ''وہ ہم میں نہیں رہا، اب ہم دل بھر کے چلغوزے اور جھوٹی قسمیں کھا سکتے ہیں۔''

دوسرے نے لکھا ''مرحوم کی موت سے خراٹوں کی موسیقی

سید عارف مصطفیٰ

برسات کے مزے

برسات میری دیرینہ کمزوری ہے۔۔۔ لیکن یہ بھائی تابش کی ان متعدد کمزوریوں کی مانند نہیں کہ جو اکثر موقع بموقع ایک دوسرے کی جگہ لیتی رہتی ہیں یا جنہیں سوائے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے، شرفاء کے سامنے کھلے بندوں بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ میری دانست میں یہ ایک اور طرح کا مستقل نوعیت کا آبی روگ ہے، ایک ایسا روگ جس سے میرا انگ انگ اور پور پور سرشار ہوجاتا ہے اور جس سے جان چھڑانے کا میرا ہرگز کوئی ارادہ نہیں جبکہ ایک اپنے خواجہ صاحب ہیں جنہیں میں ''کورذوقوں'' کا ''کور کمانڈر'' کہا کرتا ہوں، جہاں دو چار بوندیں کیا گریں ناک اور شلوار کے پائنچے ایک ساتھ چڑھائے نظر آتے ہیں، برسات کی شدت جتنی ہو اسی اعتبار سے یہ چڑھی ناک اور پائینچے اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ بقول بیگم کے، کہ جہاں آسمان پہ بادل کے چند ٹکڑے ایک دوسرے کے قریب آتے نظر آئے اور ادھر مجھے گھر کاٹنے کو دوڑا، ان کا کہنا ہے کہ باقاعدہ بارش نہ بھی ہو تب بھی میں خاصے بلکتے پن سے بھاگ دوڑ کر کے خود کو ہر ممکن جگہ سے بھگو کر ہی دم لیتا ہوں تاہم میری جان اس بات سے بہت جلتی ہے کہ کہیں اگر ان کے رکاوٹی ہتھکنڈوں کے ہاتھوں میری یہ ذراسی گیلاہٹ پانے کی نمناک کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکے، پھوار بڑھ کر باقاعدہ برسات تک جا پہنچے تو میری باچھوں کو مروجہ حد سے بھی زیادہ پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا، حتیٰ کہ خود میں بھی نہیں۔ اس موقع پر میں نہایت خشوع وخضوع سے عموماً کوئی پرانا ادھورا کام لے کر صحن میں براجمان ہوجاتا ہوں لیکن اس دن بھی میری اہلیہ کی جھڑپتی مداخلت کے باعث کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے کہ شرابور ہونے کی آشا تو پوری ہو جاتی ہے لیکن وہ ادھورا کام پھر بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔

برسات کے لئے میری یہ وارفتگی صرف خانگی سطح تک محدود نہیں، میں جب ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا منیجر ہوا کرتا تھا تب بھی یہ سرمئی سرمئی بادل میرے من کو یونہی گدگداتے تھے اور بوندیں برسنا شروع ہوتے ہی دفتری خیالات بھی بہنا شروع ہوجاتے تھے اور مزاج شناس چپراسی لپک جھپک ایک کرسی میرے آفس کی گیلری میں سجادیتا تھا تاکہ میں اس رم جھم کو قریب نہیں بلکہ عنقریب سے ملاحظہ کرسکوں۔۔۔ اور یہ ملاحظہ بھی کیا ہوتا تھا کہ ہر ہر انگ اور ہر ہر پور میں مانو ایک ایک آنکھ سی ابھر آتی تھی۔ ایسے مواقع پہ مجھے

کل صبح بائیک چلاتے ہوئے غلطی سے بائیک کی لائٹ بند کرنا بھول گیا تقریباً ۱۵۰ لوگوں نے مجھے کہا ہوگا کہ بھائی لائٹ اُوف کرلیں۔۔۔خیر میں نے لائٹ بند کردی۔
لیکن کل ساری رات میں لائٹ بند کر کے گھومتا رہا مگر کسی نے نہیں کہا کہ بھائی لائٹ اُون کرلیں۔۔۔بڑے آئے واپڈا کے طرفدار۔

ارسلان بلوچ

کبھی کبھی کمال فرض شناسی سے اِدھر اُدھر کھلے آسمان تلے پڑے پیداواری اسٹاک اور دیگر سامان کی پڑتال کیلئے سوٹ بوٹ ڈاٹے ہونے کے باوجود میدانِ عمل میں مسلسل سرگرم دیکھا جاتا تھا اور ایسے میں آسمان میں بھی کیا بجلیاں بھری ہوں گی جو میری ''آنیوں جانیوں'' میں لشکے مارتی تھیں۔۔۔اس موقع پر بارش تو چاہے تھوڑی دیر میں تھم بھی جائے لیکن دُور دُور سے ملاحظہ کرنے والوں کے کلمات تحسین تا دیر نہ تھمتے تھے، یوں وہ مجھ سے اور ہم نزلے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔

یہ برسات درحقیقت بڑے کام کی چیز ہے، اکثر ہی میرے اندر ایک بیحد ذمہ دار آدمی کو ابھارتی ہے اس کے باوجود کہ مردم ناشناسی کی وباء کے زیرِ اثر یا چند بدقسمت واقعات کے تسلسل کے سبب کچھ لوگ مجھے مطلق ذمہ دار نہیں سمجھتے (حالانکہ بیگم سے پوچھیں تو وہ نجانے کن کن باتوں اور واقعات کا ذمہ دار صرف مجھے ہی ٹھہراتی ہیں۔) لیکن میں اِن سب حاسدین کو غلط ثابت کرسکتا ہوں۔۔۔کم از کم برسات کے پہلے دن تو یقینی طور پر۔۔۔کیونکہ اس روز میرا ذوقِ ذمہ داری پوری طرح اپنی بلندیوں کو چھولیتا ہے، کوئی قدر شناس ہو تو باآسانی یہ جان سکتا ہے کہ اس دن میرا بدرجۂ اتم لائقِ ستائش، جذبۂ ذمہ داری قابلِ فخر حد تک عیاں ہوکر رہتا ہے اور میری حد درجہ متین سوچ سے پوری طرح سے جڑا ہوا ہوتا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ برسات شدت اختیار کرتے ہی مجھے ایسا کوئی باہری کام یاد آجانا کبھی نہیں بھولتا کہ جسے اسی نازک وقت سرانجام دینا از حد ضروری بلکہ اشد ضروری ہوتا ہے، تاہم ڈھیروں دل شکنی کی بات یہ ہے کہ میرے اِس نہایت ذمہ دارانہ عمل کو کبھی بھی نہ صرف سراہا نہیں جاتا بلکہ اسے بہت عجیب عجیب نام دیئے جاتے ہیں۔اگر اِن ناموں میں سے کوئی نام آپ جیسے کسی معزز آدمی کو بتانے کے لائق ہوتا تو میں ضرور آپ کو بھی بتا دیتا۔ معزز میں نے اس لیئے کہا کہ جب تک آپ تحمل سے میری باتیں سن رہے ہیں میں تو آپکو معزز ہی مانوں گا مگر آپ کب تک معزز سمجھے سکتے ہیں اس کا فیصلہ مطلق آپ کے اپنے اختیار میں ہے، میری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں۔

ہاں تو بات ہورہی تھی برسات کی۔۔۔یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں کہ میں ہمیشہ سے ہی برسات کا دلدادہ ہوں۔ بچپن میں دوستوں کے ساتھ بارش میں خوب خوب نہاتا تھا، اِتنا کہ پیروں کے تلوے پھول کر لہریئے دار گتے کی مانند ایک ساتھ جڑی کئی نالیوں جیسے ہوجاتے تھے،، میرا چہرہ بغیر مناسب مدارات کے، بہت سوجا سوجا سا کسی منگول جنگجو کا سا دکھنے لگتا تھا اور ہونٹ چوٹ لگے بغیر پھول کر رشکِ افریقہ ہوجاتے تھے۔ پھر یہ کہ میں بارش میں کھیلتا بھی تو بہت تھا۔ اگر روایتی کھیل کم پڑ جاتے تو ہاتھ کے ہاتھ کئی نئے اور سستے کھیل بھی ایجاد کرلیئے جاتے تھے، جن کے قوانین مصلحت اور طاقت کے ہاتھوں بدلتے چلے جاتے تھے۔ اِن دنوں بارش میں کھیلتے ہوئے پھسل کر بار بار گرنا عام بات تھی۔ بعد میں لڑکپن جاتے جاتے معاملہ جب نظر نیت اور قدم تینوں کے پھسلنے کا ہونے لگا تو چوٹ اگر جسم پر نہ بھی لگے تب بھی نجانے کیوں دل پہ زیادہ محسوس ہوتی تھی۔

ہم بچپن میں بارش تھمتے ہی ساتھیوں کے سنگ زمین میں بیر بہوٹیاں کھوجا کرتے تھے۔ بڑے ہوتے ہوتے بیر بہوٹیاں شاید آس پاس کے فلیٹوں و بنگلوں کی بالکنیوں میں منتقل ہوگئیں اور یاروں نے اپنی تلاش کو منتخب مقامات کے چھجوں تک ہی محدود کرلیا تو پھر ہم بھی اکیلے کب تک یہ مہم جاری رکھ سکتے تھے، ویسے بھی ہم جیسے، قبل از جوانی ہی زمانے بھر کو بہو بیٹیاں سمجھنے پہ مجبور کردیئے جانے والوں کو، بیر بہوٹیوں کی تلاش جلد ترک کرنی ہی پڑتی ہے۔

عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سردار یعنی سکھ ایک بیوقوف قوم ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ سردار ہی تو ایک سمجھدار قوم ہے جس میں رواج ہے کہ دُولہے کو شادی والے دن ہاتھ میں تلوار دی جاتی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شادی کوئی گڈی گڈے کا کھیل نہیں بلکہ ایک ایسی مسلسل جنگ کا آغاز ہے جو ہمیشہ ہوتی رہے گی۔۔۔ بلکہ یہ ایک خاص قسم کی جنگ ہے جس میں آغاز سے پہلے خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں۔

ارسلان بلوچ

لیکن جو اپنے میاں اچھن ہیں ان کے معاملے میں سارا مسئلہ ہی لچھن کا ہے۔ ایک مدت سے یہ معمول ہے کہ بارش کے آثار نمودار ہوتے ہی نہایت پھونسڑے دار کپڑے پہنے نمودار ہوجاتے ہیں، لگتا ہے کہ سیلاب متاثرین کے کیمپ سے ہاتھ لگے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اُن کی یہ پوشاک بہت تاریخی ہے کیونکہ اس نے ان سے پہلے ۶۔۵ نسلوں کی خدمت کی ہے اور ان کی ایسی دیدہ دلیر جامہ زیبی خاص بارش ہی سے مشروط ہے۔ ویسے تو موصوف خواہ کتنے عرصے سے لاپتا ہوں لیکن اُدھر بادل چھائے اور ادھر اچھن گھر کر آئے۔ ہمیشہ آبی تخریب کے شرطیہ نئے پلان کے ساتھ آتے ہیں اور جل تھل برسات میں ہر طرف چھپڑ چھپڑ کرتے پھرتے رہتے ہیں اور مسلسل یہاں وہاں ہر سمت ان کی آوت جاوت لگی ہی رہتی ہے یوں سمجھئے کہ بارش پر اُن کی ترنت حاضری کا تعلق ویسا ہی ہے جو کہ بڑی والی ہری مکھی کا آم سے ہوتا ہے، ادھر دو بوندیں زمین پہ گرنے کیا گریں ادھر جھٹ حاضر ہوگئے۔ ویسے تو وہ کوئی کام اپنے سر نہیں لیتے لیکن بارش کی ابتدائی بوندیں گرنے سے پہلے پہلے اپنے سر پہ لے لیا کرتے ہیں۔ بالوں سے محروم ان کے چوڑے چکلے سے گنجے سر پر بارش سے اچھلتی چھینٹوں کا نظارہ ایئرپورٹ کے رن وے پہ برسی بارش جیسا ہی ہوتا ہے لیکن اس موقع پر اچھن میاں کو حاسدوں کی پھبتیوں کی ایسی کوئی خاص پرواہ نہیں ہوتی تاہم ان کو اپنی اوٹ میں لیئے رکھنے والے ایک دو سنگی ہمیشہ ان کے ہمرکاب ضرور ہوتے ہیں جن میں سے ایک ہم شمار کیئے جاتے ہیں۔

اب جبکہ بچپن بھی گیا اور پھر جوانی بھی کچھ ایسا خاص کیئے بنا غارت ہوئی، لیکن برسات سے ہماری رغبت ذرا کم نہ ہوئی تاہم اب جوانی کے جاتے جاتے اتنا ضرور ہوا ہے کہ دھواں دار برسات ہو تو ہم تھوڑی ہی دیر میں ٹھاٹھ دار سا نہا لیتے ہیں اور نیچی نظریں کیئے کیئے گھوم پھر کر گھر چلے آتے ہیں۔ نظریں نیچی رکھنے کی بابت بھی ہمارے حاسدین کو ذرا چین نہیں۔ وہ اسے ہماری شرافت سے زیادہ ہماری احتیاط پسندی پہ محمول کرتے ہیں۔ دو برس قبل ہم ایک گٹر میں کیا گرے یار لوگوں نے اِسے ہمیشہ کا فضیحتہ ہی بنا دیا۔ اب تک کوئی نہ کوئی چیک کراس کا پرسہ دے ہی ڈالتا ہے۔۔۔ لیکن اچھن میاں کے لچھن بدستور وہی ہیں۔ جلے پیر کے بلے کی طرح ہر حال میں رم جھم میں ہمیں یا کسی عاشقِ برسات کو اپنے ساتھ ٹانگے ٹانگے خوب خوب گھومتے ہیں، جہاں تک سردی کی بارش کا معاملہ ہے تو اس میں نکلنے کا معاملہ ذرا جہاد جیسا ہے اور اب ہمارے اور اچھن کے عزائم ایسے جہادی بھی نہیں رہے۔ عام طور پہ سرما کی بارش میں ان کی باہر نہ نکلنے کی وجہ تقویٰ کی افراط سے زیادہ لقوے سے بچنے کی احتیاط ہوتی ہے۔ سرما کی بارش کے جہاد میں تو اب ہم بھی اپنی کھڑکی ہی میں بیٹھے بیٹھے تلوار لہراتے رہتے ہیں، جس کی داد کئی دن تک اپنی ہی پسلیوں سے ملتی رہتی ہے تاہم ٹھنڈا موسم بھی زیادہ سرمئی معلوم ہو تو خود کو ذرا سا بقدرِ عرقِ ندامت بھگو بھی لیتے ہیں، لیکن لڑکپن میں تو ہم ایسے میں بھی ادھر ادھر ٹاپیں مارتے دِکھتے تھے اور جب تک نیلے نہ پڑ جائیں اور یہ نیل کرتے کے نیل سے بڑھ نہ جائیں، اگلے مورچوں کے دورے ہی پہ نظر آتے رہتے تھے۔

یہاں برسات کے حوالے سے ان بدتوفیقوں کا ذکر کرنا بھی ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں نہانے کے لیئے کبھی غسلخانے سے باہر نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔۔۔ لے دے کے ان کی تمام مصفی

> آج سے دس بارہ سال پہلے جب دولہا منہ دکھائی کے طور پر دلہن کو کوئی تحفہ دیتا تھا تو دلہن کے منہ سے اچانک خوشی سے نکلتا تھا ۔۔۔ ہائے گولڈ رنگ ، ہائے سلور رنگ ہائے ڈائمنڈ رنگ ۔۔۔لیکن آج کل آواز آتی ہے ہائے آئی فون سِکس ، ہائے سیمسنگ گلیکسی ، ہائے سمارٹ فون۔
>
> **ارسلان بلوچ**

حیاتی کا مدار ایک مگ اور بالٹی پہ ہوتا ہے۔کبھی کسی قدر بے احتیاطی پر مائل ہوں تو زیادہ سے زیادہ شاور کھول کر دائرۂ بوچھار میں سر ڈال لینے کی شرابور عیاشی بھی کر لیتے ہیں۔ ایسے محتاط لوگوں کی ایک قسم مہذب فلموں میں وضعدار سا کچھا پہنے نہاتے نظر آتی ہے لیکن انہیں نہاتے دیکھنا سراسر برائے عبرت ہوا کرتا ہے۔ایسی متعدد فارمولا فلموں کے فلاپ ہوجانے کے بعد ایسے روح فرسا غسل اب یاد ماضی ہوتے جا رہے ہیں۔اب اس کی جگہ آسان غسل کے مناظر شامل کیئے جاتے ہیں اور صحت وصفائی کی اہمیت اجاگر ہوجانے کے بعد سے فلموں میں یہ مناظر وقفے وقفے سے اِتنی بار دکھائے جاتے ہیں کہ فلم کی ہیروئن اور فلم کی کہانی پوری طرح دھل جاتی ہے۔

ایسے بدذوق لوگ بھی ہیں جیسے خواجہ صاحب، کہ اگر باہر کہیں رستے میں ہوں اور اچانک بارش برس پڑے تو کسی چھجے کے نیچے دبک کر اور دیوار سے بالکل لگ کر دم سادھے بے آواز و بدحواس یوں کھڑے رہتے ہیں کہ گویا صور اسرافیل سن لیا ہو یا کسی نے ان کی انتڑی اوجھڑی نکال کر حنوط کر کے لاش کو یہاں برائے نمائش چسپاں کر دیا ہو۔ تاہم قدرت اور فطرت کے کچھ اپنے اصول ہیں۔ پوری طرح بارش رک جانے کا یقین ہوجانے کے بعد وہ جونہی قدم باہر نکالتے ہیں، رپٹ جاتے ہیں اور کسی طوفانی اولتی کے عین نیچے جا پڑتے ہیں۔آناً فاناً کمر یا کولہے میں چوٹ لگ جانے سے چت پڑے پڑے انہیں اٹھنے میں اتنی دیر تو لگ ہی جاتی ہے کہ وہ ان افراد سے بھی زیادہ بھیگے بھالو بنے گھر پہنچتے ہیں کہ جو باقاعدہ اپنی خوشی سے برسات کا مزہ لینے کے لیئے دھڑلے سے کھلم کھلا بھیگے تھے۔

گو اتنی گفتگو کے بعد ہمارے خواجہ صاحب کے تعارف کی مزید ضرورت تو نہیں لیکن چونکہ ہماری بیگم کے نزدیک وہ کاہلوں، بدذوقوں اور بدتوفیقوں کے غیر منتخب رہنما ہیں اس لیئے ان کو جان لینے سے ایک عجیب وغریب طرح کی طرزِ حیات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔مناظرِ فطرت ومظاہرِ قدرت سے پیٹھ موڑے بیٹھنے والے اس قبیل کے لوگوں کو قدرت برسات میں بھی پینے کو مفرح شربت کی جگہ کسیلا سا جوشاندہ اور کھانے کو لذیذ پکوانوں کی جگہ کثیف ہڑ کا مربہ عطا کرتی ہے اور جنہیں بغیر بھیگے بھی ایک گھنٹے میں بیٹھے بیٹھے کم از کم تین چار درجن چھینکیں مارنے کا ہنر عطا کر کے قدرت کرے ہی میں برسات سے زائد نمی فراہم کرتی ہے، ایسے نزلاتی لوگوں کے چپچپاتے خیالات کی وجہ سے اسیرانِ برسات ان سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں، یوں یہ حضرات اس موسم میں سوائے بند ناک اور بند گٹروں کا شکوہ کرتے رہنے اور بلدیہ و بجلی محکمے کو کوسنے کے، اور کوئی کام کرتے نہیں پائے جاتے۔

چونکہ عشق اور نزلہ کبھی بھی ہوسکتا ہے اور اس کے ستائے ہوؤں کو باہم قریب آتے دیر نہیں لگتی لٰہذا ایک جہاندیدہ پہنچے ہوئے بزرگ ان تک پہنچے اور عمر کے بڑے فرق کے باوجود خواجہ صاحب کے نزلہ شریک بھائی بن گئے ۔ بالآخر کئی دن تک سیاپے کے متواتر تبادلے اور برسات بیزاری کی یکسانیت نے انہیں باہم یوں جوڑ دیا کہ ایک دن فرطِ غمگساری سے، انہوں نے خواجہ کو اپنا داماد بنا لیا۔ یقیناً ایسا جہاندیدہ شخص ہی ان کے سسر کے مرتبے پہ فائز ہونے کا سزاوار تھے کہ جس نے اپنی بیٹی کے جہیز کیلیئے بھی سب سے پہلے دو چھتریوں اور دو برساتیوں کو خریدنا یاد رکھا تھا، لیکن صد حیف کہ اپنے خواجہ صاحب کو ان کے اس دفاعی ساز وسامان کے استعمال کی نوبت کبھی نہ آئی کیونکہ بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی ان کے پیر تو گویا بھاری سے ہو رہتے ہیں اور دنیا بھر میں کہیں بھی، کسی کمرے میں چھتری تان کے بیٹھنے کا چلن آخر ہے بھی تو نہیں۔

فہد خان

کی جاناں میں کون؟

میں کون ہوں؟۔ زمانہ قدیم سے ہی انسان اس سوال کے تعاقب میں پیدل چلتا رہا۔ ذرا شعور ملا تو گھوڑے دوڑانے لگا۔ پھر ریل گاڑی دوڑائی اور رائٹ برادران کے بعد جہاز اڑانے لگا۔

اس سوال کا جواب دینے کی کوشش فلسفیوں نے کی۔ کسی نے انسان کو پانی پانی جانا تو کسی نے خدا کا روپ۔ سائنس کہنے لگی کہ انسان ہڈیوں اور گوشت کا مرکب ہے۔ مگر کیا یہ ترکیب مکمل ہے؟ مذہب نے ایک جزو روح کا اضافہ کیا۔ ایک صاحب نے تو حد کردی: انسان کو حیوان کہہ ڈالا۔ ایک صاحب دور کی کوڑی لائے، انھوں نے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے سرگرداں۔۔۔ ادھر ادھر منہ مارتی مخلوق قرار دے ڈالا۔

مسلم ہندوستان میں حالؔی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کون ہوں۔ اقبالؔ نے بتایا کہ خود میں جھانک کر خود کو پہچان جاؤں۔ شبلی نے سوچا کہ آج کے میں کو جاننے کے لیے کل کا میں جاننا ضروری ہے۔ انھوں نے المامون، الفاروق کے آئینے میں مجھے میرا عکس دکھایا۔ مگر بات نہ بن پائی۔

کہتے ہیں چند صوفی اس راز تک پہنچ گئے تھے، مگر جب اس وادی سے واپسی پر وہ بول نہ سکتے تھے۔ وادی میں داخلے کی شرط قوتِ گویائی سے محرومی تھی۔ ایک منصور تھا جس نے بولنے کی کوشش کی لیکن پھر بولنے کے قابل نہ رہا۔

غرض منزل کسی کو نہ ملی۔۔۔

جس سوال کا جواب دیتے دیتے بڑے بڑے فلسفیوں کی بریکیں فیل ہو گئیں، شعراء گھائل ہو گئے، صوفی جان ہار بیٹھے اور سائنس دان عمریں لگا کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔۔۔ کیا ظلم ہے کہ شب و روز مجھے اس سوال سے گزرنا پڑتا ہے۔

''آپ کون ہیں؟'' انھوں نے لانبی لانبی غلاف نما پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

''فہد خان۔۔۔ فہد خان چغتائی!۔۔ نام تو سنا ہوگا۔'' ہم نے لہجے میں چاشنی بھر کر بڑے ''اسٹائل'' سے کہا۔

''خان؟ آپ پٹھان ہیں؟'' بینائی کے چشمے میں نہ جانے کس گہرائی سے یکا یک حیرت نمودار ہوئی۔

''ہاں۔۔ ہیں تو پٹھان بس ذرا دھوپ میں زیادہ رہتا ہوں۔''

پنکھڑیاں ذرا پھیلیں، مگر وہ ہنسی ضبط کرنے لگیں اور ہم موتیوں کے دیدار سے محروم رہے۔

''اچھا تو پھر آپ کو پشتو آتی ہوگی؟''

''دیکھیے ایک تو پشتو زبان کے قواعد کے مطابق پشتو آتی نہیں۔۔۔ آتا ہے۔ دوجا یہ کہ میں بھی اتنا اہلِ زبان ہوں جتنا عمران خان۔''

ہمارے اس اینچوڑ کا ناس مارا جائے۔۔۔ ہمیں مسخرا

سمجھتیں۔۔۔ہمیں مسکالگ گئیں۔

ہمارے نام پر ذرا غور کیجیے۔۔۔الفاظ شمار مت کیجیے، پیمانہ اٹھائیے (وہ بھی گز والا):

محمد فہد خان چغتائی

(عرفیت، تخلص، القاب و آداب دیدہ و دانستہ چھوڑے گئے ہیں۔)

مس حنا خالد کی کلاس میں پہلی دفعہ حاضری لگائی جارہی تھی۔ ہمارے نام پر وہ ٹھٹکیں۔

''خان اور چغتائی؟ وہ مغل نہیں ہوتے؟'' انہوں نے اس طرح پوچھا تھا جیسے کہ رہی ہوں اے کی چول ماری ظالما!

اب انہیں سمجھانے کی کوشش تو کی ہی کی سوچا کہ ایک با قاعدہ تحریر لکھ کر گلے میں آویزاں کر لی جائے تا کہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

چغتائی خان چنگیز خان کی پہلی بیوی بورتے کا دوسرے نمبر والا بیٹا تھا۔ وہی چنگیز خان جس نے کھوپڑیوں سے مینار تعمیر کیے۔ وہی چنگیز جو مردِ میدان تھا۔ نسل منگول تھی، جو مغل بھی کہلائی مرزا اور بیگ بھی۔ والد کے انتقال کے بعد اس نے پانچ وسطی ایشیائی ریاستوں (قازقستان، کرغزستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان) کی باگ دوڑ سنبھالی۔ اور یکم جولائی ۱۲۴۲ء کو وفات پائی۔ خاندانِ چغتائی دراصل اسی چغتائی خان کی اولاد ہے۔

سو جو چغتائی صاحب تھے، چنگیز خان کے بیٹے، وہ چغتائی خان تھے، اور ہم خان چغتائی ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہوتا AB ہے مگر لوگ چودہ سال پڑھ کر بھی BA کرتے ہیں۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟ (جی نہیں سنا۔۔ بھلا کیسے سنتے آپ؟۔ وہ فلموں میں نہیں آتے تھے!) عصمت چغتائی۔۔۔ لحاف والی کے بھائی اور اردو کے بہت بڑے نثار۔ وہ مرزا بھی تھے، بیگ بھی اور چغتائی بھی۔ خان نہ لکھتے تھے مبادا نام لمبا ہو جائے۔ واللہ اعلم

ایک سینہ بہ سینہ چلتی روایت کے مطابق اقبال نے اپنا مشہور مصرع (یوں تو سید بھی ہو۔۔۔) کچھ اس طرح لکھا تھا۔

یوں تو مرزا بھی ہو، بیگ بھی ہو، چغتائی بھی ہو

لیکن بعد میں شعری ضرورتوں کے تحت تبدیل کر دیا۔

کیوں کہ وزن خراب ہو رہا تھا۔ اب بھئی اتنے بڑے مردِ میدان کا نام آرہا ہے۔۔۔ چغتائی۔۔۔ توازن تو بگڑے گا ناں!۔

یہ تحریر لکھنے کے دوران ہی مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ غالب بھی اپنے دودھیال میں سے ہیں۔ بھئی اب ان کا نام، جو'' مرزا'' غالب تھا۔ حضرات توجہ فرمائیں۔۔۔ مرزا! پھر انہوں نے خود کہا ہے کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ہاں اب یہ مؤرخوں کی بد دیانتی دیکھیے کہ انہیں سلجوقیوں سے جا ملاتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں تاریخ تعصب سے عاری نہیں ہو سکتی۔۔ ان مورخوں کی اڑائی گرد ہی اتنی تھی کہ ایک شعر میں انہوں نے خود کو ماورا النہری تسلیم کر لیا۔ خیر یہ تو درست ہے کیوں کہ ماورا النہر وہی ہمارے چغتائی خان کا علاقہ ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے چغتائیوں کا تزکرہ نہ کرے۔ دشمنِ خاندانِ چغتائیاں نے ہمیشہ میدانِ کارزار میں ہار کر، اپنی شکست کا بدلہ ہم سے علمی دنیا میں لینے کی کوشش کی۔ اور ہائے ہماری بدقسمتی کے ہم تلوار کے تو دھنی رہے، قلم کے نہیں۔ لیکن اب صورتِ حال بدلتی جارہی ہے۔ مرزا غالب، مرزا عظیم بیگ اور عصمت کے بعد اب فہد خان جیسے لوگ بھی اس میدان میں اتر آئے ہیں۔ اور کشتوں کے پشتے لگا کر ہی جائیں گے۔ ان شاءاللہ

مقصد اس تحریر کے لکھنے کا یہ تھا کہ آپ جان لیجیے، مان لیجیے پہچان لیجیے۔ اور خبر دار اگر پھر کبھی کسی نے یہ سوال کیا، قسم بہ جلالِ پادشاہی سر بہ قلم کردن!۔ اگر ہمارے چغتائی خون نے جوش مارا اور ہم کچھ کر بیٹھے تو ہمیں موء ردِ الزام نہ ٹھرایا جائے نہ ہی تاریخ کی کتابوں میں کوئی ہفوات لکھی جائیں۔

وما علینا الا البلاغ المبین۔

تپتی ہوئی گرم دوپہر کو جونہی میں نے اے سی کوچ کے اندر قدم رکھا ایک سرد احساس رگ و پے میں اترتا چلا گیا۔ اپنی سیٹ تلاش کی اور سفری بیگ کو اپنے قدموں میں رکھ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔ کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا کر باہر دیکھا تو احساس ہوا کہ ہمارے ہاں اپر کلاس کو اپنی ٹھنڈی گاڑی کے اندر سے باہر تیز دھوپ میں کھڑے لوگ رنگ برنگے کپڑوں میں کیوں اتنے خوش و خرم اور مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھ بڑھا کر اے سی کی دونوں نوزلوں کا رخ عین اپنے سر پر کرتے ہوئے سامنے لگے ہوئے ڈیجیٹل کلاک پر ٹائم دیکھا، ڈیڑھ بج چکے تھے۔ بس ہوسٹس کی مترنم آواز نے سفری دعا پڑھائی اور کسی سے کوئی چیز لے کر نہ کھانے کی تلقین کی جو مجھ جیسے پاکستانیوں کو ہمیشہ بہت ناگوار گزرتی ہے۔

ابھی ہمیں نیند کا پہلا جھونکا ہی آیا ہوگا کہ اچانک پچھلی سیٹ سے ایک مردانہ بھاری بھرکم آواز ماحول کی خاموشی کو توڑتی ہوئی کانوں سے ٹکرائی۔ ہیلو۔۔۔ہیلو۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ہاں جی۔۔۔جی میں الطاف قصاب عرض کر رہا ہوں بھائی جی۔۔۔۔ وہ چھوٹی سی عرض تھی جناب عالی۔۔۔ پاء بشیر کو ملتان نشتر ہسپتال داخل کروا دیا ہے جی۔۔۔ ہاں جی اپنی جان پہچان والا بندہ مل گیا تھا۔۔۔جی پاء جی آپ بس دفتر سے تھوڑا سا ٹائم نکال کر ناں ڈاکٹروں کے کان کھینچ آئیں۔۔۔ ہاں جی آئی سی یو میں ہے ۱۲ نمبر پر۔۔۔۔۔جی باقی میں سنبھال لوں گا جی۔۔۔ اچھا اچھا۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔ہاں جی ہاں جی۔۔۔۔چلو ٹھیک ہے۔۔۔ جب آپ لاہور آئیں پاء جی۔۔جی میں منسٹر صاحب کے پی اے کو ساتھ لے کر جاؤں گا پاء جی۔۔اپنا مرید ہے۔۔۔اوکے او کے جی۔۔۔اللہ حافظ۔

سامنے کلاک پر ۲:۲۵۔۔۔ٹوں۔۔۔ٹوں۔۔۔ٹی۔۔۔ ٹوں۔۔ٹاں۔۔کون۔۔اچھا اچھا۔۔۔حاجی منیر صاحب۔۔۔ میں بھولے کو کہہ کر آیا تھا۔۔۔آپ بندہ بھیج کر منگوا لیں۔۔۔چلو اچھا جی میں ابھی پوچھ کر پھر آپ کو بتاتا ہوں۔۔۔آج کل ریٹ تیز ہے حاجی صاحب پر آپ سے پیسے لے کر ہم نے لاہور میں رہنا کیسے ہے۔۔۔ہاہاہاہا۔۔۔۔جی جی اچھا۔

کلاک پر ٹائم ۲:۳۵۔۔۔ہاں جی پتر بھولے کتنا مال باقی رہ گیا ہے۔۔۔اچھا پانی مارتے رہنا۔۔او حاجی منیر کا فون آیا تھا اس

خواتین کی خواندگی کا عالم یہ ہے کہ ایک خاتون کی سرکردگی میں ایک سروے ٹیم بلوچستان گئی، وہاں کئی قصبوں اور گاؤں میں پھرنے کے بعد ٹیم نے بتایا کہ اس سارے سفر کے دوران ہمیں صرف ایک پڑھی لکھی خاتون نظر آئی اور یہ خاتون وہ تھی جس کی سرکردگی میں یہ سروے ٹیم بلوچستان گئی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں اتنے ان پڑھ ہیں تو ان کی نمائندگی کے لئے بھی ان پڑھ ہی چاہئیں تاکہ وہ اسمبلی میں اس اکثریت کے مسائل بتا سکیں۔ اس لئے ہمارے ہاں سیاست دانوں میں ہائی تعلیم یافتہ وہ ہوتا ہے جو ہائی جماعت تک گیا ہو۔ یوں بھی پڑھے لکھے نورتن ہوتے ہیں، اکبر بننے کے لئے اَن پڑھ ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ایک وزیر سے ایک غیر ملکی صحافی نے پوچھا۔ ''آپ کی تعلیم؟'' جواب ملا۔ ''ایم اے، کرلیتا اگر میٹرک میں رہ نہ جاتا۔''

وکٹر ہوگیو نے کہا ہے ''بے روزگاری ماں ہے جس کا ایک بچہ لوٹ مار اور ایک بچی بھوک ہے۔'' ہمارے ہاں اس زچہ بچہ کی صحت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ سب سن کر میرا ایک دوست کہنے لگا ''اس سے تو لگتا ہے ایک بے روزگار سے زیادہ مظلوم دنیا میں کوئی نہیں۔''

ہم نے کہا ''ایک بے روزگار سے زیادہ مظلوم بھی دنیا میں ہیں۔''

بولا ''کون؟''

ہم نے کہا ''دو بے روزگار۔''

ڈاکٹر یونس بٹ

کے پائے رکھے ہیں۔۔۔او یار اس نے تو سیاپا ڈال دینا ہے۔۔بڑا ہولا بندہ ہے۔۔۔۔اچھا اس کا نوکر آئے تو اوجھڑی دے دینا،، ناں مانے تو اچھو سے ایک آدھ پایا لے کر نکا دینا۔۔۔او کے میں میاں چنوں پہنچ گیا ہوں۔۔ٹھیک آ۔

کلاک پر ٹائم ۲:۵۵۔ٹوں۔۔۔ٹاں۔۔۔ٹوں۔۔۔ ٹاں۔۔جی مستری صاحب۔۔۔اچھا اچھا میری گل کروا دیں۔۔۔سلام علیکم بھائی جی۔۔۔ڈی جی سیمنٹ آگیا پاجی۔ریٹ کتنا۔۔۔چلو چلو۔۔۔۲۰ گٹو لوڈ کروا دیں ہاں جی سریا وی۔۔۔اکو پھیرا لگ جائے گا جی۔۔۔او کے او کے میں شام تک چکر لگاتا ہوں۔۔۔ٹھیک۔

کلاک پر ٹائم ۳:۰۵۔۔ ہاں جی ہیلو۔۔بھولے کی ماں۔۔ سعودے کا فون آیا تھا دوبئی سے۔۔۔ پیسے کا کہہ رہا تھا میں نے کہا دو مہینے آسرا کرے بڑا مندا ہے۔۔۔۔اچھا اگر فیر فون آئے تو ٹال دینا۔۔۔ہاں جی اوکاڑہ کراس کر لیا ہے۔۔۔شیدے سے کہ دیں بھانے چکر مار آئے۔۔۔او کے کوئی آیا گیا۔۔۔اچھا اچھا۔۔۔

کلاک پر ٹائم ۴:۱۵۔۔۔۔۔ٹوں۔۔ ٹوں۔۔۔ ٹاں۔۔۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ الطاف قصاب کی کال پر کال جاری تھی۔۔۔میں خواہ مخواہ میں اس کی زندگی کے سیاسی ،سماجی، معاشی ،معاشرتی پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر چکا تھا۔ سر گھما کر باقی مسافروں کو دیکھا، سب اپنے اپنے کانوں میں ہینڈ فری لگائے پرسکون نیند کے مزے لے رہے تھے۔ میں نے اپنی ہینڈ فری تلاش کرنے کے لیے اپنی جیبوں اور بیگ کو ٹٹولا۔ کہاں ملنی تھی۔۔۔میری حالت اس بچے کی طرح ہو گئی جو میتھ کے ہوم ورک کی کاپی گھر بھول آیا ہو۔ اسی اضطراب میں بس ہوسٹس کو اشارے سے بلا کر پوچھا کہ ''ہینڈ فری'' ملے گی۔

اس نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے میرا ذہنی توازن درست نہ ہو اور سر جھٹکتی ، پاؤں پٹختی چلی گئی۔ میں شرمندہ ہو گیا اور باقی سفر میں پینے کے لیے پانی بھی نہ مانگ سکا۔

میں اپنے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگا جب میں نے مسٹر بین دیکھتے ہوئے اس پر قہقہے لگائے تھے۔

کلاک پر ٹائم ۵:۱۵۔۔۔۔بس ہوسٹس کی آواز۔۔۔۔تمام مسافروں سے التماس ہے کہ اپنے سفری بیگ اور دیگر سامان اپنے ہمراہ رکھ لیں۔۔۔ امید ہے آپ کا یہ سفر خوش گوار گزرا ہو گا۔۔۔۔۔میری طرف سے اس اعلان میں یہ بات شامل کر لیں کہ اگلے سفر پر اپنی ہینڈ فری اپنے ساتھ رکھیں بلکہ کانوں میں لگا کر بس میں سوار ہوں۔۔۔کیا پتہ کوئی الطاف قصاب آپ کا ہمسفر بن جائے اور اگر اسے آپ کے ساتھ والی سیٹ مل جائے تو یہ گانا ضرور سنیں

''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے
تو بات بن جائے
ہاں ہاں بات بن جائے''

شوکت جمال

جھاکا کھلنا

پنجابی برِ صغیر کی ان چند زبانوں میں سے ہے جن میں الفاظ کی شیرینی، اور ادائیگی میں سادگی اور روانی ہے۔ بعض لوگوں، خاص طور پر فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کے لہجے سے سننے والوں کو اس زبان میں کھردرے پن اور کرختگی کا احساس ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر پنجابی زبان کی چاشنی اور مقبولیت مسلّم ہے۔ اس زبان میں کئی الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو اور دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ہیں مگر مطلب میں اکثر زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر راقم الحروف کے یہ چار مصرعے دیکھ لیجیے۔

یہ کیسا عشق ہے عاشق پڑا دن رات سوتا ہے
نہ آہِ سرد بھرتا ہے نہ گاتا ہے نہ روتا ہے
کہاوت ہے یہ اردو اور پنجابی زبانوں میں
جو جاگے ہے سو پاوے ہے جو سوتا ہے وہ ''کھوتا'' ہے

اس زبان کے کئی الفاظ ایسے ہیں جن کو صحیح طور پر ادا کرنا ایک فن ہے اور بقول شاعر۔۔۔عشق بن یہ ہنر نہیں آتا۔ سو جب تک آپ اس زبان یا کسی صاحبِ زبان سے عشق نہیں کریں گے آپ کی پنجابی ایسی ہی رہے گی جیسے میری انگریزی! میرے ایک محسن نے پنجابی زبان اور تہذیب سے میرے والہانہ لگاؤ کو دیکھ کر مجھے ایک مشہور محاورہ ''جو کرے گھیو نہ کرے ماں نہ کرے پیو'' آج سے تقریباً چالیس سال پہلے رٹایا تھا۔ وہ اکثر ملتے ہیں اور یہ محاورہ مجھ سے ضرور سنتے ہیں لیکن انگلی تو انگلی۔۔۔زبان ٹیڑھی کرنے کے باجود میرے حلق سے ویسا گھیو نہیں نکلتا جیسا انہیں چاہیے۔

پنجابی کے کئی الفاظ ایسے ہیں جن کا نعم البدل کسی اور زبان میں نہیں ملتا، مثال کے طور پر ولٹوئی، چرغہ، کتلما، کھرا، وغیرہ۔ آیئے کیوں نہ یہاں کھرے کا کچھ بیاں ہوجائے۔ کھرا سطح زمین سے چند انچ نیچے ہوتا ہے۔ اس کے ایک سرے پر کارپوریشن کا نلکا لگا ہوتا ہے یا ہینڈ پمپ، جس کے منہ پر ایک لمبا سا کپڑا لٹکا ہوتا ہے۔ اس کپڑے کو عرفِ عام میں ''ٹاکی'' کہتے ہیں۔ یہی ٹاکی پانی کی دھار کو کنٹرول کرتی ہے۔ حسبِ ضرورت آپ اس سے دھار کو لمبی یا چھوٹی، تیز یا آہستہ کرسکتے ہیں۔ فلیٹوں میں رہنے والے کھرے کی افادیت سے محروم ہیں، چونکہ اس کے لئے گھر میں صحن یا ویہڑہ ہونا لازمی ہے۔ گھر بھر کے کپڑے، برتن، دال، چاول، گوشت، سبزی، خاص طور پر ساگ، اوجھڑی، سری پائے وغیرہ کی دھلائی کھرے میں ہی تسلی

سوال جواب

سوال میں ہائی سکول میں پڑھتا ہوں لیکن کورس کی کتابوں کے علاوہ لائبریری کے رسالوں اور کتب کے مطالعے کا بھی شوق ہے۔آپ سے پوچھنا ہے کہ ایک طرف تو خودی کی اہمیت پرزور دیا گیا ہے ادھر ایک بڑے مشہور شاعر نے "اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاہئے" کی خواہش ظاہر کی ہے، بھلا کس پر عمل کیا جائے؟

جواب ہم نے آپ کے سوال کے سلسلے میں تین شاعروں، چار نقادوں اور پانچ پروفیسروں سے رابطہ قائم کیا، لیکن وہ اب تک خاموش ہیں۔ جوں ہی ہمیں کوئی تسلی بخش جواب ملا، فوراً شائع کردیں گے۔ مطمئن رہیں۔

دریچے از شفیق الرحمن

بخش طور پر ہوسکتی ہے۔ صبح کو آپ ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہوں، مسواک کرتے ہوں، منجن ملتے ہوں یا کوئلے کے سفوف سے ہی کام چلاتے ہوں، کلی کرنے کے لئے کھرا مناسب ترین جگہ ہے۔ آپ باہر سے آئیں، پاؤں اور جوتے کیچڑ میں لپٹے ہوں تو پہلے کھرے کا رخ کیجیے۔ وضو کرنے، نہانے اور بچوں کو نہلانے کیلئے بھی اسے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ خود نہانا ہو تو بہتر ہے کہ کھرے کے اوپر ایک چادر تان لیں تاکہ پاس پڑوس سے جھاکی نہ پڑے، آگے آپ کی مرضی۔ ایمرجنسی کی حالت میں کھرے پر ہی چھوٹے بچوں کو ضروریات سے فارغ بھی کرایا جاسکتا ہے۔ دیکھا آپ نے، کس قدر کثیر المقاصد مقام ہے یہ کھرا؟

آمدم برسرِ مطلب، آج آپ کو جس عدیم المثال پنجابی محاورے سے متعارف کروا رہا ہوں وہ ہے "جھاکا کھلنا"۔ جھاکا کھولنے سے پہلے "جھاکا" کا صحیح تلفظ آنا بہت ضروری ہے۔ یہ لفظ ڈھاکا، ٹھاما، یا دھاگا کا ہم وزن تو ہوسکتا ہے مگر ہم آواز نہیں ہے۔ اس میں جھاکا کا جیم، "ج" اور "چ" کی درمیانی آواز میں نکالنا پڑتا ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح اس میں جو دو چشمی "ھ" ہے اس کی آواز بھی آدھی نکالی جاتی ہے اور بقیہ آدھی حلق میں ہی تحلیل کرنی پڑتی ہے۔ یہ تھا "جھاکا" بولنے کے صحیح طریقہ۔ آگے پڑھنے سے پہلے آپ چاہیں تو اس کی اچھی طرح سے مشق کرلیجیے۔۔۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

شاعری میں شرم، جھجک، ہچکچاہٹ جیسے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں یا۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہوجائے، کہیں ویسا نہ ہوجائے۔۔۔ قسم کے جو مصرعے کہے گئے ہیں، ان سب کو جمع کیجیے تو جو حاصل نکلے گا وہی جھاکا کہلاتا ہے۔ دیکھا آپ نے، پنجابی کا ایک ہی لفظ اپنے اندر الفاظ اور معانی کا کتنا بڑا سمندر سموئے ہوئے ہے! ایک دفعہ جھاکا کھل جائے تو بہت سے راستے کھل جاتے ہیں اور دور تک روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی مثال پیشِ خدمت ہے۔ کمپنی کی ملازمت میں بہت عرصے تک میری اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اپنے شیخ سے معاہدے (یہاں کی زبان میں عقد) کی رُو سے جو حقوق اور سہولتیں ہیں، ان سے زیادہ کچھ مانگ سکوں۔ ایک دفعہ حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ عقد کی حدود تجاوز کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ رہا۔ چناں چہ میں نے خوف اور جھجک کو بالائے طاق رکھ کے شیخ سے حرفِ مطلب بیان کرہی دیا۔ نہ جانے وہ کس خوشگوار موڈ میں تھا، میری درخواست منظور ہوگئی۔ کام کیا نکلا، میرا تو جھاکا ہی کھل گیا۔ اب کوئی بھی مسئلہ ہو، میں تکلف نہیں کرتا۔

اسی طرح پہلے پہل قرض کے لئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی کارے دارد۔ اس کے لئے جھاکا بڑی مشکل سے کھلتا ہے۔ لیکن اگر ایک دفعہ کام بن جائے تو پھر چل سو چل۔ قرض کے معاملے میں ہمارے حکمرانوں کا کارنامہ ہی دیکھ لیجیے، جھاکا کیا کھلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے قرض دینے والے تمام بین الاقوامی اداروں کے ہاں ہمارے کھاتے کھل گئے اور وہ بھی کئی جلدوں میں۔

شاعر اور ادیب بھی جب نئے نئے میدان میں اترتے ہیں تو ان کا جھاکا کھلنے میں ذرا وقت لگتا ہے۔ خاص طور پر شاعر کا جب تک اچھی طرح سے جھاکا کھل نہ جائے وہ مشاعرے میں اپنا

کلام بے دھڑک نہیں پڑھ سکتا۔ ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، سر پر ہوٹنگ کا خوف سوار ہوجاتا ہے۔ نئے آنے والوں کو چھوڑیے، ایک بہت ہی مشہور اور منجھے ہوئے ادیب اور شاعر جن کا شمار اپنے ملک کے ممتاز لکھاریوں میں ہوتا تھا، سعودی عرب آ کر بہت عرصے تک گوشہ نشیں رہے اور اپنے احباب کے سامنے بھی کھلنے سے پرہیز کرتے رہے۔ جھاکا تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بہرحال جب خدا خدا کر کے کفر ٹوٹا تو الامان الحفیظ۔ آپس کی بات ہے، مجھے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے جھاکا کھولنے میں بارہ تیرہ سال کا عرصہ لگ گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا دیوان پہلے چھپا اور جھاکا بعد میں کھلا۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے۔۔۔ اُس کے لئے جھاکا کھولنا بہت ضروری ہوجاتا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ وہ بچارا جھاکا ہی کھولتا رہ جائے اور محبوبہ کی منگنی کہیں اور ہوجائے۔ جھاکا ایک پیراشوٹ کی طرح ہے۔ جہاز سے کودتے ہوئے اگر وقت پر پیراشوٹ نہیں کھلا تو نیچے لیموزین کی جگہ میت گاڑی ہی ملے گی۔ کئی کوششوں کے باوجود جھاکا نہ کھل سکنے کی وجہ سے نہ جانے اس شاعر کی محبت کا کیا انجام ہوا ہوگا جس نے یہ کہا ہے ۔

ابھی تو رعبِ جمال سے ہم زباں بریدہ سے ہو رہے ہیں
دیا سہارا جو ہمتوں نے تو اُن سے کچھ التجا کریں گے

اور حضرت آبروؔ کو تو جھاکا کھولنے کے کئی مواقع ملے مگر بقول ان کے ۔

یوں آبروؔ بناوے دل میں ہزار باتاں
جب تیرے آگے آوے، گفتار بھول جاوے

پرانے زمانے کے عاشق بھی کیا عاشق ہوتے تھے۔ ان کا جھاکا پیدائشی طور پر کھلا ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر مجنوں، فرہاد اور رانجھا کو ہی لے لیجیے جو بالترتیب لیلیٰ، شیریں اور ہیر کے علاوہ ان خواتین کے والدین اور عزیزوں کے سامنے بھی حالِ دل ڈنکے کی چوٹ پر کہتے رہے ۔

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دَیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

آج کل مشترک درسگاہوں، دفتروں اور کاروباری اداروں میں شانہ بہ شانہ کام کرنے اور دوسری سماجی سہولیات کی وجہ سے محبت کے ماروں کا جھاکا بھی جلد ہی کھل جاتا ہے اگرچہ جھاکا کھولنے کے لئے فلمی طریقے زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں...... مثلاً رومال گرا کر، کرایے کے غنڈوں سے محبوبہ کو ''چھڑوا'' کر، وغیرہ وغیرہ۔ جھاکا کھولنے کے لئے بعض دفعہ بڑی صاف گوئی سے کام لیا جاتا ہے مثلاً محبوبہ کو سڑک پر ہی روک کر کہا جاتا ہے ''آجا، نی بے جا سائکل تے''، یا ''چل چلئے دنیا دے اُس نکڑے'' ۔ بعض منچلے تو ''قمیض تیری کالی۔۔۔'' گا کر محبوبہ کے ذاتی معاملات میں بھی دخل انداز ہونے سے نہیں چوکتے۔ تجربہ کی بنیاد پر میری اپنی رائے یہ ہے کہ جس محبت میں جھاکا جلدی کھل جائے یا جان بوجھ کر کھول لیا جائے وہ عشق، الحاق یا تعلق پائیدار نہیں ہوتا۔ کئی فلمی، سماجی اور سیاسی شخصیتوں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ جھٹ منگنی، پٹ بیاہ، کھٹ طلاق۔۔۔!

سنا ہے کہ پرانے زمانے میں بہت سی بیویاں ایسی بھی گزری ہیں جن کا اپنے شوہروں سے تمام عمر جھاکا نہیں کھل سکا۔ دروغ بر گردنِ راوی، بعض ایسی خواتین کو تو سالوں تک اپنے ''اُن'' کا حلیہ بھی نہیں معلوم ہوسکا جن کے ساتھ ان کی قسمت جوڑی یا پھوڑی گئی۔ بعد میں بچوں کی شکل دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا۔ اس دور میں ایسی بیویاں تو شاید نہ مل سکیں لیکن ایسے شوہر ضرور پائے جاتے ہیں جن کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے طویل رفاقت کے باوجود بیگم سے ان کا جھاکا نہ کھلا ہو۔ ایک ایسے ہی صاحب کسی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ایک دن شام کو گھر آئے، سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے لئے گھڑے پر ہاتھ دھونے لگے۔ بیگم نے جوڈپٹ کر پوچھا کہ یہ ہاتھ کس خوشی میں دھوئے جا رہے ہیں تو کھسیا کر بولے، ''ایویں ای۔۔۔ ذرا کا کے نوں چکنا سی''۔ ویسے ان جیسے شوہر حضرات پر پنجابی کا ایک اور دلچسپ محاورہ چپکتا ہے۔۔۔ ''تھلّے لگنا''۔ اس محاورے کے بارے میں پھر کبھی بات ہوگی۔

تیسری آنکھ

آنکھیں جسم کے وہ اعضاء ہیں جن کی مدد سے ہم سارے جہاں کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں اکثر الیکشن اور سلیکشن کا کھیل جاری رہتا ہے اس لئے آنکھیں کھلی رکھنے کی بے حد ضرورت ہے۔ ویسے ان دنوں آنکھ لگتی ہی کہاں ہے جو کھلی رکھنی پڑیں۔ پچھلے دنوں میں نے پاکستان چھٹیوں کے دوران دیکھا کہ دن بھر گیس کی لوڈشیڈنگ کے باعث لوگ آدھی رات کے وقت یارات کے آخری پہر کچن کا رخ کرنے لگے ہیں ۔لوگوں نے گھروں میں چولھا، گیزر۔استری ،جنریٹر، اور بلب تک گیس پر چلانے کا انتظام کیا ہے۔ یہاں تک کہ ۸۰ فیصد ٹرانسپورٹ گیس پر چلتی ہے اسے کہتے ہیں کہ'' آنکھ ایک نہیں کجلوٹیاں نو نو۔''

تقریباً ۱۰ برس قبل تک ہم گیس کی لوڈشیڈنگ کے نام سے بھی غیر مانوس تھے۔ اب یہ حال ہے کہ فجر کی اذان دینے کے لئے مولوی صاحب صبح ۵ بجے بیدار ہوتے ہیں اس کے برعکس جس ماں کے بچے اسکول جاتے ہیں وہ صبح ۴ بجے اٹھ جاتی ہے تا کہ ناشتہ، لنچ اور ڈنر ایک ساتھ ہی بنا سکے۔ اس کے علاوہ ایک نئی دریافت بھی ہوئی ہے کہ اپنے گیس ہیٹر کے ساتھ فریج کا کمپریسر لگا دیا جاتا ہے جس کی مدد سے آپ پڑوسیوں کی گیس کھینچ سکتے ہیں لیکن یہ بھی کوئی حل نہیں ہے کیونکہ وہ دن دور نہیں جب سارے لوگ پڑوسیوں کی گیس کھینچنے لگیں گے پھر کسی کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ بجلی تو پہلے ہی ناپید تھی، اب گیس بھی ہوا میں تحلیل ہوگئی ہے۔

یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ الیکشن کے دوران لوگ آنکھ بند کر کے غیر مستحق افراد کو شاہی محلات کا حقدار بنا دیتے ہیں اس کے بعد ۵ سال تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منتخب امیدوار کو اُس سائنسدان کی طرح تلاش کرتے ہیں جو نئے نئے سیارے دریافت کرنے کے خبط میں ہر وقت آسمان کی طرف آنکھیں لگائے رکھتا ہے۔ اس سائنسدان کو تو کبھی نہ کبھی کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لیکن ووٹر آنکھوں میں امید کے چراغ لئے مارے مارے پھرتا ہے اور اس کی منتخب امیدوار وزارت کی کرسی پر جُڑ چکا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں اس طوطے کی طرح بدل لیتا ہے جسے آزاد کرنے بعد بھی اس کے واپس پنجرے میں آنے کی امید رکھی جاتی ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ آنکھوں میں شرم ہو تو جہاز سے بھاری ہیں۔

آج کل کچھ سیاستدانوں کے بارے میں یہی نعرہ سنتے ہیں کہ'' ایک ہی سب پر بھاری'' یہ الگ بات ہے کہ پوری قوم سے ایک کا ہی بوجھ برداشت نہیں ہو رہا۔ حکومت کی تو پوری کوشش

ہے کہ عوام کی آنکھ میں نیل کی سلائی پھیری جائے تاکہ اندھے عوام ہمیں اگلے انتخابات میں ایوان میں پہنچانے کا انتظام کر دیں۔ آج بھی اگر عوام نے اپنی آنکھوں سے پٹی نہ اتاری تو وہ دن دور نہیں جب لوگوں کی آنکھوں میں بھی لوڈ شیڈنگ اتر آئے گی، پھر شکایت ہوگی کہ ہماری آنکھوں کے تارے چھوٹ رہے ہیں۔ اگر آپ لاپروا لوگوں کو اپنا حکمران منتخب کریں گے تو وہ آپ کو سر آنکھوں پر کیا خاک بٹھائیں گے؟ وہ تو انتخابات جیتنے کے بعد اپنی آنکھ میلی کر کے چھومنتر ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آنکھوں سے دریا بہانے سے بھی کام نہیں چلے گا۔

آج صاحبانِ حل و عقد نے عوام کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کا پکا ارادہ کیا ہے اور ہم ہیں کہ آنکھوں میں امیدوں کے چراغ جلا کر بہتری کی آس پر زندہ ہیں حالانکہ اُن کی آنکھوں کا تو پانی مر گیا

ہے۔ وہ اقتدار کی راہداریوں میں آنکھیں پھیر کر گھوم رہے ہیں اور عوام کی آنکھیں آسمان پر لگی ہیں۔ اگر کوئی غریب اپنی فریاد لے کر جاتا ہے تو اُسے آنکھیں دکھاتے ہیں۔ غریب اپنی پُر آشوب آنکھیں لے کر مایوس لوٹ آتا ہے۔

آج غربت و افلاس کی چکی میں پستے ہوئے لوگ ''تنگ آمد، بجنگ آمد'' کے مصداق احتجاج کے لئے گھروں سے نکلنے میں ذرا بھی تامل کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ دراصل جب سے ایک کالے نے تبدیلی کے نام پر ''سفید گھر'' میں قیام کیا ہے، تب سے ہر کوئی تبدیلی کا نعرہ لگا کر بھولے بھالے عوام کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ پہلے خطروں کے کھلاڑی نے تبدیلی کا نعرہ لگایا اور لوگ اپنی اپنی ڈنر پارٹیاں چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں ایک بال سے دو وکٹیں لینے کا ماہر ہوں۔ اس لئے میں ہی تبدیلی لا سکتا ہوں۔ اُس کے بعد ایک دور سے تشریف لائے ہوئے صاحب نے تبدیلی کا نعرہ لگا کر عوام کی ٹوپی ڈرامے کے ذریعے ٹوپی پہنا دی۔ ۳ دن تک ڈی چوک میں کھڑے ہو کر حکومت کا گالیاں دیتے رہے اور چوتھے دن شام کے وقت بے اختیار ان کے لبوں پر یہ نغمہ آگیا:

''آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے''

عرفِ عام میں اُسے وزارتِ عظمیٰ کا پیدائشی امیدوار کہتے ہیں۔ خبردار! جو کسی نے اِسے دو پارٹیوں کے ''مک مکا'' کا نام دیا۔ وہ انقلاب کا نعرہ لگا کر لوگوں کی قیادت فرما رہے تھے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے منفرد انقلاب ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے، اُن میں رہنما بھی عوام کے درمیان ہوتا تھا۔ جبکہ یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ کوئی رہنما عوام کو سڑکوں پر بٹھا کر خود فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے کی طرح سہولیات سے مزین کنٹینر میں تشریف فرما تھے۔ پیروکار کھلے میدان میں سخت سردی میں ٹھٹھرتے رہے اور مرشد لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے تھے اور بھولے عوام انقلاب کے نام پر آنکھیں موند کر نعرے بازی کر رہے تھے۔

میں اکثر سوچتا تھا کہ ہماری قوم دونوں آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود دھوکے میں کیسے آجاتی ہے؟

میں نے ایک دن خواجہ خوانخواہ سے پوچھا تو اُس نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے کہا کہ قوم کو اس وقت تین آنکھوں کی ضرورت

ہے۔ اِن میں دو سامنے کی طرف اور ایک عقب کی جانب ہونی چاہیے۔ میں پھر عقل کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگا کہ تیسری آنکھ کہاں سے آئے گی۔

آج آخبار میں یہ خبر پڑھ کر حیرت سے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں کہ نیویارک یونیورسٹی میں عراقی نژاد امریکی پروفیسر وفا بلال نے اپنے دماغ کے عقبی حصے میں تیسری آنکھ کے طور پر ایک کیمرہ نصب کرا لیا ہے۔ اس کی تنصیب کے لئے باقاعدہ سرجری کرانی پڑی۔ اس عمل کو تیسری آنکھ کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عراقی باشندے امریکہ جانے کے بعد بھی آپریشن اور تنصیبات سے جڑے رہتے ہیں۔ بہر حال اِس تیسری آنکھ کی مدد سے انسان پیٹھ پیچھے آتے شخص کو بھی بآسانی دیکھ سکتا ہے۔ اس ایجاد کے بعد پیٹھ میں خنجر گھونپنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ جس قوم کی پہلے ہی مہنگائی، بیروزگاری، انتہا پسندی اور غربت و افلاس کی وجہ سے پیٹھ چارپائی سے لگ جائے، اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

امید ہے کہ آئندہ انتخابات میں پوری قوم اپنی تیسری آنکھ کھلی رکھے گی۔ ارے ارے یہ کیا کہہ رہے ہو ہمارے ہاں لوگوں کے پاس تیسری آنکھ کہاں ہے وہ تو ''سپر پاور'' کے پاس ہے جو ہر وقت پوری دنیا پر تیسری آنکھ سے نظر رکھتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہمارے پاس تیسری آنکھ نہیں لیکن خواجہ خوامخواہ کہتے ہیں کہ عقل کی بھی ایک آنکھ ہوتی ہے۔

موٹر سائیکل

میرا دوست ''ف'' کہتا ہے محبت بڑا بے زبان جذبہ ہے، یعنی اظہار کے لئے زبان کا محتاج نہیں۔ ''ف'' کہتا ہے میں موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھنے والے کے انداز سے اس کے چلانے والے کے ساتھ رشتے کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ اگر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھی خاتون کے بجائے چلانے والا شرما رہا ہو تو سمجھ لیں وہ اس کی ''اہل خانہ'' ہے اور اگر وہ اس طرح بیٹھے ہوں کہ دیکھنے والے شرما رہے ہوں تو سمجھ لیں ''اہل کھانا'' ہے۔

موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھنا بھی ایک فن ہے۔ خواتین منہ ایک طرف کر کے یوں بیٹھتی ہیں کہ جیسے ابھی اترنے والی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات بیٹھی ہوئی نہیں بٹھائی ہوئی لگتی ہیں۔ کچھ خواتین تو خوفزدہ مرغی کی طرح پروں میں کئی بچے چھپائے ہوئے ہوتی ہیں۔ لگتا ہے سفر نہیں ''suffer'' کر رہی ہیں۔ چندیوں بیٹھی ہوتی ہیں جیسے چلانے والے کی اوٹ میں نماز پڑھ رہی ہوں۔ بعض تو دور سے کپڑوں کی ایک ڈھیری سی لگتی ہیں۔ جب تک یہ ڈھیری اتر کر چلنے نہ لگے، پتا نہیں چلتا اس کا منہ کس طرف ہے؟

نئی نویلی دلہن نے خاوند کو پیچھے سے یوں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہوتا ہے جیسے ابھی تک اس پر اعتبار نہ ہو۔ جبکہ بوڑھی عورتوں کی گرفت بتاتی ہے کہ انہیں خود پر اعتبار نہیں۔

جب میں کسی شخص کو سائیکل کے پیچھے بیٹھے دیکھتا ہوں جس نے اپنے جیسا انسان سائیکل میں جوت رکھا ہوتا ہے تو میرے منہ سے بد دعا نکلتی ہے۔ مگر جب میں کسی کو موٹر سائیکل کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلانے والے پر اعتماد کئے بیٹھے دیکھتا ہوں تو میرے منہ سے اس کے لئے دعا نکلتی ہے کیونکہ اس سیٹ پر مجھے اپنی پوری قوم بیٹھی نظر آ رہی ہوتی ہے۔

شیطانیاں از ڈاکٹر یونس بٹ

نفیسہ سلطانہ

پسینہ

ہم بچپن سے ہی اپنے گھر میں بہت عقل منداور پڑھاکو مشہور تھے،اس بات پر ہمیں بھی بہت ناز تھا کہ ہمارا رزلٹ دوسرے، بہن بھائیوں سے کہیں اچھا آتا تھا۔

پڑھاکو ہونے کی وجہ سے ہمارے ابا حضور نے ہمیں کالج جانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔۔۔ ہماری تینوں بڑی بہنوں نے کالج کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی ، ہاں البتہ سسرال کا منہ ضرور دیکھ لیا تھا۔اُن دنوں گھروں میں فون ہی نہیں تھے تو موبائل واٹس ایپ اور فیس بک وغیرہ تو کسی کے خواب اور گمان میں بھی نہ ہوں گے۔

لڑکے اگر کسی لڑکی سے کچھ بات کہنا چاہتا تو بڑی مشقتوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بیچارے لڑکے کسی گلی کے چوراھے پر کھڑے، کسی دیوار کی آڑ میں یا کسی بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے گھنٹوں، سکول یا کالج جانے والی لڑکیوں کا انتظار کرتے اور جب اُن کے پاس سے گزرہوتا تو پہلے سے سوچا ہوا کوئی فقرہ کستے اور لڑکیوں کے چہرے شرم سے گلنار ہو جاتے ۔لڑکی من ہی من میں کھی کھی کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

اب ہم ٹھہرے پڑھاکو ٹائپ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے ہمیں چھیڑنے کی ہمت کر بھی لی تو اسے بعد میں پچھتاوا ہی ہاتھ لگا۔ ہمارے گھر سے کالج دو کلومیٹر دور تھا،کبھی وہاں ہم پیدل جاتے اور کبھی تانگہ میں۔۔۔ تین لڑکیوں کا گروپ تھا،کبھی چار بھی ہو جاتی تھیں۔راستے میں تنگ گلیاں بھی پڑتی تھیں،واپسی میں دونوں سہیلیوں کے گھر پہلے پڑتے تھے اور کچھ راستہ ہمیں پیدل کاٹنا پڑتا تھا۔

ہم کئی دن سے نوٹ کر رہے تھے کہ ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا لڑکا، جب ہم اکیلے ہو جاتے ہیں، ہمارا پیچھا کرتا ہوا گھر کی گلی تک آتا، گلی کے موڑ پر کھڑا ہو کر ہمیں دیکھتا جب تک ہم گھر کے اندر داخل نہ ہو جاتے۔

اِس بات کا احساس ہوا تو ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔۔۔اللہ

رحم کرے اب کیا ہوگا گھر والوں کو خبر ہوگئی تو آگے کی پڑھائی گئی ہاتھ سے۔۔۔خیر ایک دن ہم اسی تپلی گلی سے تیز تیز چلے جا رہے تھے کہ اچانک وہی لمبے قد کا ہیولہ نمودار ہوا، اس نے اپنا لمبا پتلا ہاتھ ہماری طرف بڑھایا۔۔شاید اس کے ہاتھ میں رومال تھا 'عجیب و غریب قسم کی خوشبو اُس رومال میں بسی ہوئی تھی۔ بس ہماری ناک پر لگنا ہی چاہتا تھا کہ ہمارے اندر کی غصیلی لڑکی باہر آگئی اور پوری قوت سے اپنا الٹا ہاتھ اسے دے مارا جو اس کے رومال والے ہاتھ پر جا پڑا۔ چوڑی چین والی گھڑی کھل کر نالی میں گری اور رومال زمین پر (شاید کسی مولوی صاحب سے دم والا عطر لگا کر لایا تھا لڑکی کو پٹانے کے لئے) اور خود سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس حادثے سے ہماری حالت خراب ہوگئی سانس پھول گئی' ہاتھ پیر کانپنے لگے، کتابیں الگ گر گئیں۔۔۔جیسے تیسے کتابیں سمیٹ کر گھر کی طرف دوڑے۔ اپنے ہاتھ کے پچھلے حصے سے گھن سی آ رہی تھی جو اس نامراد سے ٹکرایا تھا۔

ڈرتے ڈرتے گھر پہنچے، سب سے پہلے تو صابن سے ہاتھ دھویا۔ بڑی مشکل سے دل و دماغ قابو میں آئے۔ ابھی ہم پوری طرح اس حادثے کے خوف سے باہر بھی نہ آئے تھے کہ باہر سے ہمارے بھائی صاحب دندناتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

''اسی لئے میں نے کہا تھا کہ کالج پڑھنے مت جاؤ، خراب ماحول ہوتا ہے کالج کا، لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں، بے شرم ہوجاتی ہیں لڑکیاں۔''

ہم اپنا قصور سمجھ کر آنکھوں میں آنسو بھر کر خاموش۔۔۔کسی نے آنکھوں دیکھا حال اُنہیں سنا دیا تھا اور وہ گھر جا کر اس کی مرمت بھی کر آئے تھے۔ بھائی کا فرمان جاری ہوگیا کہ آج سے کالج جانا بند!

لیکن ہم ٹھہرے اپنے ابا حضور کی لاڈلی، ہمارا کالج کون بند کروا سکتا تھا۔۔۔ہاں شاید اس لڑکے کی ٹانگیں کھینچ لی گئی تھیں، وہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔

چھیڑ چھاڑ کرنے والوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔۔۔

پہلی قسم چٹ پٹے فقرے کسنے والے۔۔۔

دوسری قسم پیچھا کر کے کالج سے گھر، گھر سے کالج چھوڑ کر آنے والے۔۔۔

اور تیسری قسم سب سے زیادہ خطرناک۔۔۔ پرچہ بزائی کرنے والی۔۔۔

ایک بار پہلی قسم والے لڑکوں کے گروپ میں سے کسی نے کہا۔۔''یار سن! تو نے کبھی ۱۰۱ کا ہندسہ چلتے ہوئے دیکھا ہے؟''

دوسرے نے کہا ''نہیں!''

پہلا بولا ''دیکھ! وہ آگے جا رہا ہے!!''

اور کئی قہقہے ایک ساتھ گونجے۔

ہم نے غور کیا تو پتہ چلا کہ ہم تین لڑکیوں میں سے سب سے چھوٹے قد والی درمیان میں تھی ہم دو لمبے قد کی آس پاس۔۔۔ہماری بھی ہنسی نکل گئی، لیکن بغیر کسی آواز کے۔

ایک بار دو ماہ کی چھٹیوں کے بعد ہم اپنے دو عدد بھانجوں کو، جن کا نرسری میں نیا نیا ایڈمیشن ہوا تھا، سکول چھوڑنے جا رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ''دو ماہ میں دو دو''

ہمارے تو مارے شرمندگی کے پسینے چھوٹ گئے۔ اُس دن کے بعد ہم کسی بچے کو اسکول چھوڑنے نہیں گئے۔

ایک بار ایک دوسری قسم والا لڑکا ہمارے پیچھے روز آنا شروع ہوگیا۔۔۔ہم تینوں کو سمجھ نہ آئی کہ کس پر عاشق ہیں؟

موصوف روز ایک ڈیڑھ کلو میٹر دور تک چل کر اپنی ٹانگیں تھکاتے تھے۔۔۔ہمارے گروپ میں ایک لڑکی زیادہ حسین تھی، باقی ہم اوسط درجے پہ فائز۔۔۔ہم بے فکر تھیں کہ جو لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت ہے، اُسی کے پیچھے ہوگا۔۔۔کئی دن اسی طرح چلتا رہا۔۔۔ہم نظر انداز کرتے رہے کہ کچھ دن تھک ہار کے خود ہی آنا چھوڑ دے گا۔۔۔لیکن واہ ری ہمت۔۔۔ایک دن آگے بڑھا تیزی سے اور ایک گولڈن رنگ کا قلم ہمارے ہاتھ میں پکڑی فائل میں ٹھونس کر یہ جا وہ جا۔

میں ہکی بکی رہ گئی۔۔۔گھبرا کے فائل ہی دور پھینک دی۔ فائل کہیں گئی قلم کہیں۔۔۔جلدی سے بھاگ کر فائل اٹھائی اور ہم

تینوں تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔

دل ہی دل میں گالیاں دیتی ہوئیں۔۔۔دونوں لڑکیاں ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں۔۔۔وہ تو خیر ہوئی کہ اس کے بعد وہ کبھی نظر نہ آیا!!

لڑکوں کی تیسری قسم پرچے باز ہوتی ہے۔۔۔اپنا دردِ دل، دردِ محبت خوشبوؤں والے کاغذ پر لکھا۔۔۔کہیں کہیں آنسو ٹپکا کر سیاہی پھیلا دی۔۔۔تو کہیں لڑکی کا نام خون سے لکھ دیا۔ اللہ ہی بہتر جانے کہ آنسو پانی ہوتے ہوں اور خون لال سیاہی۔ پرچے میں پتھر لپیٹ کر چھت پر پھینک دیا۔۔۔اب اگر وہ کسی کے ہاتھ لگ گیا تو گھر میں قیامت۔۔۔پرچے میں اعلیٰ قسم کی شاعری۔۔۔ایسی شاعری کہ غالب اور میر پڑھ لیتے تو شاید شاعری ہی چھوڑ دیتے، جیسے ؎

شیشی بھری گلاب کی پتھر سے پھوڑ دوں
تو نظر نہ آئے تو اپنا سر پھوڑ دوں

ایک دن چھت پر اُون والے پلنگ پر دری بچھائے، اماں پاندان سامنے رکھے پان لگا رہی تھیں۔ ہم سامنے تخت پر بیٹھے حساب (maths) کا کوئی سوال حل کرنے میں منہمک تھے کہ کھٹ سے آواز آئی اور ایک گول سی چیز عین اماں کے سامنے پاندان کے ڈھکن پر آ گری۔۔۔اماں حیران رہ گئیں۔

''دیکھنا تو بیٹا یہ کیا چیز ہے؟''

اٹھ کر دیکھا تو کیا دیکھا، ایک کاغذ میں پتھر لپٹا ہے۔ انہوں نے بے خیالی میں کاغذ کو تو ایک طرف پھینکا البتہ پتھر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔ ہم نے بھی کمال چالاکی سے کاغذ اٹھا لیا۔ اگلے محلے ہی کے لڑکے کا ہمارے نام خط تھا۔ کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور باہر پھینک دیا۔ اس بار ہم بال بال بچ گئے۔۔۔ورنہ ساری مصیبت پڑھائی اور کالج پر آتی۔ نہ جانے کیا بات ہے، قصور کسی کا بھی ہو، ساری مصیبت لڑکی کی پڑھائی پر آتی ہے۔۔۔اب ان سب باتوں میں لڑکی اور پڑھائی کا کیا قصور؟؟ کبھی کبھی لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا، پھر بھی تعلیم سے محروم کر دی جاتی تھیں۔

جیسے تیسے کالج کی پڑھائی پوری ہوئی ہی تھی کہ شادی ہو گئی! اور شادی ہوئی بھی تو انڈیا میں۔۔۔کہاں کراچی کہاں بھوپال۔۔۔ماحول، زبان، بول چال، رہن سہن۔۔۔سب جدا جدا۔ باقی تو سب ٹھیک ٹھاک رہا، ہماری ایڈجسٹ کرنے والی عادت ہمارے کام آ گئی۔۔۔سارا مسئلہ ہوا زبان کا۔ ہمیں ہندی کا (چھوٹا آ، بڑا آ) یعنی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔ اس لئے بڑی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔(یہ جو ہم ہندی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں تو یہ سب اپنے بچوں کو پڑھاتے وقت سیکھے ہیں)۔

بہرحال شادی کے بعد ہم گئے ہنی مون منانے دہلی، دہرا دون، مسوری وغیرہ۔ ہمارے میاں نے، اللہ انہیں ہمیشہ اچھا رکھے، خوب گھمایا۔۔۔کئی جگہوں اور عمارتوں کے نام بتائے۔ یہ دہلی راج دھانی ہے، یہ راشٹر پتی بھون ہے وغیرہ وغیرہ۔

واپسی میں باتوں باتوں میں ہم نے ان سے پوچھا انڈیا کا دارالحکومت کونسا ہے؟

ہم یہ معلوماتی سوال کر کے اندر ہی اندر بہت خوش تھے۔ اُنہوں نے بے یقینی سے ہماری صورت دیکھی۔ ہماری بھولی صورت پر سوالیہ نشان دیکھ کر جو قہقہے لگائے ہیں تو ٹرین میں آس پاس بیٹھے لوگ بھی مسکرا اُٹھے۔

ہم نے ناراضگی سے پوچھا ''ایسا کونسا لطیفہ سنا دیا کہ آپ کی ہنسی نہیں رُکنے پا رہی؟''

بولے ''ارے پگلی۔۔۔دہلی ہی تو دارالحکومت ہے، یعنی راج دھانی!''

ہم پھر پسینے پسینے ہو گئے حالانکہ ٹرین کی کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔

ہم کراچی سے بھوپال آ گئے لیکن کمبخت اِس شرمندگی والے پسینے نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ باقی ہم اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے۔۔۔ماں باپ، بہن بھائی، سہیلیاں، کتابیں، ڈائریاں اور بچپن کی گڑیاں بھی۔

اب بھی یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کئی کئی گھنٹے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیسے گزر گئے۔ کبھی ہنسی آ جاتی ہے تو کبھی پسینہ۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

ہم بنے باورچی

ہم ملازمین کی بھی کیا فوں فاں ہے کہ سارا سارا دن فائلیں کھنگالتے رہتے ہیں، دماغ کی چولیں ہل کر رہ جاتی ہیں، کچھ کی ایمانداری کے سبب اور کچھ ہڈ حراموں کی حرام مال کھا کھا کر مگر ایسے مَردوں اور مُردوں کی بھی کمی نہیں جو چپاتی بنا نا تو کجا، کھانا کھانے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتے کیونکہ اُنہیں لقمے پر لقمہ اور شڑاپ شڑاپ کھانے کی عادت ہوتی ہے اور کچھ چوہوں کی طرح کترتے رہتے ہیں۔ بعض ایسے بھی زن مرید ہوتے ہیں جو پکے باورچی بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی بیگم صاحبہ اپنی سہیلیوں کو بڑے فخر سے کہتی رہتی ہے کہ آپ کا بھائی بہترین کک ہے۔ اصل میں بیگم کے کہنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بہترین ککڑ ہے۔

درجہ بالا کیٹگری میں ہمیں پہلے والے میں ٹھونس دیا جائے یعنی بودا کک جو ککڑ بن نہیں سکتا تو پکائے گا سواہ۔۔۔ تمہید باندھنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ سب خواتین و حضرات کو اپنی وہ بپتا سنا سکوں جس کا کچھ دن پہلے یہ مابدولت شکار ہوئے تھے۔

ہوا کچھ یوں جناب کہ پچھلے دنوں ہمیں ایک عجیب سانحے سے دوچار ہونا پڑا، ہم اِسے سانحہ اس لیے بھی کہنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس واقعہ میں ہی ہماری درگت بنی تھی اور کچھ ایسی بنی تھی کہ بتائے نہ بنے اور چھپائے نہ چھپے۔۔۔ خیر سنا ہی دیتے ہیں آپ کو بھی تاکہ کہیں آپ لوگ بھی ایسی سچوئشن کا شکار نہ ہو جائیں اور اگر ہوں تو آپ کو پتہ ہو کہ آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

اُس دن ہماری بیگم صاحبہ تاکید، نہیں غلط کہہ گیا، حکم صادر فرما کر گئی تھیں کہ ''میں میکے جا رہی ہوں، شام کو لوٹوں گی، بچے بھی ساتھ لے جا رہی ہوں اس لیے سکول بھی فون کر دیا ہے کہ اُنہوں نے آج نہیں آنا، آپ ایسا کرنا کہ دوپہری بازار سے کر لینا۔''

ہم نے بھی چار و ناچار دل پر جبر کر کے ہاں کر دی۔ اور چارہ بھی کیا تھا۔۔۔ بیگم صاحبہ کوئی ہدایت دے رہی ہوں تو سر پنڈولیم کی طرح خود بخود اثبات میں ہلنا شروع ہو جاتا ہے اور منہ سے از خود ''جی اچھا!، جی ٹھیک ہے، جی بالکل'' کی آوازیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ بازاری کھانے کھانا ایسا ہی ہے جیسے ہم ہمارے معدے پر خودکش حملہ کرنے جا رہے ہوں۔ پیٹ شریف، نواز شریف کی طرح اکڑ کر رہ جاتا ہے اور ہمارا وہ قیمتی وقت جو ہم دوسرے اللوں تللوں میں ضائع کر سکتے ہیں، گھنٹوں کے حساب سے لیٹرین کے نذر کر جاتے ہیں۔

خیر، مگر مرتا کیا نہ کرتا، صاد کرنا پڑا لیکن حسب عادت چھٹی کے وقت بیگم کا حکم نامہ یا تاکید نامہ جو کچھ بھی تھا مکمل طور پر بھول گئے اور سیدھے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچے تو تالہ بند دروازے پر نظر پڑتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکا کہ ضرور ہم سے کچھ پروفیسرانہ بھول ہوگئی ہے۔ بھوک کے باعث نقاہت اور سستی اس قدر تھی کہ واپس بازار مڑنے کا قطعاً موڈ نہیں بنا، چنانچہ تالہ کھولا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ بھوک الگ ستا رہی تھی، اس لیے سیدھے کچن میں گھس گیا کہ باسی ہی سہی کھانے کی کوئی چیز تو ملے کہ زہر مار کر سکوں لیکن ہائے رے ہماری بیگم کی نفاست پسندی کہ تمام برتن ایسے چمک رہے تھے جیسے میں باورچی خانے میں نہیں بلکہ کسی کراکری دکان میں داخل ہوا ہوں۔

ہمتِ مرداں مددِ خدا کے مصداق، چار و ناچار، خود ہی ہاتھ پیر مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے روٹی پکانے کا سوچا کہ یہی نان کمٹمنٹ ہے جس نے حضرت آدم کو جنت سے نکالا تھا اور جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

لذتِ انفاس نے مجرم بنایا ہے اسے\
زندگی معصوم تھی بچے کی خواہش کی طرح

ایک برتن میں آٹا ڈالا اور اسمیں پانی ملا کر اُسے گوندھنا شروع کر دیا۔ آٹے نے ہمارے ناداں اور غیر تجربہ کار ہاتھوں کو پہچان لیا چنانچہ گوندھے جانے کے بجائے ہمارے ہاتھوں سے چمٹنا شروع کر دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ مکھیوں نے بھی بو پا کر بھنبھنانا شروع کر دیا۔ کبھی ناک پر بیٹھ جاتیں کہ نکسیر بھی پھوٹ پڑی تھی، تو کبھی کان میں گھس کر ہمارے صبر کو آزمانے لگتیں۔ ہماری حالت سراسر ایک غیر ملکی فلم کے مکالمے جیسی ہو گئی ''جسے ایک سالی مکھی ہیجڑا بنا دیتی ہے۔'' کبھی کبھی ہم اُن کی گستاخیوں پر اُن کی پکڑ بھی کر لیتے تھے لیکن ایسے ہی نشانہ باز ہوتے تو بھلا پروفیسری کر رہے ہوتے، فوج میں کمیشن لے کر افسر نہ بن چکے ہوتے۔

اب حالت یہ تھی کہ ایک ہاتھ سے آٹا گوندھ رہے تھے تو دوسرے سے مکھیاں بھگا رہے تھے۔ بمشکل آٹا گوندھنے میں کامیاب ہو پائے لیکن اب اور مشکل مرحلہ درپیش تھا اور وہ تھا سالن بنانے کا۔ از سرِ نو کیل کانٹے نکالے اور فریج سے ٹماٹر پیاز لہسن ادرک لا کر مختلف برتنوں میں کاٹنا شروع کر دیا۔ اس کام میں بھی خاصے چرکے لگے، کبھی ہاتھوں کو زخمی کر بیٹھتے تو کبھی مرچوں لگے ہاتھ سے آنکھ سے چھیڑ خانی کر بیٹھتے، نتیجتاً دریائے سوات آنکھوں کے ساتھ ساتھ ناک سے بھی بہتا رہا۔ ٹماٹر کاٹتے ہوئے ایک انگلی زخمی کی، پیاز کاٹنے شروع کیے تو ایسا لگ تھا کہ محبوب کے ہجر میں میں چپکے چپکے ٹسوے بہائے جا رہے ہیں، آپ جسے ''آنسو'' کے نام سے بھی جانتے ہیں۔

خیر یہ مرحلہ بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا مگر اب ہم یہ سوچ رہے تھے کہ گوشت ٹھیک رہے گا یا چکن اور ہاں سبزیاں بھی تو ہیں مگر دل شدتِ مسلمانی کے باعث چکن کی طرف مائل رہا۔ اس کے لیے فریج کو دوبارہ حاضری لگوائی اور چند پیس اٹھا لیے جو شائد بیگم نے شام کے کھانے کے لیے کاٹ کے رکھ چھوڑے تھے۔ اب یہ بندہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ پہلے کونسی چیز دیگچی میں ڈالنی ہے۔ دیگچی تو کچھ بتانے سے قاصر تھی ہاں البتہ گزشتہ بھوک کے دوران کھانے کی تاڑ میں، بیگم کا اتنا تو مشاہدہ کیا ہوا تھا کہ پہلے چکن پیس تلتی ہے،

کرنل مجید نے ایک دفعہ پطرس بخاری سے کہا ''اگر آپ اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام صحیح بخاری رکھیں۔''
پطرس نے جواب دیا ''اور اگر آپ اپنی نظموں کا مجموعہ چھپوائیں تو اس کا نام کلام مجید رکھیں۔''

لہٰذا گھی گرم کیا، اُس میں چکن پیس ڈالے اور چمچہ گیری کرنے لگے یعنی چمچے کو ہنڈیا میں ڈال کر ہلانا شروع کر دی مگر یہ کیا۔۔۔ ہم دفتر کے صاف ستھرے کپڑوں پر بغیر ایپرن لگائے کھانا بنا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ مصورانہ حلیے میں دکھائی دیا جانا کوئی اچھنبے کی بات نہ تھی۔۔۔ مطلب یہ کہ اس باب میں بھی بیگم کا جھگڑا الگ درپیش تھا۔

تو بھائیو! ہم نے اپنی بھوک کو زیادہ آزمانا مناسب نہ سمجھا اور کھانا شتابی بنانے کے چکر میں ہنڈیا میں پیاز، ادرک، ٹماٹر ایک ساتھ ڈال دیے، ساتھ سالن مصالحے کا حساب بھی بیباق کر دیا۔ جبکہ دوسری انگیٹھی پر توا رکھ دیا تا کہ توا گرم ہو تو چپاتیاں بنانے میں دیر نہ لگے۔

سب سے مشکل مرحلہ پیڑے بنانے کا تھا۔ اس فن میں تو ہم بلا کسی مبالغے کے انتہائی نکمے تھے لیکن مرتا کیا نہ کرتا، پیڑے بنانے شروع کر دیے۔ پتہ نہیں کیسے بنے لیکن جو جہاں ہے جیسا ہے کے مصداق سب کو توے پر ڈالتے چلے گئے۔ بغور نظر ڈالتے تو ہر چپاتی پر کسی نہ کسی ملک کا نقشہ ابھرا دکھائی دیتا۔ کبھی ہندوستان کی طرح وسیع تو کبھی پاکستان جیسی لمبی روٹی بن جاتی۔ کئی بار تو توے نے اپنے غضب کا اظہار بھی کیا اور ہاتھ ایسے جلائے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ ہم پر جتنا بس چلا سو چلا، اُس ستم ظریف نے چپاتیوں کو بھی بنگلہ دیش کا باشندہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پہلے پانسے ہی پانچ دانے، یعنی پہلی چپاتی ہی جلا ڈالی۔

اسی دوران ہم دوسرے محاذ پر بھی سرگرم رہے۔ مکھیوں سے چوکھی لڑتے لڑتے کئی بار خود اپنے ہی منہ پر طمانچے بھی رسید کر ڈالے لیکن وہ جو کہتے ہیں ناں کہ بھوک نچائے ننگی ناچ لہٰذا طوعاً و کرہاً ایک کام کرنا تھا سو کرنا ہی پڑا۔

آخر کار ہم دو تین کچی پکی چپاتیاں بنانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اُدھر سالن تھا کہ مسلسل اپنا اُبال دکھاتا پھر رہا تھا چنانچہ چولہے کو بند کیا اور بڑی بے صبری سے کھانے پر جھپٹے مگر اففففففف یہ کیا۔۔۔ نہ سالن میں نمک اور نہ روٹی میں۔۔۔ جیسے کسی ہائی بلڈ پریشر کے مریض کا کھاپا ہو۔ بیڑا غرق ہو اس نسیان کا کہ جس نے یہ دن دکھایا۔ اب تھوڑا نمک ایویں ہی سالن میں ڈال دیا، جس سے کچھ ذائقہ بن گیا مگر چکن پیس خاصے سخت تھے۔ بھلا ہمیں کیا پتہ کہ انہیں کتنی دیر تک چولہے پر کھپانا تھا۔ بس بھائیو جیسے تیسے زہر مار کر لیا اور بستر پر الٹا لیٹ گئے۔ شدید تھکن اور کھانے کا خمار ایسا چڑھا کہ پھر خبر تب ہوئی جب کسی نے پاؤں ہلا کر جگایا۔ جوں ہی ہم نے کروٹ لی، کئی چیخوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ ہم نیم غنودگی کے عالم میں تھے چنانچہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ بیگم ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی جبکہ بڑی بیٹی الگ سے دانت نکال رہی تھی۔

یکلخت اُس کی ہنسی کو بریک لگ گئے کیونکہ ہمارا چہرہ غصے سے بھوت بنا ہوا تھا۔

''ارے ارے ہم پر کیوں غصہ ہو رہے ہو جناب۔۔۔'' بیگم بھی غصہ آ گیا۔

ہمارا ننکا الگ چیخ رہا تھا اور روتے ہوئے کہہ رہا تھا ''بوؤ آ گیا ہے امی بوؤ سے بچاؤ۔''

غضب تو چڑھا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ سراسیمگی بھی ہوئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

اور کچھ نہ سوجھا تو راشن لے کر بیگم پر برس پڑے ''یہ کیا دانت نکال رہی ہو کم ذات عورت مجھے بے وقت جگانے کی آخر کیا تُک ہے۔''

ڈرنے کے بجائے اس کی ہنسی مزید تیز ہوتی گئی۔ پھر وہ بولی ''ارے بدھو پہلے آئینہ دیکھ، پھر غصہ شریف فرما لینا۔''

عجیب مخمصے میں تھے۔ نیند ہرن ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ ملامت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ایک لمبی انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھے۔ ہمارا

ہم نے کہا ”نکے، یہ میں ہوں ۔۔۔ تیرا ابو یار! کیا ہو گیا۔۔۔ کیا میرے سینگ اُگ آئے جو یوں بدک رہے ہو۔“
پاپا، ذرا شیشہ دیکھ کے آئیں پھر پتہ چلے گا!“ بڑی بیٹی ہنستی ہوئی بولی۔
بستر سے تقریباً چھلانگ لگاتے ہوئے اُٹھے اور سیدھا آئینے کی طرف لپکے کہ دیکھیں تو سہی آخر ماجرا کیا ہے۔
آئینے کے سامنے جو شخص نظر آیا وہ کم از کم ہم تو نہیں تھے۔
ہماری اپنی ہنسی چھوٹ کر رہ گئی۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر دوسروں کی ہنسی مزید تیز ہوگئی گویا چھت پھاڑ ہنسی کا منظر پیش کیا جانے لگا۔
ہم نے نکے کو اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے کہا
”یار ہم کیا جانیں تیری امی کے کام۔۔۔ دیکھ توے سے سارے گال کالے ہو کر رہ گئے ہیں، اس پر سفید آٹے کے داغ الگ ہاہاہاہا۔۔۔ یہ سارے کام جانیں اور گھر کی باورچن!“
اور ہم نے خفت مٹانے کے لئے غسلخانے کا رُخ کیا۔

بغداد نژاد رازی

لنڈے کے انگریز
(ایک ریفریشر کورس)

تمام کچے پکے اصلی نقلی، کالے، پیلے، سیکولرز، لبرلز اور ملحد حضرات سے گزارش ہے میری پوسٹ پڑھنے سے پہلے منہ میں ''ہاجمولہ'' رکھ لیں ورنہ اپنی ذمہ داری پر پڑھیں کیوں کہ میری اطلاعات کے مطابق ہر جگہ مرچیں موسم کے حساب سے لگتیں ہیں لیکن لبرلز کے ہاں جب سچ بولو تب ہی لگ جاتی ہیں۔ آخر ''فریڈم آف سپیچ'' کا زمانہ ہے بھئی۔

جانے کب کون کس کو بلاک دے ایکسٹریمسٹ کہہ کر
فیس بک کی فیس بک لبرل ہوئی پھرتی ہے

یوں تو دنیا میں ''سانپوں'' اور ''لبرلز'' کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں مگر تمام ''سانپ'' زہریلے نہیں ہوتے۔ یہاں ہمارا موضوع ''سانپ'' نہیں بلکہ ''لبرلز'' ہیں۔

''مسلم دنیا'' کے تناظر میں ''لبرلز'' کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک باہر کا بنا ہوا ''اصلی'' یا ''اوریجنل'' دوسرا یہاں کا بنا ہوا ''نقلی'' یا ''دو نمبر''۔

''نقلی لبرلز'' دیسی ساختہ ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر اُنہیں ''دیسی لبرلز'' بھی کہا جاتا ہے لیکن چونکہ اس میں لفظ ''دیسی'' استعمال ہوتا ہے اور ''دیسی لبرلز'' کو ہر اس نام، چیز اور جگہ سے نفرت ہوتی ہے جس میں لفظ ''دیسی'' استعمال ہو اس لیئے یہ خود کو ''دیسی لبرلز'' کہلوانا پسند نہیں کرتے جبکہ ایک تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ''دیسی لبرلز'' خود کو ''امریکی سنڈی''، ''فارمی لبرلز'' اور ''بے غیرت بریگیڈ'' کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ مگر ''دیسی لبرلز'' کے لیئے آج تک کا سب سے مناسب نام جو دریافت ہوا ہے وہ ''لنڈے کے انگریز'' ہے۔ تو آج ہم جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ ''لنڈے کے انگریز'' کون کیوں کب اور کیسے ہوتے ہیں۔

چونکہ بات ہونے کی چل رہی ہے اس لیئے ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں۔

لبرل ہوا جو پیدا تو شیطان نے کہا
لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

ماہرین کے نزدیک ''لنڈے کا انگریز'' ہونا ایک ''مینٹل ڈس آڈر'' ہے۔ وہ لڑکا جسے بچپن سے ہی اس کے ماما پاپا یہ کہتے ہوں ''بے بی! ڈونٹ گو آوٹ سائیڈ، پلیز کم اِن سائیڈ، پلے ود یور سسٹر'' اور وہ بچہ جو کلاس میں سب سے مار کھاتا ہو، جس کا پسندیدہ رنگ گلابی پسندیدہ کھیل گڈے گڑیا کی شادی، پہل دوج، آپا بوا ہو، جس کا سرمایہ حیات اس کی باربی ڈولز کی کلیکشن ہو، تو سمجھ جایئے وہ لڑکا بڑا ہو کر ''لنڈے کا انگریز'' بنے گا۔

یوں تو ''لنڈے کے انگریز'' گاہے بہ گاہے اپنی عالمانہ ٹائپ جاہلانہ گفتگو سے عوام کو محظوظ کرتے ہی رہتے ہیں مگر پھر بھی

ان کے شب روز اسی انتظار میں گزرتے ہیں کہ اسلام یا پاکستان سے متعلق کوئی بری خبر ملے، کوئی پاکستانی چوری کرتا پکڑا جائے، کوئی دھماکہ ہو، کسی ملک کا جہاز گم ہو جائے۔۔۔بس پھر یہ ہوتے ہیں اور چوبیس گھنٹے نہ رکنے والی دانش ورانہ گفتگو۔ دلیل وہی دی جاتی ہے جو سعادت حسن منٹو نے دی تھی کہ اگر معاشرے میں گندگی غلاظت ہے تو میں تو دکھاؤں گا۔ اِن ''لنڈے کے انگریزوں'' کی مثال اُس مکھی کی طرح ہے جو اگر پھولوں کے اوپر بھی اڑ رہی ہو تو غلاظت ڈھونڈ نکالتی ہے اور بیٹھتی غلاظت پر ہی ہے۔ خیر پسند اپنی اپنی نصیب اپنا اپنا۔

''ویسٹرن لبرل'' گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور یہ ''لنڈے کے انگریز'' گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے ہوئے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ اسلام کے خلاف کینہ بغض اور زہر ان میں ایسے بھرا ہوا ہوتا ہے جیسے ''کوکومو'' میں چاکلیٹ۔

اُمید ہے آپ کو ''لنڈے کے انگریزوں'' کے بارے میں خوب پہچان ہو گئی ہو گی۔

حسیب احمد حسیب

آوے ای آوے

آوے ای آوے۔۔۔
جب سے شعور سنبھالا یہ نعرہ سننے کو ملا، آوے ای آوے۔۔۔ پہلے پہل اس کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ کس کو بلایا جا رہا ہے اور کیوں بلایا جا رہا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب شعور آیا تو یہ مخمصہ پیدا ہو گیا کہ کون آ رہا ہے اور کیوں آ رہا مگر جناب جانے دیجئے بس نعرہ لگائیے ''آوے ای آوے۔''

یہ نعرہ دراصل اس قوم کی نفسیات کا مظہر ہے ایک ایسی قوم کی نفسیات کہ جسے خوش نما چیزیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں اور وہ چیزیں انہیں زیادہ خوشنما معلوم ہوتی ہیں کہ جو مستور ہیں اور نا سمجھ میں آنے والی ہوں بلکہ اکثر تو نعروں کا صوتی آہنگ انکی مقبولیت کی سند بن جاتا ہے اجی کون کہتا ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانا بے کار ہووے ہے آج کل تو بھینس بھی اچھی بیٹس پر رقصاں ہوتی ہے بلکہ ''می رقصم می رقصم'' کا نعرہ مستانہ بلند کرتی ہے۔

بات ہو رہی تھی ''آوے ای آوے'' کی۔۔۔ کون، کیوں، کب، کیسے، کسطرح، کس لئے؟؟؟

اجی کالا ہو کہ گورا لمبا ہو کہ چھوٹا پتلا ہو کہ موٹا جناب من بات یہ ہے کہ "ساڈا لیڈر'' آوے ای آوے۔''

لیڈر کی پہچان کیا ہووے ہے وہ کہ جس کے پیچھے عوام آنکھیں بند کر کے چل پڑیں۔۔۔اور عوام کی پہچان کیا ہووے ہے کہ جو کسی لیڈر کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چل پڑیں۔

اعلیٰ ترین اوصاف جو کسی لیڈر میں ہوں؟ کیا ہیں؟؟

''اول جس کی بات کسی کو سمجھ نہ آوے؟''
''ثانی جس کو کسی کی بات سمجھ نہ آوے؟؟''
یاد رہے کوئی بھی چڑ گنجو لیڈر ہو سکتا ہے۔
''اگر''
ساڈا گرائیں ہووے۔
ساڈی برادری دا ہووے۔
بولے تو ہماری زبان بولے کیونکہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔
''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔''
''چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من''
اور سوچے تو ہماری سوچ سوچے۔۔۔
بس پھر کیا دیر ہے ''آوے ای آوے۔''
الیکشن کے سہانے دنوں میں گلی گلی قریہ قریہ وادی وادی کوچہ کوچہ ایک ہی نعرہ وطن عزیز کی فضاؤں میں بلند ہوتا ہے۔
ساڈا لیڈر آوے ای آوے۔
یہ شیر ہے۔
یہ گیڈر ہے۔
یہ سانپ ہے۔
یہ سیڑھی ہے۔
اور یہ بے چارہ بابو بیڑی ہے۔
مگر اپنا ہے اور جان لیجئے اپنا تو بس ایک ہی سپنا ہے۔
ساڈا لیڈر ''آوے ای آوے۔''

راشد حمزہ

لاہور اور ہم کمینے

اِس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ لاہور بہت ہی پیارا دل نواز اور زندہ دلوں کا زندہ دل شہر ہے۔
پہلے جب میں وہاں پڑھتا تھا تو گھر سے دوری ذرا سی بھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ دل اِتنا لگ گیا تھا کہ جب کبھی چھٹیوں میں چار و ناچار امی کو منہ دکھائی کے لئے آبائی گھر جانا پڑتا تو لاہور سے دوری بری طرح چبھتی تھی۔ اس وقت مجھے تنہائی کا جو شعور ملا تھا، اُسے میں لاہور سے دوری کا نام دیتا تھا۔ لاہور شہر میں گھر سے دوری اس وجہ سے نہیں ڈستی تھی کہ بہت سارے ہم مکتب ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست ہوتے تھے، جس میں ہر ایک ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ اور اصل نسل کا کمینہ ہوتا تھا۔ یقین کیجئے زندگی کے وہی پل یادگار بن جاتے ہیں جو کمینوں اور کمینیوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے عیش اڑاتے، زندگی کے مختلف رنگوں اور لذتوں سے محظوظ ہوتے گزر جاتے ہیں اور جب زندگی میں وہی کمینے اور کمینیاں دانشور بن جاتے ہیں تو زندگی کی اننگز کھیلنے سے ساری رعنائی نکل جاتی ہے، بس وقت گزاری بچ جاتی ہے۔
سرِ شام مال روڈ پر مٹرگشت کرنا ہمارا معمول ہوتا تھا۔ میرے دوست کمینے نے ایک بات نوٹ کر رکھی تھی، جس کا وہ اکثر ذکر فرماتے تھے اور وہ یہ کہ لاہور کی دوشیزائیں چہرے اور ہاتھوں پر تو بھرپور توجہ دیتی ہیں لیکن اُن کی اپنی ایڑیاں توجہ سے محروم رہتی ہیں۔ یوں ہماری توجہ کا مرکز ایڑیاں بن جاتی ہیں، یہی وجہ ہے اکثریت کی ایڑیاں گرمیوں میں بھی پھٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں ایڑیاں پھٹنے کی حد تک تو وہ مبالغہ آرائی سے کام لیتا تھا، جو دوشیزاؤں پر اُن کی خشکی کا اظہار یہ ہوتا تھا البتہ گندی ایڑیوں کی حد تک مجھے ان سے متفق ہونا پڑتا تھا۔ شاید لاہوری دوشیزائیں یہ یقین کر بیٹھی ہیں کہ جب چہرہ خوبصورت سجا ہوا سنوارا ہوا ہو تو ایڑیوں کی طرف کسی کی نگاہیں نہیں جاتیں کہ وہ پھٹی ہوئی ہیں یا گندی ہیں۔ یہ اُن کی خوش فہمی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ کچھ کمینے ہر قابلِ دید مقامات کا دیدار کرنا اپنی اوّلین سعادت سمجھتے ہیں۔
ایڑیوں سے یاد آیا سیالکوٹی خواتین اپنی ایڑیوں پر چہرے سے زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ خاص توجہ کی وجہ یہ عقیدہ ہے کہ پھٹی اور گندی ایڑیاں پھوہڑ پن کی علامت ہوتی ہے۔
مال روڈ پر چہل قدمی کرتے کرتے جب ہم ریلوے سٹیشن پہنچ جایا کرتے تھے تو وہاں ایک قسم کی مخلوق بکثرت مصروف دکھائی دیتی تھی اور وہ ہوتی تھی مختلف ہوٹلز کے سہولت کار جو راہ چلتے مسافروں کو پکڑتے نجانے کن کن چیزوں کی لالچ دے کر اپنے ہوٹل میں ٹھہرانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ سہولت کار بڑی

تیز نظر رکھتے تھے۔ ہم جیسے کمینوں کے پاس سے بھی نہیں گزر کرتے اور جو بھولا بھالا دیکھتے تو الجھ جاتے۔ اکثر مسافر تو محض ان سے گلوخلاصی کی خاطر ان کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر آمادگی ظاہر کرتے۔ ہوٹلز سہولت کاروں اور مسافروں کی یہ کیمسٹری دیکھ کر مجھے اپنی کالج بس یاد آ جاتی تھی، جس میں سارے طالب علم ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح آپس میں الجھے ہوئے ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ میں کسی کا گریبان ہوتا تو کسی کی گود میں کسی کا سر۔

لاہور کے دو موسموں پر تو بے تحاشا پیار آتا تھا۔ ایک وہ موسم جب سردیوں میں ہر طرف دھند چھائی ہوئی ہوتی تھی، حدنگاہ پانچ میٹر سے بھی کم ہو جاتی تھی۔ یہ میں نہیں جانتا کہ دھند مجھے کیوں پسند ہوتی ہے۔ اور دوسرا موسم گرمیوں کا، عام طور لوگ موسموں کی شدت پسندی کو پسند نہیں فرماتے لیکن میں نے اِن جیسی طبعیت نہیں پائی ہے، مجھے سخت سردیوں میں کالام میں رہنا بھاتا تھا، جہاں چلتے پھرتے انسان برف کے مجسمے بن جاتے ہیں اور گرمیوں میں لاہور شہر رہنا من کو بھاتا ہے۔

جون جولائی میں لاہور میں اِتنی شدید گرمی پڑتی ہے کہ نظروں کے سامنے لوگ گرمی کی شدت کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو کر پگھل کر بہہ جاتے ہیں۔ سخت گرمی کے باوجود لاہور کی ہوا صبح دو سے چار بجے کی بیچ نہایت پیاری میٹھی اور ٹھنڈی ہو جاتی ہے جو سیدھی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ جب عابدین خدا کے حضور نمازِ تہجد پڑھنے جاگ کر قیام کرتے تو ہم کمینے ٹولی کی صورت سنسان سڑکوں پر مٹرگشت کرنے نکل جاتے۔

مٹرگشت کے دوران جہاں دل کیا کسی ڈھابے کے پاس چلے جاتے، جن کی کرسیاں سڑک پر رکھی ہوئی ہوتیں، وہاں بیٹھ جاتے، سگریٹوں پر سگریٹ پیتے اور چائے پراٹھے کے ساتھ نوش کر جاتے۔ پاکستان کے کسی بھی کونے میں جائیں آپ کو لاہور جیسی چائے اور پراٹھا کہیں نہیں ملے گا۔ یہ تو تھا جب ہم لاہور رہائش رکھتے تھے، تب ذرا سا بھی تنہائی نہیں ڈستی تھی۔ اب کبھی لاہور تفریحاً جانا پڑے تو تنہائی اتنی ڈستی ہے کہ ''ذرا سا شادی'' کے لئے من مچل جاتا ہے، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ سارے کمینے دوست بکھر گئے ہیں۔ دوسری وجہ لاہور کی تنگ گلیاں اور چلتے پھرتے حسین دوشیزاوں کی کثرت۔

جب میں لاہور رہتا تھا تو میرے ساتھ چار عدد خالص کمینے، پڑوس میں ایک عدد نہایت کمینی اور ایک عدد نہایت خوش شکل لڑکی رہتی تھی۔ ایک کمینے کے بچوں کے متعلق خیالات اچھے نہیں تھے، وہ اس وجہ سے شادی کرنے سے کتراتے تھے کہ شادی کے بعد اگلی شدید خواہش بیوی سے بچے جننا ہوتی ہے۔ دوسرا کمینہ عجیب قسم کے نظریات کا مالک تھا۔ اُسے بچے تو انتہائی پسند تھے لیکن اس کا عقیدہ تھا کہ محض بچوں کی خاطر شادی کر کے بیوی گھر لانا دوسری بڑی حماقت ہے۔ ایک دن تیسرے کمینے نے چھ عدد انڈے لائے، ہم سب خوش ہوئے کہ چلو اس کی جیب سے کچھ تو نکلا۔ ہم سب نے انڈے ابالنے کا پروگرام بنانے کا سوچا تو تیسرا کمینہ کہنے

لگے یہ ابالنے کے لئے نہیں اس پر فلاں نے بیٹھنا ہے اور اس سے بچے پیدا کرنے ہیں۔ پوچھا گیا ''کس نے؟'' تو کہا گیا جسے بچے تو پسند ہیں لیکن شادی کے حق میں نہیں۔

چوتھا کمینہ نہایت اچھا، مددگار، خوش طبع اور شریف انسان تھا، وہ سارا وقت مکان کی چھت پر صرف کرتا، سامنے کی چھت پر ایک نوعمر لڑکی پر ہزار دل و جان سے فدا ہونے کی محنت کرتا تھا۔ سامنے والی لڑکی کبوتروں کو پالتے پوستی تھی، وہ لڑکی اتنے پیار سے کبوتروں کو دانہ ڈالتی تھی کہ اس شریف کمینے کے دل میں کبوتر بننے کی خواہش اُڈاتی، اکثر یہ گانا گاتا رہتا ۔

کاش میں ایک کبوتر ہوتا
تیرے ہاتھوں سے ہی دانہ چگتا

آج جب میں وہاں نہیں ہوں تو سوچتا ہوں کہ اب وہاں کتنے کمینے رہ گئے ہوں گے، اور اُن کے خیالات اب بھی ویسے کے ویسے ہوں گے یا بدلے ہوئے ہوں گے۔ اس خوش شکل پڑوسن کی بھی فکر رہتی ہے کہ وہ کس حال میں ہوگی، اُس کی شادی کے متعلق سوچتا ہوں کہ شادی کی بھی ہوگئی ہوگی کہ اسی طرح کبوتر پال رہی ہوگی۔

آہ۔۔۔شادی کس قدر مقدس رشتہ ہے اور یہ محبت محبت کھیلنا کس قدر بے معنی کھیل ہے۔ یہ جو تارے ایک دوسرے کے قریب ٹمٹمارہے ہیں بلکہ بعض تو ایک دوسرے کی طرف لپک لپک کر چپک رہے ہیں، لپٹ رہے ہیں، چمٹ رہے ہیں اس کے کیا معنی ہیں اور آج یہ چاند کیوں نہیں نکل رہا ہے۔

ہمارے یہاں چاند نکلے بھی تو بہت ہے، اسلام آباد میں تو رات کو سچ مچ کی دمکتی چاندنی نکل آتی تھی۔ اپنے ٹیرس میں، میں نے اُن سے چند باتیں کی تھی، اس کی آواز موسیقی سے بھرپور تھی، آنکھیں نسواری تھیں۔ بس مجھے اُن کی ناک سے معمولی سی شکایت تھی۔۔۔ضرورت سے زیادہ لمبی تھی، باقی وہ قبول صورت تھی۔

بعض اوقات مجھے یہ خیال آتا تھا کہ اُس کے باقی چہرے کو ناک سے آویزاں کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت خاتون کے لئے یہ کس قدر بے تکا اور غیر مناسب خیال ہے۔ مجھے ایسے خیالات نہیں آنے چاہئے، جب جب اُس کا خیال آتا ہے تو معمولی سی پریشانی ہوتی ہے کہ اب وہ میرے متعلق پریشان ہوگی، بچوں بارے اُس کے خیالات مناسب نہیں تھے۔ میں نے ایک فلسفی کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ فلسفی کی حالت زندگی بارے کچھ خاص نہیں معلوم ہاں البتہ اتنا معلوم ہے کہ وہ لائل پور میں رہتا تھا۔ اُس نے لکھا تھا کہ ہر وہ شخص بہترین تخلیق کار بن جاتا ہے جس کو روز اس جہاں میں پھیلے حسن کے خزانوں میں سے کچھ نیا ملتا ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک خاتون میں دنیا جہاں کی ساری خوبصورتی مت ڈھونڈیئے، سارے جہاں کی خواتین خوبصورت ہوتی ہیں، ہر ایک محبت کے قابل ہوتی ہے، ہر ایک پر مر مٹنا سعادت ہوتی ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ روز روز کی محبت سے طبعیت کو مسرت، روح کو طراوت اور قلب کو تازگی ملتی ہے۔ آج اس آسمان کو دیکھ کر اس فلسفے کو ہلاک کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ کتنے بے ہودہ خیالات ہیں اُس کے۔

استفارات و جوابات

سوال مجھے جس لڑکی سے محبت ہے وہ حسین ہونے کے علاوہ انٹیلیکچول بھی ہے۔ میں "ڈاکٹر" ہوں اس لیے علم و ادب میں دلچسپی رکھنے کی قطعاً فرصت نہیں۔ ابھی تک پیغام نہیں بھجوایا کیوں کہ میرے خیال میں وہ ولی دکنی، ہربٹ سپینسر، ابونواس اور بھرتری ہری کے جانب مائل ہے، جب کبھی اس سے ملتا ہوں، یہی نام سننے میں آتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ آپ کے مشورے کا منتظر ہوں۔

جواب ہمارے خیال آپ کو فوراً پیغام بھیجنا چاہئے، اتنے حضرات کے موجودگی میں ذرا سی دیر بھی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

دریچے از ڈاکٹر شفیق الرحمن

ذہین احمق آبادی
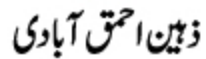
وزارتِ حماقت کا نوٹس

یہ سب تحریر پھانک کر نگلنے اور جگالی کرنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ بیڑا، ویڑا اور وہڑا پنجابی میں گائے، بیل کو کہتے ہیں۔۔۔ یہ نہ ہو کہ یہ تحریر زہر مار کرتے ہوئے میں آپکو کہوں کہ میں بیڑا لایا اور آپ سمجھیں کہ میں نے جنگی بیڑہ خرید رکھا ہے۔۔۔ الامان والحفیظ، نہیں میں پنجاب میں رہتا ہوں نہ ہی پنجابی ہوں۔۔۔ احمق آباد میں رہتا ہوں میں تو...!!!

عرض یہ کرنی تھی کہ گائے بیل کیلئے جو پیمانۂ عمر مقرر ہے۔۔۔ دانتوں والا۔۔۔ یعنی دوندا، چوگا، چھگا، اٹھا۔۔۔ دو، چار، چھ اور آٹھ دانتوں والا۔۔۔ اس میں کچھ تبدّل نہیں ہونا چاہیے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا وہ تین پانچ سات سال کے نہیں ہوتے ہوں گے؟ تو پھر یہ جفت کی قید کیوں؟ یا شاید ایسا اس وجہ سے کرتے ہیں کہ دانتوں کا جوڑا ایک ساتھ ہی نکلتا ہے۔۔۔ تین سال کی عمر میں تیسرا نہیں بلکہ چار سال کی عمر میں تیسرا اور چوتھا دونوں یکے بعد دیگرے اپنا سر ابھارتے ہیں اور حالات سازگار دیکھ کر راہ گزرِ بتیسی پر آبراجمان ہوتے ہیں۔ ویسے کیا بیل کا سلسلۂ دانت بھی ''بتیسی'' ہی کہلائے گا؟ کیا اس کے بھی بتیس دانت ہی ہوتے ہیں؟ میں تو ابھی تک اٹھائیسیا (۲۸ یا) ہی ہوں مگر پھر بھی اپنے دانتوں کیلئے لفظ ''بتیسی'' ہی کو زیرِ استعمال لاتا ہوں۔ ویسے چار ''عقل ڈاڑھیں'' نکلنے کے بعد لوگوں نے مجھے احمق ماننے سے انکار کر دیتا تھا، اس وجہ سے میں نے انھیں نکلنے ہی نہ دیا۔ سرکوبی کرکے رکھ دی۔۔۔ اب میں ''حمق ڈاڑھیں'' نکلنے کا منتظر ہوں تاکہ میری حماقت مستند ہو سکے۔ ویسے ڈاڑھی تو موجود ہی ہے بحمد للہ مگر ڈاڑھیں خانۂ عقل کو تا حال خالی دیکھ کر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکیں۔۔۔ عقل اور حمق رٹنے سے میں موضوع سے اکثر بھٹک جاتا ہوں۔۔۔ تو خیر۔۔۔ اِس تمام مشکل سے نکلنے کیلئے وزارتِ حماقت نے ایک ''دانت نامہ'' شائع کیا ہے۔۔۔ عید الاضحٰی کے موقع پر۔۔۔ تاکہ عمر کے تعیُّن میں آسانی ہو۔۔۔ بلحاظِ آں تحریر کچھ نئی اصطلاحات وضع کی گئی ہیں۔۔۔ سب سے پہلے تو ''کھیرا'' ہوتا ہے، جو کہ بچہ ہوتا ہے مگر یہ اچھا لگنے کے باوجود نامعقول سا محسوس ہوتا ہے کچھ۔۔۔ مطلب کہ ایک بیڑا آ رہا ہے اور کوئی آپ کو کہے کہ ''دیکھو کھیرا آ رہا ہے!'' تو کیا آپ کا اس کو چماٹ لگانے کا جی نہیں چاہے گا؟ ہاں نہیں تو۔۔۔ اِس طرح تو میں ٹماٹر، کدّو، توری بینگن، کریلے وغیرہ بھی استعمال کر سکتا ہوں۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔ اِس کی نامعقولیت خود آپ کو محسوس

ہونی چاہیے۔کوئی کہہ رہا ''ماشاء اللہ۔۔۔ دیکھو کیا کریلا آ رہا ہے۔۔۔!'' یہ سُن کر سر پیٹنے کو جی نہیں چاہے گا کیا؟ گو کہ دانتوں کے لحاظ سے عمر کا تعیّن انتہائی منطقی تھا مگر پھر بھی نئی اِصطلاحات وضع کرنا ناگزیر تھا تو اِس کڑے وقت میں وزارتِ حماقت نے کام کِیا اور نئی اصطلاحات وضع کیں۔ پرانی والی یعنی دوندا، چوگا وغیرہ بحال رہیں اور طاق اعداد کیلئے نئے اشارے موضوعے گئے اور ان کو بنانے میں قریب ترین جفت اعدادِ عمر سے قوافی ملائے گئے۔۔۔ جیسے دو سال یا دو دانت کا دوندا کہلاتا ہے تو ایک سال کا ''یوندا'' کہلائے گا جبکہ ''کھیرے'' کو حذف کر دِیا گیا۔ اصطلاحات مندرجہ ذیل ہیں:

اوندھا

اس لفظ کے اوضاع پر کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، بس قافیہ ''دوندا'' سے ملایا گیا ہے۔ آدھے سال کے جانور کیلئے مستعمل ہے۔ اِس کا اُلٹا پڑے ہونے سے کوئی تعلّق نہیں، نہ ہی اس پر اندھا ہونے کا اطلاق مناسب ہے۔

یوندا

اس لفظ کی آواز اور ساخت ''دوندا'' سے کشید ہے جبکہ اس کا پہلا حصہ ''یو'' ''ایک'' کو کہتے ہیں جو کہ پشتو سے مغوی ہے۔ ایک سال کے جانور کے لئے مستعمل ہے۔

توندا

یہ بھی ''دوندا'' سے وضع کِیا گیا لفظ ہے جو کہ تین سال کے جانور کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اِس کا استعمال کافی وسیع ہے اور اس سے صحتمندی پھوٹی پڑ رہی ہے مگر اس کو سن کر ''توند'' تک ذہن دوڑانا مناسب نہیں۔۔۔ گو کہ اس کو توندوالے جانوروں کے لئے بھی استعمال کِیا جا سکتا ہے اور گابھن جانوروں (حاملہ) کے لئے بھی مگر بات یہ ہے کہ ایسا کروگے تو کون آئے گا؟

پنگا

یہ لفظ کافی مانوس سا ہے مگر اِس ضمن میں اس کے معانی و مطالب بالکل مختلف ہیں۔ یہ پانچ سال کے جانور کے لئے ہے۔

اِس کے شروع کے ''پن'' پر اختلاف واقع ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ پشتو کے ''پنزہ'' (پانچ) سے موضوع ہے تو کوئی پنجابی کے ''پنج'' سے اس کو کترنے کا مدّعی ہے جبکہ کچھ فارسی کے ''پنجم'' سے بریدہ ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، غرض یہ کہ جتنے مُنھ اتنی باتیں ہیں مگر ہم آپ کو اِس میں الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں، بس یہ ہے سو ہے۔ اِس کا دوسرا حصہ ''گا'' ''بس ''چوگا'' سے ہم آواز کرنے کے لئے لگایا گیا ہے۔ اِس لفظ ''پنگا'' کا چھیڑ چھاڑ وغیرہ سے دور کا علاقہ بھی نہیں (یا شاید ہو) کیونکہ پانچ سال کی عمر تک جانور ادھیڑ عمر میں داخل ہو جاتا ہے۔۔۔ پس اس کی لاتوں سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ ادھیڑ عمری جانور اُدھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

سَگّا

یہ سات سال کے جانور کے لئے استعمال کِیا جانا چاہیے۔ کوئی نہ کرے تو وزارتِ حماقت کی بلا سے۔۔۔ اِس کا پس منظر کچھ دھینگا مشتی سے بھرا ہے۔ یہ اُردو کے عددی لفظ ''سات'' کا مرہونِ مِنت ہے۔ اس کا اُردو کے لفظ ''سگ'' (کُتّا) سے کوئی تعلّق نہیں، گو کہ یہ سات سال کا جانور دوسروں کے ساتھ کُتّوں والی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے مگر ساتھ ہی یہ کُتّوں والی عادات کا مالِک ہوتا ہے، بقولِ پطرس بخاری ''کتے جو کہ سڑک کے بیچوں

> **محبت**
>
> کون ہے جو پیار نہیں کرتا مگر کسی کو نہیں معلوم کہ اس کا مفہوم اور مقصود کیا ہے؟ ہر شخص اپنے طور پر اس کی تشریح کرتا ہے۔ کسی نے شیریں سے پیار کیا تو کسی نے شیریں کے نام پر اس کے باپ کی دولت پر نظر جمائی، کون زندہ رہ گیا، یہ سب جانتے ہیں۔
>
> محبت کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ بہت سوں کا کہنا ہے کہ محبت وہ بیماری ہے جو شادی کا کڑوا گھونٹ پینے ہی سے ختم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں دل لگانے کا مشورہ بہت ہی چھوٹی عمر میں مل جاتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں ''بیٹا دل لگا کر پڑھا کرو!''
>
> محبت کا پوسٹ مارٹم از ایم ابراہیم

بیچ لال ڈوروں والی مخمور نِگاہوں سمیت انتہائی سکون سے براجمان ہوتے ہیں اور بھونپو (ہارَن) بجنے پر آنکھیں کھول کر بے نیازی سے دیکھ کر دوبارہ بند کر لیتے ہیں۔'' اسی طرح یہ بیڑے بھی جگالی کرتے ایسے بے نیازی سے ایک کان جُھکا اور ایک اُٹھا کر دیکھتے ہیں، جیسے اگلے کو کچھ سمجھتے ہی نہ ہوں۔۔۔ خیر۔۔۔ وزارت کے کچھ لوگوں نے اس کو فارسی کے ''ہفتم'' سے ''ہتگا'' کرنے کی مذموم کوشش بھی کی تھی... مگر اس کا قارورہ بگنے مُوتنے سے مِلانے پر کوئی راضی نہ ہُوا۔ اب وزارتِ حماقت میں بول و بزار کے استاد میاں چرکین تو ہیں نہیں جو کوئی ایسی حرکت کر کے چلا جائے اور کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہو۔ کوئی شرم ہوتی ہے کوئی حیا ہوتی ہے... دھت تیرے کی۔۔۔

نَنگا

اگر پڑھنے والے یہ سمجھ رہے ہوں کہ یہ اُردو کے عددی لفظ ''نَو'' سے مصنوعہ ہے تو سوچتے رہیں۔۔۔ اس سے راقم کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔۔۔ اس کی آغاز کی آواز سے لگتا ہے کہ یہ انگریزی لفظ ''نَن'' Nun (راہبہ) ہے۔۔۔ مگر احمق آباد والوں کو راہب، راہبہ قسم کے بیڑے بالکل نہیں پسند۔۔۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ کبھی کبھار اِدھر لوطی نسل کے بیڑے بھی پہنچ جاتے ہوں۔۔۔ مزید برآں، اس لفظ کا برہنہ ہونے سے رتی برابر تعلق نہیں ہے۔ (ویسے، اگر کہہ بھی دیا جائے تو بیڑے ذرا بُرا نہیں منائیں گے) تو خیر، یہ نو سال کے جانور کیلئے مستعمل ہے۔۔۔ کچھ لوگوں نے ''اَٹھا'' (آٹھ سال) کے وزن پر ''نَٹھا'' کرنے کی مذموم کوشش بھی کی تھی مگر اس کے گالی میں تبدیل ہونے کے ڈر سے لاکھوں روپے کا خیال مسترد کر دیا گیا لیکن ننگا رکھنے پر بھی کافی قباحتیں پیش آنے کا امکان ہے۔۔۔ منڈی میں کچھ ایسی صورتِ حال پیش آئے گی کہ:

گاہک: ہاں بھئی! کتنے سال کا جانور ہے یہ۔۔۔!؟

جانور کا مالک :یہ۔۔۔ یہ ننگا ہے۔۔۔!

گاہک: استغفراللہ۔۔۔ بھائی! ہمیں بھی معلوم ہے کہ یہ ننگا ہے۔۔۔ ہم اس کی عمر دریافت فرما رہے ہیں!!

مالک: یقین مانئے کہ یہ ننگا ہے!

گاہک: لاحول ولا۔۔۔ پھر وہی۔۔۔ ارے شرم نہیں آتی آپ کو۔؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ بھئی میں عمر پوچھ رہا ہوں اس کی، عمر!!

مالک: ارے بھئی۔۔۔ یہ ننگا ہے۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ ننگا۔۔۔ آپ ننگا نہیں جانتے۔۔۔؟ یعنی کہ۔۔۔ ننگا۔۔۔!

گاہک: بدتمیز کہیں کے۔۔۔ تمھیں شرم نہیں آتی؟ کیا لغویت پھیلائی ہوئی ہے۔۔۔ میں نے کب کہا ہے کہ میں نے اسے عید کے کپڑے سلوا کے دینے ہیں۔۔۔ جانے کہاں سے اٹھ کے آجاتے ہیں۔۔۔ احمق کہیں کے۔۔۔ بلکہ یہیں کے۔۔۔ کچھ نہیں لینا تم سے۔۔۔ بدتمیز۔۔۔!

اور مالک پیچھے ہکلا تا رہ جاتا ہے۔۔۔!

ڈھیر سارے برس پہلے، ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام نے چناؤ کیا تھا، اُنھیں اپنے بیٹے سے محبت تھی مگر انھیں اپنے ربّ سے زیادہ محبت تھی۔ اپنے بیٹے کو قربان کرنے کا حکم نازل ہُوا لیکن وہ اُن کا بیٹا نہیں تھا، جو ذبح ہُوا تھا بلکہ جو چیز ذبح ہوئی تھی وہ تھی اُن کی خواہش۔۔۔ اُن کا کسی بھی شے سے لگاؤ جو اُن کی اللہ کے لئے محبت کے مقابلے میں آ سکتا تھا، پس ہمیں اپنے آپ سے پُوچھنا چاہئے کہ ہمیں اُس عظیم قربانی کی یاد میں اپنا کِن اشیاء سے لگاؤ قربان کرنا ہے۔ قربانی کے ان خوبصورت دِنوں میں۔۔۔ وہ بھی اپنی قیمتی ترین چیز سے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے کہ۔۔۔ بڑھاپے کی اولاد۔۔۔ اللہ کے لئے۔۔۔!

اور میرے ربّ کو اُن تین دِنوں میں خون بہانے سے زیادہ کوئی عمل پسند نہیں، بہترین جانور ہو، چُھری تیز ہو۔ قربانی میں بھی اسراف سے بچو اور افراط و تفریط کا شکار نہ ہو۔۔۔ تمہارے ربّ تک خون گوشت وغیرہ کچھ نہیں پہنچتا بلکہ اس کی بارگاہ میں رسائی صرف تقوی کو ہے، پس عدل کرو کیونکہ یہ تقوی کے زیادہ قریب ہے۔۔۔ دعاء کی درخواست!!!

احمد سعید

عید تو دید سے ہوتی اور دید تو عید کو ہی ہوتی ہے۔ یعنی

"دید والوں کی عید ہوتی ہے"

چاندرات کو چاند نظر آ جائے تو اگلے دن عید اور نہ آئے تو اگلے دن چاندرات ضرور ہوتی ہے پھر چاندرات کو بازاروں میں اتنے چاند، ہماری تو وہیں عید ہو جاتی ہے۔

بچپن اور جوانی کی عید میں سب سے بڑا فرق بچپن اور جوانی کا ہی ہوتا ہے۔ بچپن کی عید عیدی پہ موقوف اور نوجوانوں کی زیادہ تر کرکٹ پہ ہوتی ہے۔ جوانوں کی عید عید دینے پہ اور زیادہ تر جوان چونکہ شادی شدہ ہوتے ہیں تو ان کی عید بیگموں کے پیچھے پیچھے ہی گزرتی ہے۔

بہت بچپن کی عیدیں مجھے تو یاد نہیں یعنی جب میں کوئی ایک دو سال کا تھا۔ خیال ہے کہ اتنی عمر میں بچوں کو اپنی عیدیں یاد نہیں ہوتی ہوں گی۔ اتنی عمر میں بچوں کو عیدی تو بہت ملتی ہے لیکن اُن کے حصے میں اس عیدی کا ایک چوتھائی بھی نہیں آتا۔ والدین سمجھتے ہیں کہ اسے کیا پتہ عیدی کے پیسوں کا؟ حالانکہ اُسے سب پتہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ تھوڑا بولنے اور بھاگنے کے قابل ہوتا ہے تو اس وقت وہ آپ کی تمام کوششیں ناکام بنا دیتا ہے۔ چاہے آپ لاکھ بہانے بنائیں کہ تمہارے شوز لینے نہیں جانا؟ اور برگر بھی تو کھانے جانا ہے۔ وہ سب سمجھ گیا ہوتا ہے کہ کونسے جوتے اور کونسا برگر؟ یہ سب چیزیں تو اسے ویسے بھی مل ہی جاتی ہیں۔ یہ سب اس کا طفلانہ تجربہ ہوتا ہے، جو وہ ایک دو سال کی عمر سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ پر اُس وقت وہ شریف النفس بچہ نہ تو منہ سے بول سکتا ہے، اور نہ آگے لگ کے بھاگ سکتا ہے۔ صرف رو ہی سکتا ہے اور یہاں رونے سے صرف بات نہیں بنتی ورنہ کتنے ہی مرد اپنی بیگموں کے آگے گڑگڑاتے ہیں وہ شاید نہیں جانتے کہ

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں "جانتیں" وفا کیا ہے

اور اب تو وہ ویسے ہی آپ سے تم، تم سے تو پہ آ چکی ہیں ڈر ہے تو سے "تھوتھو" پہ نہ آ جائیں

ہر بات پہ "کہتی" ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

عید پہ ایک بار بڑے بھائی نے ہمیں فلم دکھانے کی آفر کر دی

وہ بھی سینما میں۔ بڑے بھائی تو اپنے دوستوں میں کھڑے ہونے کی آفر نہ کرتے، آج یہ کرم نوازی دیکھ کر یقین نہ آیا۔ فوری پیچھے مڑ کر دیکھا کہ دوسرے بڑے بھائی کو تو نہیں کہا، پر پیچھے کوئی نہ تھا اور انہوں نے نام بھی میرا لیا تھا۔ میں حیران کھڑا اُنھیں تک رہا تھا، کہنے لگے جانا نہیں؟ میں نے کہا، کس نے نہیں جانا، میں تو

ہیر رانجھا

بیکار باتیں نہ کرو۔۔۔ یہ تو حسن وعشق ہی کی سرزمین ہے۔۔۔
میں نے تمہارے یہاں کی کہانیاں سنی ہیں۔
پڑھی ہیں! وہ کون تھے؟
ہیر اور رانجھا!
ان کا تو نام ہی نہ لو۔۔۔! عمران برا سا منہ بنا کر بولا۔
کیوں! ان کی داستان تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔
بعد کے حالات سے تم واقف نہیں ہو۔ خبروں پر سنسر ہو گیا تھا اور بعد کے حالات دنیا کو نہیں معلوم ہو سکے تھے۔
کیسے حالات؟
''وہ دونوں راوی کے کنارے ملا کرتے تھے۔ عشق ہو گیا۔ ہیر دراصل وہاں کپڑے دھونے آیا کرتی تھی۔ رانجھا اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ہاتھ کیا بٹانے لگا ہیر کو تو الگ بٹھا دیتا اور خود ہی اس کے کپڑے دھو دھا کر ڈھیر لگا دیتا۔ اچانک ایک دن اس نے محسوس کیا کہ اسے تقریباً ڈھائی سو کپڑے روزانہ دھونے پڑتے ہیں۔ تب اسے ہوش آیا اور بری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے ہیر کی طرف دیکھا جو کچھ دور گھاس پر بیٹھی لسی پی چکنے کے بعد نسوار کی چٹکی چلانے جا رہی تھی۔۔۔ مگر وہ صرف دیکھ کر ہی رہ گیا کچھ بولا نہیں۔ لیکن اسے چونکہ تشویش ہو گئی تھی اس لیے وہ نچلا نہیں بیٹھا! کپڑے تو اسے بہر حال دھونے پڑتے تھے اس سے جو وقت بچتا تھا اس معمے کو حل کرنے میں صرف کر دیتا۔ اب اسے ہیر سے عشق جتانے کا بھی کم موقع ملتا تھا۔ ویسے وہ لسی کا گھڑا سامنے رکھے بیٹھی اس کا دل بڑھایا کرتی تھی آخر ایک دن یہ راز کھل ہی گیا۔ بیچارے رانجھے کو معلوم ہوا کہ ہیر کے بھائی نے مال روڈ پر ایک بہت بڑی لانڈری کھول رکھی ہے۔ بس وہ غریب وہیں پٹ سے گرا اور ختم ہو گیا۔ یہ ہے اصلی داستان ہیر رانجھا کی۔

سوالیہ نشان از ابن صفی

سمجھیں سینما پہنچ بھی گیا ہوں۔

میں اس وقت چھٹی کلاس میں تھا، پہلی بار سینما اندر سے دیکھنا تھا اور اندر سے صرف سینما ہی نہیں، فلم بھی دیکھنی تھی۔ نئی جوتی پینٹ شرٹ سمیت موٹر سائیکل پہ چڑھ گئے اور سینما کی طرف فلم دیکھنے نکل پڑے۔ نگینہ سینما کی ٹکٹیں بک ہوچکی تھیں۔ وہاں ہمارا ''ٹاکرا'' کزنوں کے ساتھ ہوا، انہوں نے پوچھا آپ کہاں؟ ہم نے پوچھا بھئی آپ کہاں؟ یہ ایک روایتی انداز تھا۔ بھئی ظاہری سی بات ہے سینما کے اندر عید کے دن فلم ہی دیکھنے آئے ہیں کوئی عید ملنے تھوڑی۔ مجھے لگا فلم ہاتھ سے نکل گئی۔ فلم کا مسئلہ نہیں تھا، سینما میں فلم دیکھنے کی بات تھی۔ بڑے بھائی اور کزن آپس میں باتوں میں لگ گئے اور میں فلموں کے پوسٹر دیکھنے لگ گیا وہ بھی سینما کے اندر۔ آخر منصوبہ طے پایا کہ دس بجے کا شو دیکھتے ہیں تب تک اُن کی طرف رہا جائے۔ اُن کا گھر قریب تھا سو وہاں گپوں میں وقت گزارا، پر صرف انہوں نے۔ میرا تو سارے کا سارا دھیان ہی نہیں وجود بھی اُس پل سینما میں تھا۔ اور میں تو فلم کی کئی کہانیاں اپنے ذہن میں بنا بھی چکا تھا۔ بس اب اصلی فلم بڑی اسکرین پر دیکھنی رہ گئی تھی۔ انتظار میں ہماری جان سوکھ سوکھ کے آدھی رہ گئی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ہمیں گھڑیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتیں یا افتخار کی۔ لیکن یہ گھڑیاں ختم ہونے پہ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے اپنے کپڑے نہ دیکھے لیکن اپنے جوتوں کو اچھی طرح دیکھا کہ کہیں کوئی ہلکی سی بھی مٹی تو اسے ٹکرا کے نہیں گزری۔ پھر نئی جوتی کے ساتھ ایسے چلا جیسے کوئی سلو موشن میں چل رہا ہو۔ بچپن میں ابا جان جب نئی جوتی مجھے لے کے دیتے تو میں کچھ اس قسم کی حرکات وسکنات ہی کرتا جب تک اسے آٹھ دس بار پہن نہیں لیتا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ نئی جوتی سے اگر بالکل نارمل ہو کر چلا جائے تو بوٹ کے درمیانی حصے میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ جسے پنجابی میں '' چُوڑ مُرڑ'' کہتے ہیں۔ اور جوتا بدنما سی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس لیے میں چلتے ہوئے پاؤں کو موڑتا ہی بہت کم تھا، بس ربورٹ کی طرح چلتا تھا۔

بھائی کی بار بار آوازیں اور میں ''ربوٹ'' کی مانند آہستہ آہستہ ،لیکن اب موٹر سائیکل تک پہنچ چکا تھا۔موٹر سائیکل بھائی نے ایسے چلائی جیسے انگلش فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔ میں نے بھائی کو بڑے زور سے پکڑا ہوا تھا کہ اچانک مجھے جانے کیا سوجھی، اپنے جوتے کو دیکھا کہ اس عید پہ جوتا بڑا خوبصورت لے ہوگیا ہے۔

آگے سے باریک سا تھا اور جوتے کے فرنٹ پہ باریک سی ''پتری'' لگی ہوئی تھی، اب میں نے موٹر سائیکل کے پائیدان سے پاؤں ہٹا کر جوتے کو پاؤں کے ساتھ ہوا میں لہرایا اور بالکل زمین کی طرف لے گیا یعنی جوتے کی ماڈلنگ شروع کر دی کہ اچانک سڑک سے نکلا ہوا گٹر کا ڈھکن جوتے میں بجا۔ پاؤں تو بچ گیا جوتا نہ بچا۔ جوتے کے آگے خوبصورت نما ''پتری'' مُڑ گئی۔ بس میں رویا نہیں باقی اُس جوتے کی حالت دیکھ کر سب کچھ کر لیا۔فلم سے دھیان ہٹ چکا تھا سارا دھیان ہی جوتے پر تھا۔ابھی تو عید کا پہلا دن تھا۔ اتنے میں سینما آ گیا، دھیان پھر سینما کی طرف گیا۔فلم تک جوتے کو بھول گیا۔ سینما میں داخل ہوئے ، پھر جہاں سینما سکرین ہوتی ہے وہاں داخل ہوئے۔فلم کو ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے۔میرا پہلا تجربہ تھا، پہلی بار سینما اسکرین میں داخل ہوا تو اندھیرا ہی اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے۔اپنا ہی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں دیکھا تو ڈر گیا کہ یہ کس نازک حسینہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔اوپر سے فلم میں ہیلی کاپٹر نمودار ہوا، اتنی تو اصلی ہیلی کاپٹر کی آواز نہیں ہوتی جتنی سینما میں آ رہی تھی ۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ یہیں پہ اترنے لگا ہے۔ میں ذرا پیچھے ہٹا۔ بھائی نے آگے کو دھکیلا۔ میں نے کہا بھائی ہیلی کاپٹر۔ بھائی کہنے لگا ہیلی کاپٹر ہی تو ہے بَھو (کتا) تو نہیں۔سونے پہ سہاگا ہیلی کاپٹر سے شفقت چیمہ ہر فلم کا ''وِلن'' لمبے لمبے پاؤں بڑے بڑے ناخن اور عجیب سی آوازیں نکالتا ہوا باہر نکلا۔ میں نے سوچا فلم تو ''لو 95'' تھی، یہ ''کوہ قاف'' سے واپسی لگا دی۔ پر میں اتنا بھی بچہ نہ تھا، آخر کار سمجھ گیا کہ آج کل فلموں کے نام کچھ اور کہانی کچھ ہوتی ہے بلکہ کہانی ہوتی ہی کہاں ہے؟ اب میں تھوڑا تسلی سے بیٹھنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔فلم میں ریمبو آیا، ریما آئی، بابر آیا، میرا آئی تقریباً آدھی فلم انڈسٹری آ گئی پر کوئی سٹوری نہ آئی کہ ہاف ٹائم آ گیا۔

سموسے کھائے نان ٹکیاں بوتلیں اور پھر سینما کی طرف رواں دواں ہو گئے ۔ مجھے بہت مزہ آ رہا تھا اتنی بڑی اسکرین پہ پہلی بار ریمبو، ریما، صاحبہ، بابر اور ہیلی کاپٹر کو اکٹھے دیکھ کر۔ میں نے بھائی کے کان میں آہستہ سے پوچھا کہ کہانی کیا چل رہی ہے؟ بھائی نے مجھے چپ ہی کرا دیا۔شاید کہانی ہی شروع ہونے لگی تھی یا پھر بچہ سمجھ کے چپ کرا دیا۔ پر اتنے بھی کیا بچے اُس وقت عینک والا جن کی ہمیں اچھی خاصی سمجھ آتی تھی۔ PTV پہ رات ۸ بجے کے ڈرامے سارے سمجھ آتے تھے میں کونسا ابھی روٹی کو ''چوچی'' ہی کہتا تھا۔فلم سمجھ آئی نہ آئی پر اس عید پر مزہ دوبالا ہو گیا تھا۔

ساھنوں کی!

بسا اوقات میرا دل انسانیت کے لئے بہت تڑپتا ہے!

جب میں اپنے اردگرد بھوک اور افلاس کو دیکھتا ہوں تو لرز جاتا ہوں!!

میرا دل شدت سے چاہتا ہے کہ میں ان کے لئے کچھ کروں۔

لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ دفع کرو جی! سانوں کی!!

پہلی سی محبت۔۔۔

عشق کی لہر تھی اور پھر وہ جوانی کی چھلانگ
ایک ہی جست میں فرلانگ بھی جاتے تھے پھلانگ
اور اب ضعف ہے ایسا کی گھسٹتی نہیں ٹانگ
"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

سلمان باسط

چاندرات اور چاند

نکلے جو چاندرات کو ہم بر سبیل، شوق
جذبات ایسے مچلے، مچلتے چلے گئے
نکلا تھا ایک چاند کہیں چاند رات کو
پھر ہر طرف سے چاند نکلتے چلے گئے

سلمان باسط

فکروفاقہ

میں کیسے سمجھوں مضامینِ دانش و بینش
نہ میکدہ ، نہ صراحی ، نہ ہے کوئی ساقی
مرے نصیب میں ہے روز و شب محض فاقہ
تمہیں ہو یار مُبارک یہ فکرِ آفاق

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اثر ہونے تک

ایک گنجے کو سنا ہم نے یہاں کہتے ہوئے
میں نہ مرجاؤں دوائی کا اثر ہونے تک
چار برسوں میں اُگے چار مرے سر پر بال
"کون جیتا ہے مری زُلف کے سر ہونے تک"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

لاحول

بُرائی ہے کہ پھیلے جا رہی ہے
قدم شیطاں کے بڑھتے جا رہے ہیں
یہ مت کہنا کہ کچھ کرتے نہیں ہم
سنو ! لاحول پڑھتے جا رہے ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈریسنگ روم میں

ڈریسر نے کہا کہ کام مشکل ہے ڈریسنگ کا
ہے یہ ایسی جگہ کہ چشمِ تر بھی رو نہیں سکتی
مٹانا داغِ دل دشوار ہے اے عاشقِ صادق
کہ زخمِ دل کی مرہم اور پٹی ہو نہیں سکتی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ٹیکہ

دردِ دل ، دردِ جگر کیسے رفع ہوتا ہے
مجھ کو معلوم ہے تو اپنا ہٹا لے ٹیکہ
اے حسیں نرس نہ کر چھلنی مرے بازو کو
مری خاطر ذرا ماتھے پہ سجا لے ٹیکہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

گلکاری

رہ گیا دنگ جو پہنچا میں کراچی مظہر
ہر در و بام پہ وہ نقش تھے گلکاری کے
پوچھا جب ماہرِ فن کون ہے ہنس کر بولے
یہ کرشمے ہیں فقط پان کی پچکاری کے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

بعد از شادی

یہ بولے شیخ جی محبوبہ سے بصد الفت
میں جس میں غرق ہوں،وہ جھیل بن گئی ہو تم
یہ انقلاب ہے کیسا ، اب اُس سے کہتے ہیں
کہ بعد شادی کے ، اِک چیل بن گئی ہو تم

تنویر پھول

قومِ لوط سے ایک سوال

ہیں قومِ لوط کے حامی بڑے زعمِ ترقی میں
کوئی اُن سے یہ پوچھے،کس طرح تشریف تم لاتے؟
نہ تم دنیا میں آتے اور نہ باتیں یہ بناتے تم
تمھارے باپ ماں جو تھے، اگر یہ سوچ اپناتے

تنویر پھول

ادرک کا بھاؤ

جامِ ہنر ہیں پینے سے عاری
کچھ گھونٹ لینا ان کو سکھاؤ
بے بہرہ فن سے ، سمجھے ہیں مہمل
" بندر کیا جانے ادرک کا بھاؤ"

تنویر پھولؔ

گھر کی مرغی

مرغی اب ہے دال سے سستی!
ڈار کی باتیں بال برابر
مرغی سستی ؟ کیا یہ غلط ہے؟
" گھر کی مرغی دال برابر "

تنویر پھولؔ

پانامہ مارکہ لیڈر

کیسے چھوڑیں جان سیاست کی، لیڈر
پانامہ نے کر دی ہے پیدا ہلچل
سرداری ہر صورت اپنے پاس رہے!
"بلی جب گرتی ہے تو پنجوں کے بل"

تنویر پھولؔ

پی ایچ ڈی

دیکھ کر لگتا ہے یہ ، گردن میں سریا آگیا
وہ بنے ہیں "ڈاکٹر" تو اُن کی گردن تن گئی
وہ لگاتے ڈیش ہیں ڈگری میں اپنی دو عدد
لکھتے اپنے نام کے آگے ہیں وہ "پی۔ایچ۔ڈی"

تنویر پھولؔ

مرغِ حرام

دو کو چھوڑیں، ہم نے دیکھا پھولؔ! یہ حیرت کے ساتھ
ایک مُلّا ہیں ہمارے ، کرتے ہیں مرغی حرام
کچھ کہو اُن سے تو پھر ہوتا ہے اُن کو ناگوار
چھوڑتے ہیں وہ شگوفہ ، ہم ہیں کرتے ابتسام

تنویر پھولؔ

جھاڑو

آنا مبارک ہو گیا!
دیوار غفلت گر گئی
آئے بلاول جب یہاں
بستی میں جھاڑو پھر گئی!!

تنویر پھولؔ

بارش

رحمت و زحمت بنی بارش یہاں
بستیاں ایسی بھی ہیں جو رُل گئیں
پہلے جھاڑو پھر گئی، اچھا ہُوا!
ہوگئی بارش تو سڑکیں ڈھل گئیں

تنویر پھولؔ

توند

اتنی بڑی سی توند پھلائے ہوئے ہیں وہ
پٹرول پمپ جیسے چھپائے ہوئے ہیں وہ
لیڈر بنے ہوئے ہیں بہت مال کھا گئے
ہنس ہنس کے سب کو اُلّو بنائے ہوئے ہیں وہ

تنویر پھولؔ

سوال

کیمرے کے سامنے جب آ گئے
یوں لگا، موٹی سی اِک گاجر ہیں آپ
ہے یہ فتویٰ یا سیاسی ہے بیان
آپ ''مولانا'' ہیں یا لیڈر ہیں آپ ؟

تنویر پھولؔ

الفاظ کا کھیل

نہ محقق ہیں ہمارے ملاّ، روایتیں سب الگ الگ ہیں
جو بات حق کی ہے اُس کو مانو، نہ اس میں جائز اگر مگر ہے
نئے نئے نام ان کو دے کر پرانے الفاظ ہم نے بدلے
جو تھا گویا وہ اب ہے سنگر، جو ناچتی تھی وہ ڈانسر ہے

تنویر پھولؔ

سرکاری عمرہ

حرم میں آ کر بیٹھے سارے چور اُچکّے ڈاکو
رو رو آہیں بھر بھر مانگیں رَب سے یہ دعائیں
''ووٹر اپنے یونہی یارب قائم دائم رکھنا
سو سو دھوکے کھا کر ہم سے پھر سے دھوکا کھائیں''

ابنِ مُنیب

بیس قیراط

''صرف سبزی'' لکھا تھا تھیلے پر
اور سارا فروٹ تھا اس میں
چ کا سونا جسے وہ کہتا تھا
بیس قیراط جھوٹ تھا اس میں

ڈاکٹر عزیز فیصل

ترنم

یہ مسئلہ ہے پریشان کن نہایت ہی
و؟ کس طرح سے یہ تکلیف بے بسی کی ہے
زبید؟ آپا سے پوچھ؟! ہے ایک شاعر نے
و؟ فیس بک پہ ترنم سے شعر کیسے کہے؟

ڈاکٹر عزیز فیصل

جھنگ کی نذر

ٹوٹی پھوٹی سڑک پہ جاتے ہوئے
میں نے سوچا ہر ایک کھڈے پر
ہیر کیونکر ملی نہ رانجھے سے
جھنگ میں ڈائیو کے اڈے پر

ڈاکٹر عزیز فیصل

پردیسیوں کا دکھ

گھر والے نہ ہوں ساتھ تو پردیس میں بھائی
خوش باش ذرا سی بھی طبیعت نہیں ہوتی
پردیس ہے دنیا میں وہ کونہ کہ جہاں پر
گھر والی سے لڑنے کی سہولت نہیں ہوتی

ڈاکٹر عزیز فیصل

زوجہ سے بچا مجھ کو خدا

بگڑے ہیں مرے گھر کے یہ حالات مسلسل
فی الوقت ہیں گھیرے ہوئے خطرات مسلسل
کل رات مجھے پھینٹی پڑی اور طرح کی
دکھتے ہیں مرے ہڈی و عضلات مسلسل

عتیق الرحمٰن

ٹریپ

کتراتا تھا جس راہ پہ چلنے سے کبھی میں
یاروں نے گھسیٹا ہے مجھے اُس ہی گلی میں
پہلے تو بلایا ہے بڑے پیار سے مجھ کو
پھر زور سے پیٹا ہے مجھے اُس ہی گلی میں

عتیق الرحمٰن

پیسے کا آدمی

کر دیا ہو مال نے اندھا جسے
کچھ دکھائی پھر اُسے دیتا نہیں
بات مطلب کی نہ ہو جب بھی کوئی
کچھ سنائی پھر اُسے دیتا نہیں

عتیق الرحمٰن

صداقت حسین ساجد

جائز کرایہ

میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا، تو ٹیکسی رک گئی۔

''مجھے رفیق چوک تک جانا ہے۔'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''آپ نے جہاں بھی جانا ہے۔۔۔اندر تشریف لائیں۔''

ڈرائیور نے کہا۔ اس کا لہجہ اتنا شائستہ تھا، جو ہمارے ہاں زیادہ تر موجود نہیں ہے۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ ہمارے ہاں اچھے اور ایمان دار لوگ ختم نہیں ہوئے ہیں، لیکن تھوڑی تعداد میں موجود تو ہیں۔

کوئی پندرہ منٹ بعد میرا اسٹاپ آ گیا۔

میٹر پر ۴۷ روپے نظر آ رہے تھے۔ میں نے پچاس روپے کا نوٹ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف کیا، تو وہ سر ہلا کر بولا۔

''میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔''

میں نے اپنی جیبیں ایک بار پھر کھنگالیں اور دس دس روپے کے تین نوٹ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔

''میرے پاس تین روپے بھی نہیں۔'' ڈرائیور نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں کھلے دل سے مسکرایا۔ ''یہ تین روپے تم رکھ لو۔''

''میں بیرا نہیں ہوں کہ آپ سے ٹپ لے لوں۔''

''یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں اس طرح کے لوگ بھی ہیں۔۔۔مگر اب ہم کیا کریں۔''

''وہاں بائیں طرف کونے میں بڑا یوٹیلٹی اسٹور ہے۔۔۔ہم وہاں سے پیسے کھلے کرا سکتے ہیں۔''

اسٹور بائیں طرف گلی میں تھا۔ مگر وہ یک طرفہ راستہ تھا۔ ہم بائیں جانب نہیں مڑ سکتے تھے، اس لیے ہم سیدھے گئے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر مڑے۔ یوٹیلٹی اسٹور کے پاس پہنچے، تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور اسٹور ظہر کی نماز اور دوپہر کے کھانے کے وقفے کے لیے بند ہو چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کا میٹر دیکھا، تو اس پر ۴۲ روپے نظر آ رہے تھے۔ میں نے معاملہ ختم کرنے کے لیے کہا۔

''تقریباً ۵۰ روپے ہو گئے۔''

ڈرائیور کو شاید میرے ارادے کا علم ہو گیا، اس لیے وہ بولا۔

''دیکھیے! میرے پاس کھلے آٹھ روپے نہیں ہیں اور یہ یاد رکھیے کہ میں ٹپ نہیں لیا کرتا۔''

''یہ تو تقلید کے لائق مثال ہے۔'' میں نے اس کی تعریف کی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ ''اس طرح کرو کہ مجھے آٹھ روپے کی سیر اور کرا دو اور اس ٹیکسی سے مجھے رہائی دلاؤ۔''

میں میٹر دیکھنے لگا، جوں ہی پچاس روپے پورے ہوئے، میں نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

’’یہیں روک دو۔۔۔یہیں روک دو!‘‘

’’معذرت۔۔۔ جناب!‘‘ ڈرائیور اسی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔ ’’یہاں ٹھہرنا قانوناً ممنوع ہے۔۔۔آپ آگے نصب ہوا ٹریفک بورڈ نہیں دیکھ رہے؟‘‘

’’تو پھر میٹر بند کر دو!‘‘

’’یہ بات اُصول کے خلاف ہے۔‘‘ ڈرائیور بولا۔ اس کا لہجہ بہت شائستہ تھا۔ ’’جب گاڑی میں سواری موجود ہو، تو لازمی میٹر کو چلتے رہنا چاہیے۔‘‘

جب ہم ایک ایسی جگہ پہنچے، جہاں ہم قانون کی خلاف ورزی کیے بغیر رک سکتے تھے، تو میٹر ۷۶ روپے دکھا رہا تھا۔

میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

’’زیادہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ ڈرائیور نے مجھے دلاسا دیا۔ ’’چلیے! ہم اس کا کوئی اور حل سوچتے ہیں۔۔۔کچھ فاصلے پر ایک بنک ہے۔۔۔وہاں میرا ایک دوست کیشیئر ہے، ہمیں پیسے فوراً کھلے کرا دے گا۔‘‘

وہاں گئے، تو یہ دیکھ کر میں مایوس ہو گیا کہ بنک بند تھا۔ باہر کھڑے چوکی دار نے بتایا کہ آج بنک کی چھٹی تھی۔ میں گھبرانے لگا۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور بڑا حوصلہ مند انسان تھا۔ اس نے ٹیکسی پھر چلائی، تو میں نے پوچھا۔ ’’اب کدھر جا رہے ہو؟‘‘

’’قومی مرکز بچت والے آج کے روز آدھی چھٹی نہیں کرتے۔۔۔وہاں چلتے ہیں۔‘‘

اس کی بات ٹھیک نکلی۔ وہ واقعی آدھی چھٹی نہیں کرتے۔ مگر مرکز بند تھا، کیوں کہ وہ پوری چھٹی کرتے ہیں۔

خوش قسمتی سے اب میٹر پورے ۸۰ روپے دکھا رہا تھا، نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی روکے رکھنے کو کہا، کیوں کہ ٹیکسی کی ذرا سی حرکت سارا میزان خراب کر سکتی تھی اور جیب سے ۸۰ روپے نکال کر اسے دے دیے۔ ڈرائیور نے شکریہ ادا کر کے رقم پکڑ لی اور جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

’’خدا کی قسم! مجھے دلی طور پر افسوس ہے کہ واقعات اس طرح پیش آئے اور آپ کو بہت زیادہ زحمت برداشت کرنا پڑی۔۔۔مگر میں اپنے ضمیر کا کیا کروں، جو جائز کرائے کے علاوہ ایک پیسا بھی لینا ناجائز سمجھتا ہے۔‘‘

میں نے اس کی ایمان داری اور اس کے نتیجے میں خود کو پہنچنے والے نقصان پر لعنت بھیجی اور سر ہلا کر چپ ہو گیا۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

’’مگر مجھے تو رفیق چوک جانا تھا۔‘‘

’’تو کیا ہوا۔۔۔جناب!‘‘ ڈرائیور پہلے کی طرح شائستگی سے بولا۔ ’’میں ابھی آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں۔‘‘

پندرہ منٹ کے بعد ہم پھر رفیق چوک پہنچ گئے۔ میٹر دیکھا، تو وہ پھر ۲۷ روپے دکھا رہا تھا۔ میں اپنا سر تھام کر رہ گیا!!!

جیف گوئبیل / نوید ظفر کیانی

چور

(اس کھیل کے لئے کسی خاص سیٹ کی ضرورت نہیں۔ یہ سارا کھیل کسی گلی کے نکڑ پر بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو منظر نامے میں رنگ بھرنے کے لئے پس منظر میں ایک عدد پوسٹ بکس آویزاں کر سکتے ہیں یا کسی مکان کی کھڑکی بنا سکتے ہیں، لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جائے تو کھیل کا مجموعی تاثر ہرگز مجروح نہیں ہوگا۔ گلی کے منظر نامے کو حقیقی بنانے کے لئے چند ایک ایسے پیدل افراد کا اہتمام کیا جا سکتا ہے جو گاہے بگاہے گلی میں مٹرگشت کریں یا وہاں سے گزر جائیں۔ پھیری والے کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے جو ہلکی پھلکی آواز لگاتا ہوا وہاں سے گزرے لیکن وہ مسلسل آوازیں لگانے سے گریز ہی کرے تو بہتر ہے کیونکہ اس سے کھیل کے کرداروں کے صوتی تاثرات پر بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے۔)

بیٹی (معمول کے مطابق بے فکری کے انداز میں گلی سے گزر رہی ہے۔ اُس نے سنہری ہار پہنا ہوا ہے)

ایلس (یہ بھی گلی سے گزر رہی ہے لیکن بیٹی کے مخالف سمت سے آ رہی ہے، بیٹی سے قدرے قریب آ کر رُک جاتی ہے۔ اُس کی نظر مسلسل بیٹی کے سنہری ہار پر گڑی ہوئی ہے)

بیٹی (ایلس کو رُکتا دیکھ کر) کیوں جی، کیا کوئی کام ہے مجھ سے؟

ایلس پتہ نہیں۔۔۔ بس مجھے یونہی تجسس سا ہو رہا ہے، کیا تم بتا سکتی ہو کہ تم نے یہ ہار کہاں سے لیا ہے؟

بیٹی کیوں؟ کیا یہ تمھارا ہے؟؟

ایلس جی ہاں، مجھے کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے، ہو بہو ایسا ہی سونے کا ہار میں بھی پہنتی رہی ہوں۔

بیٹی اچھا۔۔۔ اب کہاں ہے وہ؟

ایلس کچھ پتہ نہیں۔۔۔ بس کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ میں اسے ایک ڈیڑھ برس تک پہن نہیں پائی، موقع ہی نہیں ملا اِس کا۔۔۔ بعد میں خاصا ڈھونڈا لیکن اُسے نہیں ملنا تھا سو نہ ملا۔ وہ ہار میرا پسندیدہ ہار تھا۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم سے پوچھنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟

بیٹی اگر میں تمھیں نہ بتاؤں کہ میں نے یہ کہاں سے لیا ہے تو کیا کر لوگی؟

ایلس (پس و پیش کے عالم میں) یہ تمھاری مرضی ہے، اگر چاہو تو مجھے بتا دو کہ تمھیں یہ کہاں سے ملا ہے، میں تمھیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ویسے یہ بات کچھ اچنبھے کی ہے کہ آخر تم مجھے بتانے سے ہچکچا کیوں رہی ہو کہ تم نے یہ سونے کا ہار کہاں سے لیا ہے۔۔۔ لیکن اگر تم نہیں بتانا چاہ رہیں تو تمھاری مرضی ۔۔۔ اللہ

حافظہ۔

بیٹی: ٹھہرو۔۔۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ میں تمھیں نہیں بتاؤں گی، میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ اگر میں نہ بتانا چاہوں تو تم کیا کرلوگی۔

ایلس: اوہ۔۔۔تو کیا اس کا مطلب کہ تم مجھے بتادوگی؟

بیٹی: کہیں تم کو مجھ پر ہار کی چوری کا شبہ تو نہیں کررہی ہو؟

ایلس: (جلدی سے) ارے نہیں، بالکل نہیں۔۔۔ میں بھلا ایسا کیسے سوچ سکتی ہوں۔۔۔ مجھے تو بس اس بات کا تجسس ہو رہا ہے کہ تمھیں یہ نیکلس آخر کہاں سے ملا ہے اور بس۔

بیٹی: حقیقت تو یہی ہے کہ میں نے اس کو چرایا ہے، یہ تمھارا ہی ہار ہے۔۔۔ غالباً۔

ایلس: میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کہوں، دماغ شل ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے اگر یہ میرا ہے تو تم یہ فوراً مجھے لوٹادو۔

بیٹی: کیا۔۔۔ تمھیں واپس لوٹا دوں۔۔۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟ اِتنی مشکل سے تو چرایا تھا میں نے، اب میں تمھیں واپس کر دوں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ یہ بھی خوب کہی۔

ایلس: لیکن تم کہہ چکی ہو کہ یہ میرا ہے۔

بیٹی: ٹھیک ہے، یہ تمھارا ہی ہوگا لیکن یہ مجھے بہت پسند ہے۔ میرے پاس بھی پانچ چھ برس پہلے ایسا ہی ہار ہوا کرتا تھا لیکن پھر وہ گم گیا تھا۔ جب میں نے بالکل ویسا ہی ہار تمھارے پاس دیکھا تو رہ نہ سکی اور اسے اُڑا لیا۔۔۔ اور یاد رکھو، میرا اِسے تمھیں واپس کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔۔۔ سمجھیں!

ایلس: لیکن یہ تمھارا نہیں ہے۔۔۔ میں تمھیں اس ہار کو چرانے کے جرم میں گرفتار بھی کرواسکتی ہوں۔۔۔ اس کی چوری کا اعتراف تو تم خود کرہی چکی ہو۔

بیٹی: ارے یہ مجھ سے کیا حماقت سرزد ہوگئی۔۔۔ بھلا یہ راز اُگلنے کی کیا ضرورت تھی مجھے، تم کون سی پولیس انسپکٹر لگی ہوئی ہو۔۔۔ بہرحال، اگر میں یہ تمھیں واپس لوٹادوں تو کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ تم نے اسے کہاں سے خریدا تھا، تاکہ میں بھی اپنے لئے وہاں سے ایک ایسا ہی اور ہار خرید سکوں۔

ایلس: اور اگر میں نہ بتاؤں تو؟

بیٹی: تمھاری مرضی، لیکن یاد رکھو پھر میں تمھیں یہ ہار واپس بھی نہیں کروں گی۔

ایلس: تمھیں یہ ہار ہر صورت لوٹانا پڑے گا، میں پولیس کو بلوا لوں گی۔

بیٹی: ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن پلیز پلیز مجھے بتادو کہ تم نے یہ کہاں سے خریدا تھا۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ میں جنون کی حد تک اس کی شیدائی ہوں۔ یقین مانو، میں نے اپنے نیکلس کو مدتوں اپنے گلے سے جدا نہیں کیا تھا۔ یہ کئی سالوں سے میری دل کی دھڑکنوں کا ساتھی رہا ہے۔

ایلس: تم نے اپنا ہار کہاں گم کر دیا تھا؟

بیٹی: پتہ نہیں، میں نے اپنا ہار ایک بار شہر کے زنانہ ہاسٹل میں نہاتے ہوئے اُتارا تھا اور وہیں بھول گئی تھی۔ بعد میں جب مجھے یاد آیا تو میں دوڑتی دوڑتی وہاں گئی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہار کو نہ ملنا تھا سو نہ ملا۔ پلیز مجھے بتادو کہ تم نے یہ ہار کہاں خریدا تھا، میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھیں تمھارا ہار واپس کردوں گی۔

ایلس: میں تمھیں نہیں بتاسکتی۔

بیٹی: لیکن کیوں؟

ایلس: ارے تو کیا تم مجھ پر الزام لگارہی ہو کہ میں نے اِسے چرایا ہے؟

بیٹی: نہیں، بالکل بھی نہیں۔

ایلس: تو پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ سچ پوچھتی ہو تو مجھے یہ وہیں سے ملا تھا۔۔۔ وہیں گرلز ہاسٹل سے، جہاں تم اسے بھول گئیں

تھیں۔۔۔ یہ یقیناً تمھارا والا ہی ہے، میں نے جب اِسے دیکھا تو اس سنہرے چمکدار ہار کا جادو اس قدر مجھ پر چڑھ گیا کہ میں اِسے اُڑائے بغیر رہ نہ سکی۔ اگر چہ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں اِسے پولیس کے حوالے کردیتی تاکہ وہ اس کی مالکہ کو ڈھونڈ کر اس کی امانت اس کو لوٹا دیتی لیکن۔۔۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، مجھ سے ایسا کیا ہی نہ گیا۔

بیٹی: اور تم نے اسے چُرا لیا؟

ایلس: مجھے افسوس ہے۔

بیٹی: لعنت ہو۔۔۔ہم گھوم پھر کر پھر اُسی بند گلی میں پہنچ گئے، اب بھی مجھے پتہ نہیں کہ اسے کہاں سے خرید پاؤں گی۔

ایلس: ارے نہیں، اب تمھیں نیا ہار خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی، یہ تمھارا ہی تو ہے۔۔۔ میں ہی اس سے محروم رہ جاؤں گی۔

بیٹی: ایں۔۔۔ ارے ہاں، تم ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہو، یہ تو ہے ہی میرا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تو پھر اللہ حافظ۔

ایلس: ٹھہرو۔۔۔ کیا یہ ہار واقعی تمھارا ہے؟

بیٹی: ظاہر ہے۔

ایلس: تو کیا یہ تم نے خود خریدا تھا یا کسی نے تحفے میں دیا تھا۔

بیٹی: پتہ نہیں۔۔۔ اب تو میں بھول بھال گئی ہوں، پندرہ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اس بات کو۔

ایلس: دیکھو مجھ سے اُڑنے کی کوشش مت کرو، تمھیں اچھی طرح یاد ہے۔۔۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ ہار کہاں سے خریدا تھا۔

بیٹی: یقین مانو، مجھے بالکل بھی یاد نہیں۔۔۔ بتا رہی ہوں ناں کہ بہت عرصہ ہوگیا ہے اس بات کو۔

ایلس: مجھے تمھاری بات پر بالکل بھی یقین نہیں۔۔۔ دیکھو، جس طرح تمھیں یہ ہار پیارا ہے ویسے ہی مجھے بھی پیارا ہے۔۔۔ پلیز مجھے بتادو کہ تم نے یہ ہار کہاں سے خریدا تھا۔

بیٹی: سوری۔۔۔ مجھے یاد نہیں (جانے لگتی ہے)

ایلس: آہا، اب میں سمجھی۔۔۔ تم نے یہ کسی کا چرایا تھا، کیوں صحیح کہہ رہی ہوں ناں میں؟

بیٹی: میں کہہ رہی ہوں ناں کہ مجھے یاد نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے اب مجھے تنگ نہ کرو، میں جا رہی ہوں۔۔۔

ایلس: ٹھیک ہے، شوق سے جاؤ، لیکن مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے، مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم نے خود یہ ہار کسی کا چرایا ہوا ہے۔۔۔ تم مان کیوں نہیں رہی ہو کہ تم نے یہ چوری کیا تھا۔

بیٹی: فضول باتیں نہ کرو، مجھے کیا ضرورت ہے کچھ ماننے یا نہ ماننے کی۔۔۔ خدا حافظ (جانے لگتی ہے)

اپریل: (گلی سے گزرتے گزرتے رُک جاتی ہے اور تیر کی طرح بیٹی کی طرف آتی ہے) ارے، یہ ہار تم کو کہاں سے ملا؟

(بیٹی دوڑ لگا دیتی ہے)

(بلیک آؤٹ)

پدری زبان

جوش نے پاکستان میں ایک بہت بڑے وزیر کو اُردو میں خط لکھا لیکن اس کا جواب اُس نے انگریزی میں دیا۔ جواب میں جوشؔ نے انھیں لکھا ”جناب والا، میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا تھا۔ لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔“

محمد عارف

جیپ جنازہ

رات بالاکوٹ کے ایک بلند و بالا گیسٹ ہاؤس میں گزری جو ایک پہاڑ کے دامن میں تھا۔ رات دیر تک گپیں ہانکنے کے باوجود صبح نماز کے لیے ”مولوی احباب“ نے انھیں بھی جگا دیا جو جمعے یا عید والے تھے۔ سویرے جاگنے، جگانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم لوگ بارہ سے پہلے ناران پہنچ کر آج ہی جھیل سیف الملوک جانا چاہتے تھے۔ ناشتے کے بعد تصویر کشی اور خود کشی یعنی سیلفی سیشن کے بعد دو کوسٹروں پر مشتمل قافلہ روانہ ہوا۔ کاغان میں انتہائی مختصر قیام کے بعد ناران جا کر دم لیا۔ کوئی ساٹھ کے قریب لوگ تھے، اتنے زیادہ لوگوں کا قیام و طعام ایک الگ مسئلہ تھا، چند احباب کو اس کام پر معمور کر کے باقی لوگوں کو جھیل جانے کا عندیہ دے دیا گیا۔ ہفتے کا دن تھا، دن کے بارہ بجے تھے، موسم کھلا ہوا تھا اور ناران میں جھیل سیف الملوک کے جیپ اسٹینڈ پر جیپیں شارٹ ہو چکی تھیں، سب یکے بعد دیگرے نکلنے کے چکر میں تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ آٹھ دس جیپیں بہ یک وقت موجود نہ تھیں، جو چار پانچ تھیں، ان میں سے بھی دو ہم سے بعد میں آنے والی ایک پارٹی ہائر کر چکی تھی۔ اب ہر گروپ کو الگ کر کے اپنے طور پر جانے کا ”گو ہیڈ“ دیا گیا، کئی گروپ نکلے تو ہمارا گروپ اور دوسرے گروپوں میں ایڈجسٹ نہ ہونے والے چار چھے تنگ باقی رہ گئے، جن میں سے کچھ واقعی تنگ ہونے کے باعث خوار ہو رہے تھے، اب صورتِ حال یہ تھی کہ دُور دُور تک کوئی جیپ نظر نہ آتی تھی، سو بیش تر احباب ”سن بلاک“ ملتے، مٹر گشت کرتے تھے۔۔۔

تھوڑی دیر بعد غربی سڑک سے ایک مسلسل چنگھاڑ سنائی دینے لگی، پھر کسی عجیب و غریب جیپ نما گاڑی کے خدو خال واضح ہونے لگے۔ یہ گاڑی، شور مچاتی، تھرتھراتی، ہانپتی کانپتی اور گڑگڑاتی بہ مشکل ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر رکی، گرد و غبار تھما تو محسوس ہوا کہ یہ مشین کسی زمانے میں جیپ رہی ہے یا ڈارون کی تھیوری کے مطابق مسلسل ارتقا پذیر تو ہے لیکن ابھی تک جیپ کی معراج تک نہیں پہنچی۔ یہ ماڈرن جیپ کے مقابلے میں بالکل یوں لگ رہی تھی جیسے انسان کے مقابلے میں کوئی گوریلا۔ ہم نے اس پر ایک نگاہِ غلط ڈال کر دوسری نگاہ ڈالنا گوارا نہ کیا۔ یکا یک اس کے ”ڈالے“ سے ایک صاحب انھیں ”صاحب“ تو نہیں کہنا چاہیے، بندر کی طرح ٹپکے اور ہماری سمت آتے آتے سوال کیا ”جھیل جائیں گے؟“

ہماری طرف سے کسی نے جواب دیا ''جی''
''آئیں پھر''
''کس پہ جائیں گے؟'' ہماری طرف سے سوال ہوا۔
اُس نے اسی جیپ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔
''یہ کبھی جھیل گئی ہے؟''
''یہ جھیل جاسکتی ہے؟''
''یہ جھیل چلی جائے گی؟''
اس نے ہمارے سوالات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا
''آپ کتنے لوگ ہیں؟''
''چودہ ہیں۔''
اِدھر اُدھر دیکھا، دور دور تک کسی اور جیپ کا نام و نشان نہ پا کر ہم نے اس کی آفر کو سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا۔
''کتنے لوگ لے جائیں گے آپ؟''
''سارے''
''ہیں'' بیک وقت کئی لوگوں کی ''ہیں'' نکلیں۔
''چلیں جائیں گے آپ بے فکر رہیں، جیپ میں سیٹیں نہیں ہیں، جگہ بچ بھی جائے گی!'' اس نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا۔
''کرایہ کیا ہوگا؟''
''دو سو روپیہ فی کس'' یہ کہتے ہوئے اس نے مظہر اور عدنان کی طرف یوں دیکھا جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو۔
نہیں جناب ہم ''پر ہیڈ'' نہیں دیں گے، آپ یک طرفہ کرایہ بتائیں؟
''۳۰۰۰ دے دیں۔''
''فی کس کے حساب سے ہی چلے جائیں گے، جوں ہی بات پکی ہوئی ایک ہاہا کار مچی اور سب اس جیپ نما ٹرک یا ٹرک نما جیپ پر سوار ہوگئے۔''
''ہاں جی اپنا اپنا کرایہ دے دیں۔''
''راستے میں لے لینا''
''جناب یہ تیل پر چلتی ہے۔''
''ہم نے کب کہا ہے کہ پانی پر چلتی ہے۔'' ہماری سائیڈ سے کسی نے زبان دانی کے جوہر دکھائے کہ ایک سے ایک زبان دراز ہمارا ہم رکاب تھا۔
''آپ کرایہ دیں گے تو تیل ڈلے گا اور گاڑی جھیل تک جائے گی۔''
''پکی بات ہے، جائے گی نا؟''
''اللہ دی قسمے'' یہ بھی کوئی اپنی سائیڈ کا تھا۔
کرایہ وصول پانے کے بعد موصوف نے ڈرائیور سے کین لیا، سامنے کی دُکان سے بھروا کر بونٹ اُٹھا، انجن کے حلق میں انڈیل دیا اور دوبارہ بھروا کر استاد کو دے دیا، جس نے بہ مشکل اسے اپنی بائیں جانب پاؤں میں رکھ لیا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے شکر ادا کیا کہ فرنٹ سیٹ پر فیصل بھائی اور شاہ جی بیٹھے ہیں۔ استاد نے جوں ہی چابی گھمائی تو یوں لگا جیسے کوئی شخص ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے مسلسل چیخ و پکار میں مصروف ہو، ایک گھن گرج کے ساتھ جیپ کا رُواں رُواں متحرک اور زور و شور سے شور مچانے لگا۔ جیپ نے تھر تھراتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا تو ہمارے ساتھ مذاکرات کرنے والا کنڈکٹر بھی پائیدان کے ساتھ لنگور ہو گیا، اب اس جیپ پر اگر یہ جیپ ہے تو ڈرائیور سمیت، اگر وہ ڈرائیور ہے تو، یا نہیں تو بھی ۱۶ لوگ ہو چکے ہیں، اگر یہ سب لوگ ہیں تو۔۔۔
بات تو اس نے ٹھیک کی تھی کہ جگہ بچ بھی جائے گی، اور جگہ بچ بھی گئی تھی، چار چھے اور پھنسائے جا سکتے تھے، سارے کھڑے تھے کہ نہ سیٹیں تھیں اور نہ دریاں۔۔۔ اب جو لوگ درمیان میں تھے وہ کھڑے ہونے کے باوجود بھی ارد گرد کے نظاروں سے محروم ہیں۔ دفعتاً میری نظر جیپ کی فرنٹ سیٹ کے چھت پر بنے کیبن پر پڑی، ایسا کیبن جیپ میں تو نظر نہیں آتا البتہ ''بیڈفورڈ ٹرکوں'' میں لازم و ملزوم ہے۔ میں اس کیبن پر چڑھ کر بیٹھ گیا مجھے مزے میں دیکھ کر شہریار بھی میرے ساتھ آ بیٹھا یعنی یک نہ شد۔۔۔ اب ہم بیٹھے ہوئے تو ضرور تھے لیکن پتریوں کا چھت ''تشریف'' پر نقش ہوتا تھا، ایک دو بار پہلو بدلے اور بالآخر ٹانگیں اگلی سائیڈ سے گرا کر پرسکون ہوگئے۔ جوں ہی ہم پرسکون ہوئے جیپ بے چین ہو کر دائیں بائیں جھولنے لگی، کنڈکٹر نے چھلانگ لگائی اور جیپ

سے آگے نکل کر دیکھا تو پتا چلا آگے ونڈ سکرین پر چار عدد ٹانگیں لٹک رہی ہیں اور استاد کھڑکی سے سر نکالے نہ صرف جیپ ڈرائیو کر رہا ہے بل کہ ٹانگوں کے قبضیے پر نقار خانے میں توتی بھی بجائے جا رہا ہے، خیر ہم نے کنڈکٹر کے ''توجہ دلاؤ نوٹس'' پر اپنی ٹانگیں تہہ کر کے تشریف کے نیچے رکھ لیں۔

یہ جیپ عام جیپوں سے کافی اونچی ہے، میں اور شہر یار اس کے چھت پر ہیں، نیچے'' ڈالے'' میں دو قطاریں تھیں، ایک میں مظہر، عدنان، نعیم، زاہد، عمر اور مظہر خان تھے اور دوسری میں عمران، کرامت، فیاض، عبدل اور کوئی ایک ادھ نگ مزید بھی تھا، صبح بھاگ دوڑ میں دانت صاف کرنے کا وقت نہیں ملا تھا، اب کچھ آسودگی میسر آئی تو یاد آیا ایک عدد مسواک ہماری جیب میں محوِ استراحت ہے، اسے نکالا، چبا کر نرم کیا اور جیسے ہی پچکاری ماری، احتجاج کی کئی آوازیں بہ یک وقت بلند ہوئیں جن میں سے سب سے نمایاں آواز مظہر کی تھی ''کیا بے غیرتی ہے یار!''

''کیا بے غیرتی ہے؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے سوال دہرا دیا۔

''سارا تھوک ہمارے چہرے پر آ رہا ہے، یہ کام بعد میں نہیں ہوسکتا؟''

''میں جھیل پر پہنچنے سے قبل یہ کام مکمل کرنا چاہتا ہوں۔'' ہم نے جواب دیتے ہوئے پچکاری ماری، اب کے جیپ ایک موڑ مڑ رہی تھی، لہٰذا کچھ نہ پوچھیے، وہ ہاہا کار مچی کہ خدا کی پناہ۔ مسواک ہم نے تیس روپے میں خریدا تھا، سو احتجاج نظر انداز کر کے قدرے محتاط انداز میں پیسے پورے کرنے کا شغل جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن جان بچانا بھی تو فرض ہے نا، سو جان بچالی۔

ہم سے لاتعلق، بندر کی طرح دائیں بائیں جھولتا، جیپ کے پائیدان کے ساتھ لٹکا کنڈکٹر، کسی بھی سخت مقام پر چھلانگ لگا کر پتھر اٹھائے جیپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا تھا۔ تین کلومیٹر کے کچے رستے پر جیپ خراماں خراماں ہی سہی چل رہی تھی جس کا اندازہ دھوئیں کی اس لکیر سے بھی ہو رہا تھا جو ''لکیری جہاز'' کی طرح جیپ پیچھے چھوڑے جا رہی تھی۔

کچے راستے کے آغاز پر ہی جیپ کے ہچکولے اور ہچکیاں بڑھ گئیں، دھوئیں کی لکیر جو پہلے کسی سانپ کی طرح سلم اور سمارٹ تھی اب اژدھے کا روپ دھار چکی تھی، جیپ دھاڑ رہی تھی، جھول رہی تھی، ہانپ رہی تھی، شاید گھسٹ بھی رہی تھی، پیچھے سے آنے والی کئی جیپوں نے ہمیں کراس کیا اور نگاہوں سے اوجھل ہوئیں تو احساس ہوا تھوڑا صبر کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ایک موڑ مڑنے کے بعد جیپ کا رخ اُس گلیشیئر کی طرف ہو گیا جو نشیب کی جانب تھا، جیپ کی رفتار بڑھ گئی، شور مزید بڑھ گیا یوں لگا جیسے استاد کے ایکسی لیٹر والے پاؤں پر فیصل بھائی نے بھی اپنا پاؤں رکھ دیا ہو، اب صورتِ حال یہ تھی کہ جیپ اپنی بساط بھر رفتار سے گلیشیئر کی جانب اُڑی جا رہی تھی، لگتا تھا کہ استاد بمع جیپ خودکشی کے چکر میں ہے، یک دم بریک کی خوف ناک چنگھاڑ گونجی، ''ڈالے'' والے ایک دوسرے سے ٹکرائے، ہم بونٹ پر جاتے جاتے رہ گئے اور یقیناً فیصل بھائی اور شاہ جی نے بھی ونڈ سکرین سے نکلنے کی کوشش کی ہوگی۔ جیپ رکی تو اس کی ایک سائیڈ سُرنگ ہوتے گلیشیئر کے منہ میں چلی گئی۔ جیپ کے بونٹ پر گلیشیئر سے ٹپکنے والی بوندیں پڑیں تو بھاپ اُٹھنے لگی۔ ہم لوگ نیچے اُترے تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شاہ جی اور فیصل بھائی بھی نیچے آ چکے تھے۔ فیصل بھائی شدید غصے میں، اُترتے ہی پوچھنے لگے ''یہ جیپ کس نے ہائر کی تھی؟''

''پتا نہیں''

''بندہ دیکھ تو لیتا ہے، اس جیپ کی حالت ہے چلنے کی۔''

''فیصل بھائی! پہلی بات تو یہ کہ آپ ہمارے گروپ کے نہیں اور دوسری بات یہ جیپ ہائر نہیں کی گئی بل کی ''پر ہیڈ'' پر بات ہوئی ہے، اس لیے سب ذمہ دار ہیں اور بات ابھی پوری طرح ڈن بھی نہیں ہوئی تھی کہ آپ نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی تھی۔''

اس بات پر فیصل بھائی قدرے ملائم ہو گئے ''یار! اس جیپ کا تو حال ہی کوئی نہیں، استاد چڑھائی پر فور بائی فور گیئر لگاتا تو وہ ایک جھٹکے سے سلپ ہو کر نکل جاتا ایک بار تو جیپ پیچھے جانے لگی تھی۔''

میں نے استاد کی طرف دیکھا تو استاد نے دوبارہ گیئر لگا کر کہا کہ اس کو اسی پوزیشن میں پکڑے رکھو، اب یہ نکلے ناں، پچھلے آدھے گھنٹے سے میں اسی کام پر معمور ہوں۔

''میں اکّے باساں'' عمر نے آواز لگائی۔

فیصل بھائی نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''میرا تو کندھا درد کرنا شروع ہوگیا ہے۔''

کسی نے پھر جملہ کسا ''اس طرح تو ہوتا ہے اُسترے کے کاموں میں'' اور عارف بھائی، استاد۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے یہ شاگرد بھی نہیں ہے۔۔۔

اِتنے میں ڈرائیور سائیڈ کا دروازہ کھلتا ہے، استاد نے اپنے اُلٹے ہاتھ سے اپنی سیدھی کلائی پکڑی اور اسے اسٹیرنگ سے اُٹھا کر پہلو میں رکھا پھر اسی طرح اس نے اپنی سیدھی ٹانگ پکڑ کر اسے گاڑی سے باہر لٹکایا، پھر بمشکل تمام چھلانگ لگا کر سڑک تک آیا، استاد کھڑا ہوا تو اس کا سارا دایاں حصہ جھولتا پایا، دائیں بازو میں تو لرزا اور بھی شدید تھا جس کے اثرات چہرے پر بھی دیکھے جا سکتے تھے۔

کنڈکٹر ایک سر کٹے کین سے گلیشیر کا یخ پانی انجن پر انڈیل کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جیپ کی اگلے بمپر کے اوپر کالی نمبر پلیٹ پر سفید رنگ سے GLT-3219 لکھا ہے۔ ہم نے بونٹ کے اندر جھانک کر دیکھا تو اندر انجن، تاروں اور ''جگاڑوں'' کا ایک عجیب گورکھ دھندا نظر آیا، جیپ کا جگہ جگہ سے اُکھڑا رنگ آسمانی ہے، نیچے بیش تر رنگوں کی قوسِ قزح اس کی عمر کا پتا دیتی تھی، اس کے علاوہ اس جیپ کے شاک عام جیپ سے ازحد اونچے ہیں، ''ڈالے'' کے منظر سے لگتا ہے جیسے اس میں چھوٹے بڑے جانور سپلائی کیے جاتے ہوں، ویسے اب بھی کچھ ایسا ہی منظر ہے۔ پانی کے ٹھنڈے دھارے گرنے سے جیپ کی غراہٹ کم ہوتی جا رہی ہے، پھر کنڈکٹر نے بونٹ گرا دیا، استاد بمشکل سیٹ تک پہنچا، سب اپنی اپنی جگہ ایستادہ ہوئے اور جیپ رواں ہوگئی، راستے میں ایک بار جیپ ریورس ہوتی، پہاڑ سے نیچے جانے لگی تھی، یقیناً گیئر فیصل بھائی کی گرفت سے نکل گیا ہو گا، ذرا آگے گئے تو ایک گڑھے میں جیپ کا اگلا پہیہ گم ہوگیا، جیپ اگلے دائیں اور پچھلے بائیں پہیے پر تھی، اگلا پہیہ گڑھے میں اور پچھلا ہوا میں تھا اور جیپ دو پہیوں پر ''سی سا'' کرتی تھی، ایکسی لیٹر بڑھتا تو جیپ جھولتی ہوئی اگلے بمپر تک گڑھے میں چلی جاتی، یک دم ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھا دیا گیا، جیپ کی آہ و فغاں مزید بڑھ گئی استاد نے جھٹکے سے پہیہ گڑھے سے نکالنے کی کوشش کی تو جیپ الٹتے الٹتے بچی، غلطی کنڈکٹر کی تھی، وہ استاد کو اشارے کر کے غلط سائیڈ پر زور لگوا رہا تھا۔۔۔ بالآخر کئی گھنٹوں کی ذلالت کے بعد جھیل تک پہنچے، تب پتا چلا کہ اس جیپ کے ڈرائیور کو بھی فالج ہے۔

۔۔۔جھیل پر کئی گھنٹے گزار کر واپسی کی راہ لی تو یہ جیپ وہیں کھڑی ملی، استاد ماتھا اسٹیرنگ پر رکھے بیٹھا تھا اور کنڈکٹر بولایا بولایا پھرتا تھا، ہم لوگ نظریں چُرا کر گزر گئے۔۔۔ جلد ہی ہمیں ایک جیپ مل گئی یہ نئے ماڈل کی تھی لیکن اس نے بھی ہمیں بہت تنگ کیا، کیوں کہ اس میں سیٹیں تھیں، سو جگہ تنگ تھی کہ واپسی بھی اکلوتی جیپ پر ہوئی۔۔۔ آج بہت دنوں بعد اُس جیپ کی یاد آئی، پتا نہیں بے چاری واپس بھی آ سکی کہ نہیں، اب کے سیف الملوک گیا تو دیکھوں گا، شاید اب بھی ہمارے انتظار میں ہو۔۔۔ ہم جیسے مسافر روز روز کہاں میسر آتے ہیں۔

ارمان یوسف

لندن ایکسپریس
باب اوّل

یہ ہے مظفر گڑھ

دریائے چناب اور سندھ کے درمیان واقع شہر مظفر گڑھ نہ صرف پاکستان کے مرکز میں واقع ہے بلکہ آبادی اور رقبے کے لحاظ سے ملک کا سب سے بڑا اور سب سے پرانا ضلع بھی ہے۔علی پور، جتوئی، کوٹ ادو اور مظفر گڑھ سمیت چار تحصیلیں ہیں۔یہاں کا موسم شدید گرم اور شدید سرد ہوتا ہے۔موسمِ گرما میں اگرچہ گاڑیوں کے شور شرابے، دھوئیں اور تپتے سورج کی موجودگی میں خود کو دریافت کرنا بھی خاصا مشکل کام ہے مگر ذرا سی جواں مردی کا مظاہرہ کر کے آپ شہر کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ٹھنڈے ٹھار شربت والی ریڑھیوں کے پہیے سے لگے گھنگروں کی مدھر آواز اور ٹیپ ریکارڈ پہ بجتے سرائیکی گانوں، شربتوں اور ''راؤ'' (گنے کے رس) کے قصیدے ایسا سحر طاری کر دیتے ہیں کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی ''چاچا ایک گلاس دینا'' کی صدا لگا کر ریڑھی کی ٹین کی بنی چھت کے نیچے پناہ لے لیتے ہیں۔

اور اگر آپ ذرا وکھری ٹائپ کی عیاشی کرنے کے موڈ میں ہیں اور جان کا خطرہ بھی مول لے سکتے ہیں تو ''سواری اپنے سامان کی حفاظت خود کرے'' کے سنہری اصول پر عمل پیرا ہو کر دوپہر کے وقت قریبی گاؤں کے کسی آموں کے باغ میں عین اس وقت جا گھسیے جب باغ کا رکھوالا گھڑی بھر کے لیے آنکھیں موندے لیٹا ہو۔اپنی قمیض اتار کے بازو اور گلے پہ گانٹھ لگا کے ایک دیسی تھیلا تیار کر لیجیے جسے اگلے ہی لمحے آپ دنیا کے مزیدار آموں سے بھر سکتے ہیں۔ساتھ میں لسی کا انتظام بھی ہو جائے تو کیا کہنے۔چناب کے کنارے بیٹھ کے کھائیے بھی اور غوطے بھی لگائیے،اس سے عمدہ تفریح کا یہاں ملنا ممکن نہیں۔مگر ٹھہریئے، رہنے ہی دیجئے آپ سے یہ سب نہیں ہو پائے گا لہٰذا گنے کے جوس پر ہی اکتفا کیجئے۔چاچا دینے کی ریڑھی کے ساتھ ہی سڑک کے دونوں جانب بعض درختوں کے سائے میں اور بعض کپڑے کی بنی چھتری کے نیچے بیٹھے چائنہ کے موبائل اور ریڈیو بیچنے والوں کی ایک قطار سی نظر آتی ہے جن میں اکثریت پٹھانوں کی ہے۔خریداری کرتے لوگوں کی ریل پیل، مگر خیال رہے سیاہ رنگ کے آنچل سے جھانکتی بلوری آنکھوں پہ نہ جائیے گا ورنہ عشق کا روگ بھی لگ سکتا ہے۔یہاں ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں۔کہیں آس پاس آنا جانا ہو تو شاہی سواری رکشہ حاضر ہے جس کے آگے تو موٹر سائکل نصب ہوتی ہے جب کہ پیچھے گنے والی ریڑھی سے ملتی جلتی چار پہیوں اور دو لمبی سیٹوں والی ایک بگھی سی لگی ہوتی ہے جسے درمیان میں سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، یہ بھی تقسیم ہندوستان کی مانند ہے کیونکہ آدھی سواریوں کا جس طرف رخ ہوتا ہے اسی طرف بقیہ کی پیٹھ، کبھی نہ ملنے والے دریا کے دو کناروں کی

عاشق نے ہمیشہ محبوب کو ملزم سمجھا، اس پر اپنے اسپیئر پارٹس کی چوری کا الزام لگایا۔ دل، جگر، نیند وغیرہ کی گمشدگی کا پرچہ بھی محبوب کے نام کٹوایا، یہاں تک کہ اس کو سرِ عام قاتل کہا۔ اس دنیا میں جلسے جلوسوں کا بانی بھی عاشق ہی ہے کہ اس نے سب سے پہلے محبوبہ کا جلوس نکالا۔

عاشق، شاعر اور پاگل تینوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ خود کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس دنیا میں جس شخص کی بدولت عاشق کی تھوڑی بہت عزت ہے وہ رقیب ہے۔ جب رقیب نہیں رہتا تو اچھے خاصے عاشق اور محبوب میاں بیوی بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں رقیب اور عاشق کی بھی نہیں بنتی حالانکہ رقیب ہی تو دنیا کا واحد شخص ہوتا ہے جس سے اس کا اتفاق رائے ہوتا ہے، جسے عاشق پسند کرتا ہے وہ بھی اسے پسند کرتا ہے، جسے یہ منتخب کرتا ہے وہی اس کا انتخاب ہوتا ہے، یہی نہیں وہ بھی اس پر جان دیتا ہے جس پر عاشق۔ بلکہ سچا اور حقیقی عشق تو ہوتا ہی وہ ہے جس میں رقیب ہو۔

ڈاکٹر یونس بٹ

طرح۔ رکشے والے اس قدر مہربان کہ آپ کے بازو سے پکڑ کر رکشے پر بٹھائیں گے اور ابھی چلے کہ کر دوسروں کو شکار کرنے چل پڑیں گے۔ رہبری کا یہ شوق تمام رکشہ ڈرائیوروں کی فطرتِ ثانی ہے۔ بعض اوقات اسی کشمکش میں آپ خود تو کسی اور رکشے میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں جبکہ آپ کا سامان کسی اور میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سے پورے ملک سمیت قرب و جوار کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو مختلف قسم کی بسیں اور ویگنیں بھی نکلتی ہیں۔ آپ چند قدم آگے چلیں تو نم والے اڈے سے ڈیرہ غازی خان، چوک قریشی، بصیرہ، سناواں، رنگ پور، شاہ جمال، روہیلاں والی، علی پور، جتوئی اور سیت پور کے لئے بسوں اور ویگنوں کے کنڈکٹر آوازیں لگاتے آپ کے منتظر ہوں گے۔ پندرہ کی گنجائش رکھنے والی ویگن میں ایک سو پندرہ سواریاں مونچھوں کو تاؤ دیتی، گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے سر پر رنگ دار صافہ یا رومال رکھے ویگن کے جلد یا بدیر چلنے یا نہ چلنے سے ایسے لاتعلق دکھائی دیتے ہیں گویا ویگن نہیں گھر کی چھت پر بیٹھے کبوتروں کی اڑان کا مزا لے رہے ہیں۔ ادھر ڈرائیور کی ضد کہ چند اور سواریاں مل جائیں تو چلتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین روانگی کے وقت گاڑی کا انجن ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے چپ سادھ لیتا ہے۔ ایسے میں کنڈکٹر دھکا لگا کر سٹارٹ کرنے کی گزارش کر کے چھت پہ بیٹھی سواریوں کو بھی یہ کہہ کر نیچے اتار لیتا ہے کہ "سائیں دِھکا لائیسو تاں ٹرسی" (دھکا لگائیں گے تو گاڑی چلے گی نا)

اور اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہے اور گرما گرم چائے کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو قتوان چوک سے ذرا آگے بابو کینٹین حاضر ہے۔ یہ چائے خانہ در اصل مظفر گڑھ کا پاک ٹی ہاؤس بھی ہے، جہاں ادبی محفلیں سجا کرتی ہیں۔ یہیں بیٹھ کر رضا ٹوانہ (مرحوم) اردو، سرائیکی، پنجابی گیت، نظم و غزل اور ماہیے کے شاعر افضل چوہان سلطان ناصر، سلیم ہکانی، ظریف احسن، امجد بخاری، راشد ترین، فیض رسول، نوید ستاری، شاہد عباسی، اکبر نواز، زاہد حسن، وائق امیر اور شکیل احمد سے مظفر گڑھ کا ادبی پسِ منظر بیان کرتے ہوئے پائے جاتے۔ یہاں حکیم عبد المجید راہی، مضطر بخاری، مخدوم غفور ستاری اور انور عاصی کے تذکرے ہوا کرتے اور کشفی ملتانی کا یہ شعر بھی گونجتا ؎

رند بخشے گئے قیامت میں
شیخ کہتا رہا حساب حساب

اور پھر خود رضا ٹوانہ بھی اپنے اشعار سے محفل گرما دیتے کہ:

دیکھ فرعون کے لہجے میں کوئی بات نہ کر
ہم تو پاگل ہیں خداؤں سے الجھ پڑتے ہیں

مگر یہاں کے لوگ نہ تو کبھی وڈیروں، جاگیر داروں اور سیاست دانوں کی صورت میں زمین کے خداؤں سے الجھنے کا حوصلہ ہی کر پائے اور نہ فرعون کے لہجے کو موسیٰ کی ہدایت ہی میں بدل سکے۔ یوں تو انھیں سرداروں کے حضور سرائیکی خطے کی یہ ملنسار، بھلے مانس اور تابع فرمان عوام ہمیشہ ہی سرِ تسلیم خم رہتی ہے مگر بطورِ خاص اپنی زندگی بھر کی خدمات کے عوض سالانہ گندم وغیرہ حاصل کرتے ہوئے ان کی کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو جاتا

ہے۔سیاست دان اور وڈیرے پانچ سالوں میں صرف ایک بار ووٹ مانگنے کی غرض سے ان سے مخاطب ہوتے ہیں وہ بھی اگر خوش قسمتی سے ملک میں مارشل لا نہ ہوتو۔یہی وجہ ہے کہ زرخیز خطہ ہونے اور ملوں، فیکٹریوں، تھرمل پاور اور آئل ریفائنری کے باوجود بھی ناخواندگی، غربت اور بیروزگاری کی شرح یہاں پورے ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ملک کے سب سے بڑے اور سب سے قدیمی ضلعے میں ایک بھی یونیورسٹی نہیں۔ہاں البتہ پرائیوٹ ہسپتالوں کی طرح پرائیویٹ سکولوں کی بھی بھرمار ہے۔یہ بھی ایک قومی المیہ ہے کہ سرکاری سکولوں اور ہسپتالوں سے عوام اعتماد اٹھ گیا ہے جس سے بھانت بھانت کے پرائیوٹ ادارے کھل گئے ہیں اور عوام پر اضافی بوجھ ڈال رہے ہیں۔ہوا یوں کہ سرکاری اداروں کی کارکردگی نہ ہونے کے باعث لوگ پرائیوٹ خدمات حاصل کرنے لگے،اگر سرکاری اداروں کی بہتری کی طرف توجہ دی ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔بہرحال مظفرگڑھ کو اعلیٰ معیار کے تعلیمی اداروں کی نسبت سے ''شہرِ علم'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ پاکستان بھر سے طلبا یہاں کے سکولوں میں پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔یہاں مسجدوں کی بھی بھرمار ہے جو عیدین اور جمعہ کے موقع پر ہی بھر پاتی ہیں۔بعض جگہ تو مسجد میں موجود نمازیوں کی تعداد کے برابر بھکاری بھی دروازے پر موجود ہوتے ہیں۔

رضا ٹوانہ اور ہمنواؤں کے علاوہ اور بھی کئی شاعر اور ادیب اپنے وسیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔کوٹ مٹھن کے صوفی بزرگ اور روحانی شخصیت خواجہ غلام فریدؒ کے کلام میں علاقے کی روایات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ خودشناسی اور اطاعتِ الٰہی کا پیغام بھی ملتا ہے۔وسیب کے ممتاز شعرا میں سائیں احمد خان طارق ،عزیز شاہد،مشتاق سبقت، جانباز جتوئی، اصغر گورمانی، شازیہ خان، اوصاف نقوی، عشرت عابدی،نسیم علی پوری اور کئی دیگر شعرا شامل ہیں۔

لو جناب!شاعروں کا ذکر ہو اور مظفرگڑھ کے سیاست دانوں کا تذکرہ نہ ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔یہاں سب سے پہلے میں نام لوں گا بابائے جمہوریت کا لقب پانے والے، منجھے ہوئے سیاست دان جناب نوابزادہ نصراللہ خان کا کہ جنھوں نے جمہوریت کی بحالی کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔ان کے علاوہ عالمی شہرت کے حامل کئی سیاست دانوں کا نام بھی مظفرگڑھ کی سیاسی لوح پر کندہ ہے جن میں ملک غلام مصطفیٰ کھر،نواب مشتاق احمد گورمانی،سردار عبدالحمید خان دستی،امجد حمید خان دستی،عبدالقیوم خان جتوئی،حنا ربانی کھر،نوابزادہ منصور احمد خان،جمشید احمد خان دستی اور معظم علی جتوئی۔

قسطوں قسط

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

واٹر پمپ مارکیٹ

چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں اور عظیم شخصیات کے تذکروں پر مبنی ایک عظیم تحریر

اور اب ذرا واٹر پمپ مارکیٹ سے ملحقہ تعلیمی اداروں کی بات ہو جائے۔ ستر کی دہائی میں واٹر پمپ فیڈرل بی ایریا اور مارکیٹ کے اطراف میں نجی اسکولوں کی تعداد برائے نام تھی، بلاک سترہ میں ایک نجی اسکول ''خواجہ حسن نظامی'' قائم تھا جسے سرکاری ریٹائرڈ اساتذہ چلایا کرتے، اُن اساتذہ کرام میں مسز منورہ ہاشم، مسز ثریا بیگم اور دیگر شامل تھے۔ سر الطاف بھی ہوا کرتے، مس نفیس بھی ہوا کرتیں تو بعد میں ایچی سن کالج کی پروفیسر انگریزی بھی ہوئیں۔ بڑے قابل اساتذہ کرام تھے۔ پھر ۸۰ءکی دہائی میں واٹر پمپ پر ایک دو اسکول ''محمدی پبلک اسکول'' اور ''ایچ این پبلک اسکول'' (نزد: کاسموس پلازہ و یوسف پلازہ کے ساتھ)، رضوان صاحب کا ''میٹرو پولیٹن اسکول'' کاسموس پلازہ واٹر پمپ کے مقابل (انچولی برانچ) کے نام سے قائم ہوا۔ مس منیر زہرہ وہاں کی انچارج ہوئیں جو نصیر آباد برانچ سے آئی تھیں۔ H.N Public اسکول کی پڑھائی ایک زمانے میں اچھی تھی، اُس اسکول کی ہیڈ مسٹریس یو۔ کے اسکوائر واٹر پمپ کے K بلاک میں رہا کرتی تھیں، میرا فلیٹ بھی اسی بلاک میں تھا۔ جب ۱۹۸۲ء میں ہم نے بی ایس سی کیا تو اسکول ماسٹری کی درخواست ایچ این پبلک اسکول میں دی، اُن صاحبہ نے اور اُن کے خرانٹ شوہر نے فرمایا کہ جناب آپ تنخواہ بہت مانگ رہے ہیں (نو سو روپے مانگے تھے)، اس لئے سستا ٹیچر چاہیئے۔ ہم نے اُٹھا کے ''محمدی پبلک اسکول'' واٹر پمپ بلاک سترہ میں درخواست دے دی، وہاں کی پرنسپل مسز ای ایس اینڈریوز تھیں، مورث والا کالج سے ریٹائر ہو کر آئی تھیں، انتقال فرما گئیں، انتہائی ضعیف لیکن کردار مضبوط، ٹھوس، گوری چٹی انگریز، اُن کے ساتھ ٹیچنگ میں انگریز اسٹاف میں سر کمفرٹ مال، سر ایڈون اور مسلم اساتذہ کرام میں مسز فریدہ لقمان (دسویں جماعت کو اُردو پڑھایا کرتیں تھیں)، سر شاداب (گورنمنٹ دہلی اسکول میں تھے، پارٹ ٹائم ریاضی پڑھایا کرتے)، مسز عذرا لیباریٹری انچارج تھیں۔ مولانا محمد الیاس اللہ والے آدمی مالک تھے۔ دیگر سینئر اساتذہ میں مس شہلا کاظمی، مس شہلا فاطمہ، مس فریدہ، سر سُوری (انگریزی ادب کے سینئر استاد تھے، اُن کا بھی انتقال ہو گیا ہے) و دیگر، بہت سے نام میرے حافظے میں نہیں ہیں۔ نعیم بھائی بچوں کی فیسیں جمع کیا کرتے اور بینک میں جمع کر کے لاتے۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ درخواست کی اور ۱۹۸۳ء میں چودہ سو رُپے ماہوار پر فزکس (طبیعیات) اور ریاضی (ارتھ میٹکس) کا استاد ہوا، بہت پرانی بات، چھ ماہ بعد مستقل ہوا اور اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تو خوشی کو کوئی

ٹھکانہ نہیں، اردو ہمیشہ محبوبہ رہی تو اسکول کا رسالہ ''مشعل'' بھی شایع کیا۔اصل میں ''محمدی پبلک اسکول'' جامعۂ سندھ کے معروف اسکالراور روحانی شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان نے قائم فرمایا تھا، حاجی محمد الیاس اُن کے عقیدت مند تھے، ایک روز وہ حاجی صاحب کے بنگلے A53 بلاک سترہ واٹر پمپ تشریف لائے تو انھوں نے فرمایا کہ ہمیں تو یہاں تعلیم کی خوشبو آتی ہے، حاجی الیاس نے ایک نرسری اسکول قائم کر لیا''حنفیہ ایجوکیشنل سوسائٹی '' کے تحت، اُس اسکول نے اسّی کی دہائی میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے، آہستہ آہستہ لوئر سیکنڈری، سیکنڈری ہوا اور اب سنا ہے کہ انٹر کی کلاسیں بھی ہورہی ہیں۔ حاجی الیاس کی اولاد مالک ومختار ہے آج کل۔ بہت نفیس انسان تھے، افسوس اولادوں میں وہ بات نہ آسکی۔۱۹۹۱ء میں میری شادی ہوچکی تھی، زیادہ تنخواہ کے چکر میں، مَیں نغمہ گرلز کالج چلا گیا گلشن اقبال میں ایک پرائیویٹ کالج تھا، اب تو بند ہوگیا وہ، وہاں ایک کوچنگ سنٹر''پریکٹیکل سینٹر'' کے نام سے کھل چکا ہے شاید۔ وہاں سے میں چار سال بعد پاکستان اسٹیل کیڈٹ کالج گیا، ساتھ پٹارو کیڈٹ کالج جا کر اعزازی کلاسیں لیتا رہا، پھر آغا خان کالج میں وائس پرنسپل ہوا، تعلیمی بورڈ کا چیئرمین ہوا، ۱۹۹۳ء میں نواز شریف صاحب کی لیکچررشپ کا اشتہار شائع ہوا تو میں نے فزکس میں ایم ایس سی کے باوجود اُردو ادب میں بھی ایم اے اول پوزیشن کے ساتھ کر رکھا تھا ، میرا ایک دوست تھا، انوار الحق سومرو، وہ بھی نہایت غربت میں ٹیوشن پڑھا کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتا تھا، میں نے بھی بہت ٹیوشنیں پڑھائی ہیں، بہت کمایا، گھر کا فرنیچر لاتا تھا، خوب کھاتا پیتا تھا، کتابیں خریدتا، انوار نے مجھے مشورہ دیا کہ فزکس میں جاب کرنے کی وجہ سے تمہاری سیکنڈ ڈویژن ہے جبکہ اردو میں پہلی پوزیشن ہے، اس لئے تم سندھ پبلک سروس کمیشن اُردو کے لئے دو، میں لیکچرر تو پہلے ہی تھا اس لئے ''اسسٹنٹ پروفیسر'' BS-18 کے لئے درخواست دی، حیدر آباد سندھ میں تحریری امتحان ہوا تھا، اُس امتحان کے بعد میں دہلی کالج کریم آباد میں کوآپریٹو پڑھاتا رہا، ظالموں نے میرا وہ تجربہ کاؤنٹ نہیں کیا ورنہ آج 20 ویں گریڈ کا پروفیسر ہوتا ، خیر۔۔۔تین سال بعد ہم لوگ سرکاری ملازمت میں مستقل ہوگئے، میں نے کیڈٹ کالج کی نوکری تو پہلی ہی چھوڑ دی تھی ، سرکاری ملازمت پکّی ہونے پر آغا خان کی نوکری بھی چھوڑ دی ، حالانکہ اُس وقت سرکاری تنخواہ کچھ بھی نہ تھی، کُل چھ ہزار ملا کرتے ، اُس میں سے بھی گروپ انشورنس، فلاں کٹوتی، ڈھما کا کٹوتی ، جی پی فنڈ کٹتا رہتا، اب لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ گریڈ بیس کے لئے آپ کا نام گیا ہے۔ میں لعنت بھیجتا ہوں کہ جب بینائی، جوانی، طاقت، سب دغا دے گئے تو ایسے گریڈ کو لے کر چاٹوں گا، جب جوان تھا تو پیسہ نہ تھا، میری بیوی ایک ایک چیز کو سلیقہ سے پورا کرتی، عید بقرعید پر عزیزوں کے منہ بند کیا کرتی، گھر میں سلائیاں کیا کرتی، سخت محنتی عورت، اب پیسہ ہے تو بڑھاپا ہے، بیماریاں، دوائیاں، بچّے بڑے ہوگئے، اُن کے بچّے ہوگئے ماشا اللہ، بس یہی زندگی ہے، عمرہ اور حج کا پروگرام بناتے رہتے ہیں، اللہ مدد کرے، آپ بھی دعاؤں

اور وہی ضد کہ گیٹ تک چلو بڑے میاں۔ میں نے سوچا کون ہے؟ اندھیرا تھا۔ نظر صاف نہ آئے، سُجھائی نہ دے۔ گیٹ پر پہنچ کر اُس لڑکے نے ادب سے میری جوتیاں زمین پر رکھیں اور اپنا سر میرے آگے جھکا دیا کہ پروفیسر صاحب میرے سر ہاتھ پھیریں، میں محمدی پبلک اسکول میں آپ کا شاگرد تھا، آج کل کسی منسٹری میں ہوں۔ میں بہت خوش ہوا، دعائیں دیں اُسے، اپنی سرکاری گاڑی میں آیا تھا کسی کام سے تو مغرب کی نماز مسجد بیت المکرم میں ادا کی۔ کئی شاگرد ہیں میرے محمدی پبلک اسکول کے، پروفیسر ابوبکر حلیم چغتائی (سابق پرنسپل ڈی جے سائنس کالج) کی تین بچیاں صبیحہ، صائمہ اور وہ موٹا، کیا نام تھا اس کا منیرہ چغتائی، اقبال مالا، صائمہ اعجاز بٹ، اشتیاق، قاسم، تنویر، اللہ جانے بہت بچے تھے، یاد نہیں سب کے نام مجھے، وہ کیا نام تھا اس کا افشاں، اُس نے مجھ پر کوئی مضمون بھی لکھا تھا "ہمارے سر مجیب"، بڑی شریر لڑکی تھی، میتھ خاص نہ تھا، ٹیوشن بھی مجھ سے لیتی، اس کا بھائی بھی، جانے کیا نام تھا؟ اُن کے والد کسی بینک میں اچھے عہدے پر تھے۔ محمدی پبلک اسکول ایک علمی تحریک تھی۔ بہت مشہور ہوئے وہاں کے طالب علم، وہ دور "میرٹ پوزیشن" کا تھا، وہاں کے بچے پوزیشنیں لاتے، دیکھئے پروفیسر چغتائی کی دو بیٹیوں کے نام مجھے یاد نہیں آرہے، اُنہوں نے بھی پوزیشن حاصل کی تھی میٹرک بورڈ میں۔

واٹر پمپ مارکیٹ کے آس پاس کے فلیٹوں یوسف پلازہ، یوکے اسکوائر میں بھی نجی اسکول کھلتے اور بند ہوتے رہے۔ جیسے "گرانڈ پبلک اسکول" یوسف پلازہ، بلاک جی، میرے چھوٹے بھائی نوید ظفر انوار حمیدی نے وہاں کچھ دن پڑھا پھر محمدی اسکول سے میٹرک کیا۔ احمر اُن کا دوست تھا۔ اردو سائنس سے کالج پڑھا۔ ایم ایس سی زولوجی کیا۔

ایک تو بلاک سولہا کا "بی ایڈ کالج" جہاں سے میں نے بی ایڈ کیا تھا اور میری خالہ زاد نائلہ عارف صدیقی نے بھی وہاں سے بی ایڈ کیا تھا۔ میری بیگم سیدہ ناہید نرگس نے بھی اسی کالج سے بی ایڈ کیا۔ پروفیسر غفران ہم سب کے پسندیدہ استاد تھے، سر امجد تھے،

میرا

بارشوں کے موسم میں جہاں مختلف حشرات الارض، کیڑے مکوڑے اور "سپ سلوتنگ" وغیرہ نکلتے ہیں، وہاں ہر دوسرے تیسرے سال برسات میں اداکارہ میرا کا ایک آدھ نام نہاد شوہر بھی کسی کونے کھدرے سے ضرور ہی برآمد ہو جاتا ہے۔ اس سال بارشیں جوں جوں تھمتی جا رہی تھیں، ہماری حیرت بھی توں توں ہی بڑھتی جا رہی تھی کہ امسال بھی بارشوں کے موسم میں نہ تو سیلاب آئے، نہ لاہور کی کوئی قابل ذکر تاریخی عمارت یا حویلی منہدم ہوئی، نہ شہباز قلندر کے زائرین کو ماسوائے ایک آدھ کے کوئی لمبا چوڑا حادثہ پیش آیا، نہ ہمارے دوست عزیزی ناہنجار کو ہیضہ ہوا اور نہ ہی فلمسٹار میرا کے کسی مبینہ شوہر نے اپنے ظہور کا اعلان کیا۔

خیر میرا کی طرف سے ہماری حیرت بھی میرا ہی کی طرح کافی "کم عمر" واقع ہوئی ہے۔ کل ہی اس کا ایک اور مبینہ شوہر عتیق الرحمٰن نامی منظر عام پر آ گیا۔ اس شخص کا کہنا ہے کہ وہ اب تک میرا پر مبلغ پانچ کروڑ روپے خرچ کر چکا ہے۔ یہ بات اس آدمی کے دماغی توازن کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہونی چاہئے۔ ہمارے دوست عزیزی ناہنجار کا دعویٰ ہے کہ یہ شخص یا تو پاگل ہے اور یا پھر جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ فلمسٹار میرا پر پانچ کروڑ خرچ کرنے والے کو پہلی فرصت میں ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے دماغی صحت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا چاہئے۔

فلمسٹار میرا اور بارشوں کا موسم از آفتاب اقبال

میں یاد رکھا کیجئے۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ "محمدی پبلک اسکول" ایک علمی تحریک کا نام تھا۔ ابھی چار سال پہلے کی بات ہے کہ بچوں کے ایک رسالہ "ساتھی" میں اپنی کوئی تحریر دینے گیا تو وہاں مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، نماز ادا کر کے مسجد سے باہر نکلنا چاہا تو ایک تنومند جوان نے میرا راستہ روک لیا، دل میں کہا، لو میاں پروفیسر صاحب آج ٹارگٹ ہوئے، کڑک کے اُس بچے نے سلام کیا، ذرا باہر چلئے پروفیسر صاحب، وہ دبنگ لہجے میں بولا۔ واللہ ہماری تو سٹی گم۔ اچانک اُس لڑکے نے اُچک کر ہماری جوتیاں اُٹھالیں

میڈم ثریا تھیں اور دوسرے۔ جب میں اور ناہید اسکول مینجمنٹ کر رہے تھے تو ہمارا ''اسکول پریکٹس'' علامہ اقبال گورنمنٹ اسکول نمبر دو، سہراب گوٹھ کہلاتا تھا، لیکن سہراب گوٹھ میں تھا نہیں وہ اسکول، یوسف پلازہ کے ساتھ ہی، کاسموس پلازہ سے آگے ٹرک کھڑے رہتے، سُپر ہائی وے پر تیل وغیرہ لے کر آتے تو ٹرک پٹھان ڈرائیوروں نے وہاں رفتہ رفتہ اپنی چھاؤنی سی قائم کر لی تھی، وہیں علامہ اقبال اسکول تھا، لڑکوں کا اسکول تھا۔ میری بیگم تو اسکول ڈیمو کے بعد معلّمہ بن کر گرلز اسکول میں چلی گئیں اور پچیس برس بعد اسی کی ہیڈ مسٹریس ہو گئیں، میں نے کالج سائڈ ''پکڑلی'' ہاہاہا۔۔۔اور اُردو کا ماسٹر ہو گیا۔ ہاہاہا۔۔۔

ایک بوتراب سرکاری اسکول تھا، انچولی میں دو سرکاری اسکول تھے، قُرب وجوار میں فیڈرل پبلک سرکاری اسکول تھا، واٹر پمپ کے سامنے گلبرگ بلاک دس میں، جاوید میانداد صاحب نے بھی اسی اسکول میں پڑھا تھا کچھ سال۔ فیڈرل اسکول میں۔ ہمارے سراج الدولہ کالج کے انگریزی کے پروفیسر فرمارہے ہیں، پروفیسر ڈاکٹر ندیم احمد کہ حمیدی صاحب میرا بھی نام لکھ دیں، میں نے بھی فیڈرل اسکول سے پڑھا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب پڑھائی حقیقتاً پڑھائی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یاد آیا واٹر پمپ مارکیٹ میں گوشت مارکیٹ سے دائیں کو ایک بغلی سڑک جارہی ہے، وہاں ایک انگریزی کے پروفیسر صاحب سلطان صاحب رہا کرتے تھے، وہ کورنگی کے کسی سرکاری کالج میں انگریزی ادب کے استاد تھے، کالج سے آ کر شام کو ''ڈھاکا کوچنگ سنٹر'' کریم آباد میں کلاسیں لیتے۔ انہوں نے ۱۹۸۶ء میں مجھ سے کہا کہ آپ بی ایس سی کے امتحانوں میں نگرانی (انوِجیلیشن) کریں گے؟ میں نے پوچھا، کہاں سر؟ بولے: کیپری سینما کے سامنے ''جیکب لائنز اسکول'' میں، نہال صاحب ہیڈ ماسٹر ہیں، اچھے انسان ہیں، اُنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ چند اساتذہ کرام کی بی ایس سی کے امتحانات میں ضرورت ہے، واضح رہے کہ اُس وقت جامعۂ کراچی کی ڈگری امتحانات اسکولوں اور کالجوں میں ہوا کرتے تھے۔ میں نے ہامی بھر لی، اتفاق سے پہلا پرچہ ریاضی کا تھا ''میتھ میکینکس'' کا، نو بجے سے پرچہ تھا، میں ڈبلیو گیارہ ویگن میں سوار ہوا اور سیون ڈے ہاسپٹل پر اتر گیا، جہاں اب اسٹوڈنٹ بریانی ہے (اُس وقت نہیں تھی) وہاں سامنے اسکول تھا، لق ودق، کلاسیں میدان عبور کر کے۔ ایک گھنٹہ بھی پرچہ شروع ہوئے نہیں ہوا ہوگا کہ اسکول کے باہر فائرنگ شروع ہو گئی، فائرنگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور پھر باہر سے ایک سیاسی طلبہ تنظیم کے لڑکے کچھ غنڈوں کے ساتھ اندر کُود گئے، اُنھوں نے پروفیسر قدیر صاحب کی ''میتھ میکنکس'' کی کتاب کے اوراق بڑی بے دردی سے پھاڑ پھاڑ کر لڑکوں کو دینا شروع کئے اور اُن سے پیسے لینا شروع کر دیے، تنظیم کا نام تو میں نہیں بتاؤں گا، کمر کا کپڑا اونچا کرنے سے اپنا ہی ننگا ہوتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب نہال صاحب سے رجوع کیا، بدایوں سے تعلق تھا اُن کا، مرحوم ہوئے اب تو، بولے ''بھائی اِسی بیماری کی وجہ سے تو پرانے اُستادوں کی ڈیوٹیاں لگاتے ہیں، مگر یہ حرامی لونڈے کسی کی بھی تو عزت نہیں کرتے، دیکھنا تعلیم ختم ہو جائے گی اس قوم سے۔''

اُن کا کہا پتھر پر لکیر ثابت ہوا اور واقعی ایک زرخیز قوم زیورِ تعلیم سے محروم ہو گئی، تعلیم جن کے پُرکھوں کا زیور تھی، اثاثہ تھی، اُنھی بدقماش لونڈوں نے اپنی بدکاریوں سے اپنی ہی قوم کے پڑھے لکھوں کے جنازے نکال دیے اور اُن اساتذہ کرام کی لاشوں پر سیاست کی، کہیں اظفر رضوی، کہیں پروفیسر سبط جعفر، کہیں یاسر رضوی کہیں کچھ کہیں کچھ۔ اللہ پاکستان اور اہلِ پاکستان پر اپنا خصوصی رحم وکرم فرمائے، آمین۔

جہاں تک ہماری بیگم صاحبہ کا تعلق ہے تو جناب ان سے بہتر خاتون شاید ہی اس کرۂ ارض پر موجود ہو۔ ان کے جنتی ہونے کی یہی دلیل کافی ہے کہ پچھلے کئی سال سے ہمیں برداشت کرتی چلی آرہی ہیں، تاہم یہ عارضہ انہیں بھی بڑی شدت سے لاحق ہے کہ تعریف کا اثر ان پر بھی تقریباً وہی ہوتا ہے جو خربوزوں اور ڈرائیوروں پر ہوا کرتا ہے۔ آپ بھی بہت جلد ''چوڑ'' ہو جاتی ہیں۔ خیر، اس موضوع پر مزید کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ''فی الحال ہمارا گھر سے نکلنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔''
مشتاق احمد یوسفی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ٹکر کہیں لگ جائے غضب بیچ سڑک پر
پھر کھلتا ہے لوگوں کا نسب بیچ سڑک پر

ہوجائے کہیں حادثہ پھر ہوتا یہی ہے
دیں نوٹوں سے چوٹوں کو ضرب بیچ سڑک پر

فُٹ پاتھ پہ رکھیں ہیں کُتب، شاپ پہ جوتے
ارزاں ہوا ہے کتنا ادب بیچ سڑک پر

اشعار کی رو چلتی ہے گاڑی نہیں چلتی
شاعر کہیں مل جاتے ہیں جب بیچ سڑک پر

جس دیس میں انصاف میسر نہیں ہوتا
ہوتے ہیں وہاں فیصلے سب بیچ سڑک پر

ہے میل خوشامد کا جما وہ نہ سُنیں گے
کرتے رہو تم شور و شغب بیچ سڑک پر

آجائے نیا سال پرانے ہیں طریقے
بجتی ہے یہاں بزمِ طرب بیچ سڑک پر

معجونِ تسلی و تشفی تو ہے کافی
مظہر چلو اب کھولیں مطب بیچ سڑک پر

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ہاتھوں سے میرے پارچۂ ران تو گیا
پر اتنا ہوگیا تمہیں پہچان تو گیا
لیڈر کی طرح جھپٹے ہیں سارے پلیٹ پر
بچے بہت ہی خوش ہیں کہ مہمان تو گیا
کاروں کا اصطبل ہے مرے گھر کے سامنے
کھلتے جہاں گلاب تھے وہ لان تو گیا
لائے تھے اک طبیب کو گرمی نکالنے
دل پر اٹیک ہوگیا یرقان تو گیا
گھر میں بس اب تو نت نیا سامان آئے گا
شوہر خلیجی ملک ہے، خلجان تو گیا
کل ہو گا پھر کوئی نیا بحران سامنے
اس ملک میں نہ کہہ کبھی ، بحران تو گیا
تھانہ کچہری ہو کہ کوئی ہسپتال ہو
آیا ہے جو بھی ہو کے پریشان تو گیا
کسٹم کو دھوکا دے کے پسنجر نے یہ کہا
"اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا"
اُلّو کی نسل پھیل گئی ، خیر اب نہیں
اُلّو کے پٹھوں سے یہ گلستان تو گیا
مظہر نے داغ داغ کیا داغ کا کلام
پیروڈی لکھنے کا چلو ارمان تو گیا

ڈاکٹر عزیز فیصل

تمام فین، سبھی ناقدان ریسٹ کریں
مری بساط سے ناواقفان ریسٹ کریں

تو جلد کیسے کٹائی ہو فصل کی کہ اگر
بزرگ کام کریں، نوجوان ریسٹ کریں

اک ایسا گیسٹ بھی ہوتا ہے چند منٹوں کا
ٹلے، تو گھنٹوں سبھی میزبان ریسٹ کریں

کوئی تو اور بھی بولے غلط سلط اردو
سو شہر بھر کے سب اہل زبان ریسٹ کریں

ہیں تین بیویوں والے بھی کیا غضب مزدور
یہ ایسے لوگ نہیں جن کے کان ریسٹ کریں

کلاس روم اب ایسے بنا دیے جائیں
اساتذہ بھی جہاں پر ہر آن ریسٹ کریں

کہا ہے خواب میں مجھ سے یہ فیس نے فیصل
اب اللہ اللہ کریں، بھائی جان، ریسٹ کریں

ڈاکٹر عزیز فیصل

جب دکھائے کسی کو تھانہ ،عشق
اس کو کہتے ہیں ''عبرتانہ'' عشق

قلتِ دلبراں تو ہوتی تھی
کر رہا تھا سبھی زمانہ عشق

قیس و لیلیٰ سے بھی ہے پہلے کا
پلس اور چور کا پرانا عشق

بعض رنگین ادویہ کی طرح
اپنے بچوں سے تم چھپانا عشق

ایکس رے اس کی چیسٹ کا ہوا تھا
دل سے نکلا کوئی زنانہ عشق

اہلیہ دیکھ ، سن بھی سکتی ہے
آپ کا یہ سکائپانہ عشق

نوکروں کو سمجھ نہیں آیا
مالکن کا تحکمانہ عشق

مولوی کر رہا ہے کیوں فیصلؔ؟
اپنی مونچھوں سے والہانہ عشق

ضیاء اللہ محسنؔ

آنسوؤں کے سائے میں بھی مسکرانا چاہئے
آزمائے کو کبھی نہ، آزمانا چاہئے

رفتہ رفتہ ایک دن وہ گلستاں بن جائے گا
زندگی میں روز کوئی گُل کھلانا چاہیے

یاد رکھنے کے لئے یادیں بھی ہونی چاہئیں
بھولنے کی عادتوں کو بھول جانا چاہیے

جب کوئی بھی ٹوٹ کر بکھرے تو جلدی سے اسے
ایک پیالہ گوند کا ، پانی پلانا چاہئے

دوستوں سے قُرب رکھنا ہو تو اس کے واسطے
روز صبح آپ کو کھل کے نہانا چاہئے

گیس ، ٹیلی فون ، پانی ، دودھ اور بجلی کے بل
ہر مہینے آدمی کو، بلبلانا چاہئے

ہے ترقی کا یہی اک راز میرے دوستو!
افسروں کے سامنے بس دُم ہلانا چاہئے

اک منسٹر نے یوں کی تعریف انکل سام کی
جس کا کھانا چاہئے ،بس اُس کا گانا چاہئے

اپنی عادت سے کبھی باز آئے نہ محسنؔ انہیں
شعر کہنے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے

ضیاء اللہ محسنؔ

وہ اِدھر سے اُدھر کب کدھر ہو گیا
"میرے گھٹنے میں دردِ جگر ہو گیا"

میں دوا لینے پہنچا تو دیکھا وہاں
جو قصائی تھا اب ڈاکٹر ہو گیا

جس مدرسے میں وہ فیل ہوتا رہا
اُس جگہ آج وہ ماسٹر ہو گیا

وقت کا کھیل ہے دیکھ تبدیلیاں
وہ پدر سے پسر، پھر سسر ہو گیا

میرے جوڑوں میں بیٹھا رہا عمر بھر
اب وہی شخص کیوں میرے سر ہو گیا

اپنی زوجہ کا ہونا پڑا ایک دن
ہم نے چاہا نہیں تھا مگر ہو گیا

ووٹ ڈالا گیا ، اُس کو پالا گیا
شیر پہلے تھا جو آج شر ہو گیا

اس وطن پہ خدا ،اپنی رحمت کرے
جو بھی آیا یہاں معتبر ہو گیا

ایک ٹی وی اداکار کا چھینکنا
اِس قدر اہم تھا کہ خبر ہو گیا

عرفان قادر

نہ ہی بل کلنٹن میں اور نہ اُباموں میں
ہے ابھی وفا باقی پھتوؤں میں گاموں میں

عشق کی الف بے تھی عین غین تک پڑھ لی
رُک گئے مگر آ کر کاف گاف لاموں میں

دس کلو خریدے تھے، ہائے شومیِ قسمت!
نو کلو سے زیادہ ہیں گٹھلیاں ہی آموں میں

توڑتے ہیں دفتر میں، کرسیاں سبھی آ کے
پھنس گئے خدا جانے کیسے ہڈ حراموں میں

پور پور تک جن کی کاہلی میں ڈوبی ہے
گھس چکی ہے سُستی بھی سب کے سب مساموں میں

ہیر آئی سٹارس ''فیملی'' کے جب ہمراہ
سات آٹھ چلتے تھے، چار تھے پراموں میں

کاش اتنی پھرتی ہو، دیس کی پُلس میں بھی
جس قدر وہاں پر ہے، جیریوں میں ٹاموں میں

درس دین کا آ کر دے رہا ہے ٹی وی پر
کل جو کام کرتا تھا لُچ بھرے ڈراموں میں

لیپ ٹاپ دیتے ہیں اور چُچ مُبائل بھی
اس لئے ہے بھانجوں کو انٹرسٹ ''ماموں'' میں

آپ جتنے پیسوں کا لے کے آئے ہیں بکرا
اونٹ بھی ہیں مل جاتے تین اتنے داموں میں

بحر کی جو کرتا تھا میٹروں میں پیمائش
وزن اُس کا اپنا تھا کچھ ملی گراموں میں

عرفان قادر

سونی ہو یا ایل جی ہو، یا ہائیر یا ہٹاچی
بن ٹی وی کے زندہ نہیں رہ سکتی ہے چاچی

مقدور کہاں روز مِلن ہیر سے میرا
مَیں گلشنِ معمار میں، وہ مائی کلاچی

مانا کہ نہیں کوئی بھی کل اونٹ کی سیدھی
پر یاد رہے اتنی بھی سیدھی نہیں ڈاچی!

سیلفی تو بنانے دے مجھے عید کے دن پہ
''نوری'' سے یہ کہتا ہی رہا ''جام تماچی''

ممکن نہیں کر پائے ذرا سی بھی ترقّی
وہ قوم جو لیڈر کے اشاروں پہ ہو ناچی

سرکار! کہاں آپ، کہاں بندۂ مسکین؟
چک جھمرہ کہاں اور کہاں شہرِ کراچی؟

شاعر کو اگر ایک بھی سامع نہ ملے تو
پھرتا ہے کہ جیسے ہو کوئی گائے گواچی

نویدؔ صدیقی

ہرگز وہ ادا حقِ قیادت نہیں کرتا
مال وزرِ دنیا سے جو رغبت نہیں کرتا

شوہر کے علاوہ بھلا ہو سکتا ہے وہ کون؟
''جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا''

بچے ہوئے اُس شخص کے دس سال میں بارہ
کہتا ہے جو''بیوی سے محبت نہیں کرتا''

من مانی بھی کرتا ہوں میں دو چار منٹ کو
ہر وقت تو بیوی کی اطاعت نہیں کرتا

ممبر وہ بنا پھرتا ہے گو جعلی سند پر
محسوس کسی طور خجالت نہیں کرتا

اللہ سے ڈرنے کا وہ کہتا ہے سبھی کو
خود اس پہ عمل پیرِ طریقت نہیں کرتا

اِک شور بپا رکھتا ہے یہ میڈیا دن رات
اور پیش کبھی کوئی حقیقت نہیں کرتا

شہرت ہو نہ دولت ہو نہ کرسی ملے جس میں
میں ایسے کسی کام میں شرکت نہیں کرتا

نویدؔ صدیقی

جب چل سکا نہ زور تو خود کو بدل لیا
بدلا نہ کوئی اور تو خود کو بدل لیا

محسوس جب کیا کہ مری بول چال سے
ہوتا ہے وہ بھی بور تو خود کو بدل لیا

سچ بولنے سے ذہن ابلنے کے ساتھ ساتھ
ٹوٹا جو پور پور تو خود کو بدل لیا

سن کر جسے امامِ زمانہ دیا قرار
دیکھا اسے بغور تو خود کو بدل لیا

اِک عمر خواب دیکھنے ، بُننے میں کاٹ دی
مشکل ہوا یہ طور تو خود کو بدل لیا

چاہا تھا کچھ نویدؔ سو ممکن نہیں ہوا
جو تھا رہا وہ دور تو خود کو بدل لیا

روبینہ شاہین بیناؔ

بنا کے موڈ، دسمبر کی شاعری چاہیں
دماغ مونگ پھلی ہے کہ آپ بھی چاہیں

جو پھنس گئے ہیں یہاں تین بیگمات میں وہ
"کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں"

جو کاٹتے ہیں بلیڈوں سے جیب لوگوں کی
ہم اُن کے پیٹ کی خاطر درانتی چاہیں

یہ لوگ سانپ نہیں ہیں تو اور کیا ہیں بھلا
جو اوڑھنے کو بھی سانپوں کی کینچلی چاہیں

کسی کے گھر میں جو پہنچیں تو سب سے پہلے ہم
لگائیں چارج پہ سیل کو یا بیٹری چاہیں

یہ اینکر ہیں کہ جج ہیں کسی عدالت کے
ہر ایک بات پہ اپنی کمنٹری چاہیں

جو بیگمات کے انڈر ہیں ظلم سہتے ہوئے
وہ بد نصیب مصیبت میں چھپکلی چاہیں

چھپا رہے ہیں جو دولت غریب دھرتی کی
وطن سے دور وہ گمنام کمپنی چاہیں

کھلی ہے دشت میں مجنوں کی نرسری لیکن
ہم اپنے شہر میں لولی اکیڈمی چاہیں

کوئی بھی لینس لگا دو مگر یہ یاد رہے
ہم اپنی آنکھ کی رنگت بھی نرگسی چاہیں

ڈکارنے کا ہنر بھی وہ خوب جانتے ہیں
اُڑا کے مرغِ مسلّم جو پیپسی چاہیں

جو اِک بلا پہ گزارہ نہ کر سکیں بیناؔ
وہ دوسری کو بھگا کر بھی تیسری چاہیں

روبینہ شاہین بیناؔ

شور سا ہمسائے میں پھر ناگہاں پیدا ہوا
یوں لگا جیسے کوئی آتش فشاں پیدا ہوا

عام سا جھگڑا تھا لیکن لیڈروں کے درمیاں
گالیوں کا ایک بحرِ بیکراں پیدا ہوا

اس لیے باہم ذرا نسلی تفاوت آ گیا
"پنڈ" یہ پیدا ہوئی اور وہ "گراں" پیدا ہوا

ایک درجن کم نہ تھے کاکے مرے ہمسائے میں
اِس پہ یہ طرفہ قیامت، تیرہواں پیدا ہوا

جا رہا تھا خامشی سے کوچۂ جاناں کو وہ
دیکھ کر اس کو عبث شورِ سگاں پیدا ہوا

ایک ہی گھر میں اگر پیدا ہی ہونا تھا انہیں
یہ کبوتر ہے تو پھر کیسے وہ کاں پیدا ہوا

تنویر پھولؔ

کیوں آنکھ ماری اُس کو ہے؟ کیا کر دیا شروع
کیسا رقابتوں کا ہُوا سلسلہ شروع

ہمسائی پر نثار ہُوا ، اُس پہ مر مٹا
دونوں پڑوسیوں میں ہی جھگڑا ہُوا شروع

بریانی گڑبڑی کا بنی پیٹ میں سبب
بولا حکیم، تجھ کو ہُوا کالرا شروع

پہلے تو خاندان میں مل کر سبھی رہے
پھر ساس اور بہو کا ہُوا معرکہ شروع

تھانے میں بے قصور اِک آیا تو رو پڑا
جب موٹے تھانیدار نے حملہ کیا شروع

اُس پیکرِ ریا کو کریں سات ہم سلام
پردے میں دوستی کے ہے کارِ دغا شروع

مانندِ گربہ آنکھیں وہ چمکا رہا تھا پھولؔ!
اِک بم وہاں پھٹا جو ہُوا قہقہہ شروع

تنویر پھولؔ

دودھ میں ، ''تعویذ'' لکھ کر گھولئے
پیر صاحب! کچھ تو منہ سے بولئے
ہم پٹے ابا سے اُس کے، رو لئے
ہاتھ محبوبہ سے اپنی دھولئے
کچھ سکھائیں اُس کے ابا کو تمیز
یعنی اپنے کتے اُس پر کھولئے
ہم کو دامادی میں وہ کرلے قبول
ورنہ پھر مرغا بنا کر تولئے
ناک اُس کی گول جو آئی پسند
کھیت میں ہم نے بھی آلو بولئے
بولا ، تیرے باپ کا کیا نام ہے؟
ہاتھ میں ڈنڈا، تھا آیا جولئے
جا رہا تھا کھانے دعوت ایک شخص
پیچھے پیچھے اُس کے ہم بھی ہولئے
بال پن اتنی لگائیں شوخ نے
گویا اُس نے سر میں کانٹے بولئے
گھر میں جاگے رات بھر، دفتر میں پھولؔ!
بیٹھ کر بیت الخلا میں سولئے

سید فہیم الدین

مجنوں کو پھنسوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!
ابا سے پٹوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

بھوک سے اب کیوں مارا مارا پھرتا ہے
فاقوں سے مروایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

کہتا تھا میں گھوڑی چڑھ کر آؤں گا
کھوتے پر بٹھوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

ابے کی دھوتی کو اپنے لاچے کو
پھوکٹ میں دھلوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

کہتا تھا کہ نمبردار بنوں گا میں
باورچی لگوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

چٹھیاں ساری بیرنگ بھیج کے گاؤں سے
مجنوں کو بلوایا کس نے؟ لیلیٰ نے!

سید فہیم الدین

رشوتوں سے زندگی میں ذائقے بڑھتے گئے
اور یوں کرسی کے پیارے فائدے بڑھتے گئے

جب سے اِک دو شوہروں نے مار کھانا سیکھ لی
بس تبھی سے بیویوں کے حوصلے بڑھتے گئے

اُس کے بھائی سے جو میری دوستی پکی ہوئی
اُس کے گھر پر اُس کے میرے رابطے بڑھتے گئے

اُس قدر رسوا سرِ بازار تجھ کو کر دیا
جس قدر قانون تیرے ضابطے بڑھتے گئے

کس قدر دشوار ہے مل بیٹھنا یکجا فہیم
جب ترقی بڑھ گئی تو فاصلے بڑھتے گئے

امجد علی راجا

مجھ پر نہ ڈال شک کی نظر، پارسا ہوں میں
ہوں گے سبھی کرپٹ مگر، پارسا ہوں میں

اک میں ہی کیا، نظام ہی پورا کرپٹ ہے
مجھ کو نہیں کسی کا بھی ڈر، پارسا ہوں میں

اجرت کو کہہ رہا ہے تُو رشوت؟ یہاں سے بھاگ
آئے نہ تیری شکل نظر، پارسا ہوں میں

نسخہ ہے ڈاکٹر کا، نہیں شوقِ میکشی
یہ ہے علاجِ زخمِ جگر، پارسا ہوں میں

وعدہ شکن نہیں ہوں نہ پھرتا ہوں بات سے
ہے حافظے پہ منفی اثر، پارسا ہوں میں

نفرت مجھے ہے جھوٹ سے، کرتا نہیں فریب
پر مصلحت ہے میری ڈگر، پارسا ہوں میں

ناراضگی نہ ہو، نہیں کرتا میں منہ پہ بات
غیبت کہیں گے لوگ مگر، پارسا ہوں میں

رکھتا نہیں ہوں پیشِ نظر دوسروں کے عیب
رکھتا ہوں یوں ہی سب کی خبر، پارسا ہوں میں

دیدار بار بار حسینوں کا کفر ہے
میں گھورتا ہوں ایک نظر، پارسا ہوں میں

اک گھونٹ بھی حرام ہے، کافی ہیں چار پیگ
ویسے بھی جا رہا ہوں میں گھر، پارسا ہوں میں

لگتی نہیں ہے آہ، نہ لگتی ہے بد دعا
ہوتا نہیں ہے مجھ پہ اثر، پارسا ہوں میں

گوہر رحمان گہر مردانوی

اپنے وعدوں سے تو وہ صاف مکر جاتی ہے
اور کہنی پہ الگ ہاتھ بھی دَھر جاتی ہے

جتنی معصوم تمنائیں ہیں بالغ ہو کر
پھول چننے کی عمر بھی تو گزر جاتی ہے

ایک تو اِتنی بہادر ہے نڈر ہے بے خوف
چھپکلی دور سے دیکھے بھی تو ڈر جاتی ہے

جب بھی تیور ہو مرے دیکھ کے بدلے بدلے
لوٹتی رہتی ہے پاؤں میں بکھر جاتی یے

لوٹ کر گھر کبھی آتا ہوں اگر دیر سے میں
نصف بہتر مری پگڑی سے اُتر جاتی ہے

گھر میں رہتی ہے تو ہر وقت چڑیلوں کی طرح
شادیوں پر جبھی جاتی ہے، سنور جاتی ہے

اُن کے نالے تو کبھی ختم نہ ہوں گے گوہر
ہر کیم کو مری خوشنودیاں کر جاتی ہے

زبیر قیصر

یہی اچھا لگا مجھ کو، سو عادت چھوڑ دی میں نے
چلن دیکھا شریفوں کا، شرافت چھوڑ دی میں نے

عوام الناس کو جس نے گھسیٹا روڈ پر لا کر
وہی اب کہہ رہا ہے کہ ذلالت چھوڑ دی میں نے

وہ جس نے لوڈ شیڈنگ کی اسے بیگم نے کوسا ہے
سو اب گنجی حکومت سے شکایت چھوڑ دی میں نے

میں جس میں رہ رہا تھا اُس کی بنیادیں بھی خود کھودیں
مگر گرنے سے پہلے وہ عمارت چھوڑ دی میں

حلف اُس نے اٹھایا تو یہی فرماں کیا جاری
حکومت اب کروں گا میں، سیاست چھوڑ دی میں نے

مجھے کچھ بھی نہیں لینا، حسابوں سے، کتابوں سے
سو انگریزی پڑھوں گا میں، ریاضت چھوڑ دی میں نے

مجھے جب اس کے ابے نے وہ مارے تھانے میں لتر
بشیراں کی محبت میں، محبت چھوڑ دی میں نے

اب اس کے گھر ٹیوشن کی لگی ہے نوکری میری
جو چپکے سے میں کرتا تھا زیارت چھوڑ دی میں

ابنِ منیب

اُس کو دیکھ کے اچھے اچھے
تھوڑے لبرَل ہو جاتے ہیں

چھوڑو چھپ چھپ کر ملنے کو
ہم تم لیگل ہو جاتے ہیں

سوتی قوموں کے بالآخر
سپنے رَینٹل ہو جاتے ہیں

''رائل'' کہنے سے کیا بھیا
پنکھے رائل ہو جاتے ہیں؟

شعر ہمارے سُن کر بلبل
سَینٹی مینٹل ہو جاتے ہیں

سردی میں سویٹن کی صاحب!
شکوے ڈینٹل ہو جاتے ہیں

شاہین فصیح ربانی

یہ کیا کہ بات ہے کم، گالیاں زیادہ ہیں
ضرور آپ کی گھر والیاں زیادہ ہیں
لہو غریب کا پینا ہے مشغلہ اس کا
رخِ امیر پہ یوں لالیاں زیادہ ہیں
جو کہہ رہا ہے عمل اس پہ وہ نہیں کرتا
اسی کی بات پہ کیوں تالیاں زیادہ ہیں
وزیرِ ست پہ ہے تبصرہ سیانے کا
فضول چیز کی رکھوالیاں زیادہ ہیں
عجب تماشہ یہ گوروں کے شہر میں دیکھا
یہاں پہ گوریاں کم، کالیاں زیادہ ہیں
تمھارے شہر کا احوال کیا بتاؤں میں
تمھارے شہر میں بدحالیاں زیادہ ہیں
مجھے کھنک بھی تری چوڑیوں کی کھینچتی ہے
مگر پسند تری بالیاں زیادہ ہیں
میں کیا کروں، مری تنخواہ ہے بہت تھوڑی
میں کیا کروں کہ مری سالیاں زیادہ ہیں
مقام ایک سا ہے جدّت و روایت کا
یہ گیت کم ہے نہ قوالیاں زیادہ ہیں
یہاں تو آج وہی کامیاب ویٹر ہے
کہ جس کے ہاتھ میں دو تھالیاں زیادہ ہیں
فصیح شاذ ہی اب اختراع ملتی ہے
کوئی بھی شعبہ ہو، نقالیاں زیادہ ہیں

اعظم نصر

نہ جانے کیوں ہمیں محنت سے کچھ پرہیز ہے ساقی
اگرچہ جانتے ہیں وقت تھوڑا تیز ہے ساقی

ابھی افرادی قوت پر توجہ سب ہماری ہے
علاقہ خاص یہ دنیا میں مردم خیز ہے ساقی

نہیں مطلب زیادہ کام سے، بس زر زیادہ ہو
بڑی کرسی پہ بیٹھے ہیں بڑی سی میز ہے ساقی

کسے مطلب ہے باسٹھ سے، کسے ہے غم تریسٹھ کا
دفعہ کوئی بھی ہو سب قابلِ پرچیز ہے ساقی

بڑے جو ملک ہیں ان کی بڑی سی ہسٹری بھی ہے
ہمارا ملک دنیا میں ابھی نوخیز ہے ساقی

کمی ڈیموں کی ہے ورنہ نصر معلوم ہے کب سے
”ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی“

نیاز احمد مجاؔز انصاری

کس کو سناؤں حالِ دلِ بیقرار کا
بیگم کے ہاتھ لگ گیا نامہ جو یار کا

ابّو کی ڈانٹ سن کے بھی کھونٹا بنا رہا
کب وقت ختم ہوگا ترے انتظار کا

سب جانتے ہیں میں ہوں محلّے کا اک حکیم
گھر میں نُلا لے کر کے بہانہ بُخار کا

کیوں جھوم جھوم چلتے ہیں تیری گلی میں لوگ
کُھلنے لگا ہے راز ترے کاروبار کا

فیشن کا بھوت ہو گیا بیوی کے سر سوار
مولانا! کوئی وِرد بتائیں ''اُتار'' کا

رشتے نبھاتا کیسے کوئی نقد میں بھلا
کھاتا رہا جو مال ہمیشہ اُدھار کا

داڑھی کے ساتھ مولوی میخانے آ گئے
کچھ تو خیال کرنا تھا پروردگار کا

بھینگی نِگاہ سے تری پیتا میں روز و شب
یہ کام کاش ہوتا مرے اختیار کا

جیب و گریباں پھاڑ کے بیٹھے تو ہو مجاؔز
دوگے حساب کیسے اُسے تار تار کا

عاجؔز سجاد

بڑی حسین ہے دلبر مری حسینہ بھی
کرینہ کیا ہے اور کیا ہے وہ روینہ بھی

وہ منتوں سے بھی سالا مرا نہیں مانا
سسر بھی ساس بھی راضی تھ اور کرینہ بھی

کچھ اور دِن مرے اعصاب پر سوار نہ ہو
دکاندار بھی سر پر ہے اور مہینہ بھی

پسند ایک ہے پر بیویاں ہیں چار مری
یہ روز روز کا مرنا بھی ہے یہ جینا بھی

خدا کا شکر مری ساس ہے بھلی مانس
سسر عجیب ہے، سالا تو ہے کمینہ بھی

سکول خرچے ابھی پورے ہی نہیں ہوتے
وبالِ جان ہے اوپر سے مس نگینہ بھی

وہ سُرخ گال پہ کرتا نہیں ملال ذرا
رسید کرتی ہے تھپّڑ جسے روبینہ بھی

اقبالؔ شانہ

چھتری ذرا نکال، بڑی تیز دُھوپ ہے
گرمی سے ہوں نڈھال، بڑی تیز دُھوپ ہے

سورج دہک رہا ہے مرے سر پہ جانِ من
بکھرا کے زلف ڈال، بڑی تیز دُھوپ ہے

سر پک رہا ہے دھوپ کی تیزی سے یار کا
چہرہ ہے لال لال، بڑی تیز دُھوپ ہے

مجھ کو ذرا بتا ہے خطِ استوا کہاں
جغرافیہ نکال، بڑی تیز دُھوپ ہے

گرمی سے میں کباب نہ بن جاؤں جانِ جاں
پانی میں مجھ کو ڈال، بڑی تیز دُھوپ ہے

شہتوت کا ذرا مجھے شربت پلا دے تُو
ہو جاؤں میں بحال، بڑی تیز دُھوپ ہے

کشمیر کے ہیں سیب ، ٹماٹر یا دلی کے
ہیں سرخ سرخ گال، بڑی تیز دُھوپ ہے

گرما میں لگ رہا ہے مجھے ایسے گلستاں
لکڑی کی جیسے ٹال، بڑی تیز دُھوپ ہے

مصرع کو بھون بھون کے شانہؔ سُنا غزل
اشعار کو اُبال، بڑی تیز دُھوپ ہے

اقبالؔ شانہ

غلطیاں کر رہا ہے کمپیوٹر
آدمی بن گیا ہے کمپیوٹر

اِک پری چہرہ آپریٹر سے
دل لگی کر رہا ہے کمپیوٹر

ہے یہ واقف اُمورِ خانہ سے
بیویوں سے بھلا ہے کمپیوٹر

ذکرِ ''کمپیوٹرن'' ہوا شائد
خوش بہت ہو رہا ہے کمپیوٹر

مائکرو چپ خراب ہے یارو
اِس لئے سو رہا ہے کمپیوٹر

جو مسلسل سُنائے ہے غزلیں
آدمی ہے وہ یا ہے کمپیوٹر

ہے یہ انجینئر کا گھر شانہؔ
ٹکڑے ٹکڑے ہوا ہے کمپیوٹر

احمد علوی

ہم نے ظاہر و باطن جس کا ایک سا پایا
اُس بشر کو دنیا میں مستند گدھا پایا

گیان پیٹھ لے آیا، بن گیا پدم بھوشن
دوستو! سیاست میں جا کا جم گیا پایا

پائے کھا کر ہوتی ہے پائے کی غزل یارو!
پائے کا بنا شاعر، جس نے کھا لیا پایا

یار کی طبیعت نے پائے سی چپک پائی
لب لبوں سے جب چپکے کون پھر چھڑا پایا

چار ٹن کی بیگم جب چارپائی پر بیٹھی
چارپائی کا ہر اِک چُرمرا گیا پایا

صبح کو اگر کھائیں، رات کو یہ فرمائیں
شوربے میں پائے کے خلد کا مزا پایا

دِل کا درد گھٹنوں میں جب کبھی اُتر آئے
یہ حکیم کہتا ہے صبح شام کھا پایا

احمد علوی

تو بھی بیلن سے پٹا کچھ کم ہے
اس لئے پھولا پھلا کچھ کم ہے

کھا کے دس مرغ مسلم بولے
پیٹ میں اب بھی گیا کچھ کم ہے

اُس کو دلہن ملی دو سو کے۔جی
اب بھی شادی میں ملا کچھ کم ہے

شہر میں مچھروں کی عید ہے آج
جس پر اُس کے قبا کچھ کم ہے

تھوپ کر چار کلو میک اپ وہ
پھر بھی کہتی ہے ذرا کچھ کم ہے

بیویاں چار ہیں پھر بھی ہے گماں
مہرباں ہم پہ خدا کچھ کم ہے

کھوٹا سکہ ہے چلن میں کب سے
دوستو پھر بھی گھِسا کچھ کم ہے

ڈاکٹرنشترامروہوی

سسرال میں رہوں گا کمانا تو ہے نہیں
''ہم بے گھروں کا کوئی ٹھکانا تو ہے نہیں''
کیوں مارتے ہو سالو مجھے روز صبح شام
سسرال ہے مری کوئی تھانہ تو ہے نہیں
ہنڈیا بنا کے خود ہی بناؤں گا روٹیاں
بیگم کو میرا ہاتھ بٹانا تو ہے نہیں
کرتے ہیں یہ زبانی جمع خرچ اس لئے
ان لیڈروں کو وعدے نبھانا تو ہے نہیں
اسلام میں تو یوں بھی اجازت ہے چار کی
پھر بھی فریب دوسرا کھانا تو ہے نہیں
رنڈوا ہی رہ کے اب میں گذاروں گا زندگی
پھندا گلے میں اور پھنسانا تو ہے نہیں
تم مل نہ پاؤ گی تو پٹالوں گا دوسری
اب قیس جیسا پہلا زمانہ تو ہے نہیں
جوتے پڑے ہیں چاند پہ اظہارِ وصل پر
یہ بات اب کسی کو بتانا تو ہے نہیں
نالی میں گر پڑے ہو تو لیٹے رہو یہیں
اتنے نشے میں گھر میں بھی جانا تو ہے نہیں
کل رات جوتے کھا کے کیا ہے یہ فیصلہ
ان کی گلی میں اب مجھے جانا تو ہے نہیں
معصوم پھنس رہے ہیں شکاری کے جال میں
پنچھی کی چونچ میں کوئی دانا تو ہے نہیں

ڈاکٹرنشترامروہوی

شکم میں قتل ہوتی بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں
''شکستہ آئینوں کی کرچیاں اچھی نہیں لگتیں''

بڑھاپے میں یہ سب اٹکھیلیاں اچھی نہیں لگتیں
مجھے اب اپنے ہی بچّوں کی ماں اچھی نہیں لگتیں

بجائے واہ وا کے تالیوں کا شور ہوتا ہے
ادب کی محفلوں میں تالیاں اچھی نہیں لگتیں

رواجوں کا گلے میں طوق ہے مفلس پریشاں ہیں
گھروں میں ہیں کنواری بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں

مہارانی جو گھر آکر چلائے حکم شوہر پر
وہی آفس میں دھوئے پیالیاں اچھی نہیں لگتیں

بسوں میں جسم دکھلاکر جو پاکٹ مار لیتی ہیں
کسی لونڈے کو ایسی لونڈیاں اچھی نہیں لگتیں

میں اپنے اور اُن کے درمیاں رکھتا ہوں اِک تکیہ
انہیں ہر سال آئیں الٹیاں اچھی نہیں لگتیں

ارے ساقی تو اپنے پاس ہی رکھ ایسی مٹّی کو
نمی پاتے ہی یہ زرخیزیاں اچھی نہیں لگتیں

ڈاکٹر امواج الساحل

سودا جو دیا اُس نے ملاوٹ سے بھرا تھا
میں نے تو دیا اُس کو مگر نوٹ کھرا تھا

فائل پہ میری جلد ہی سائن جو ہوئے تھے
پہلے ہی صفحے پر وہ بڑا نوٹ رکھا تھا

رکھی تھی اسی میز میں برسوں سے وہ فائل
جس میز پہ وہ صبح سے اونگھ رہا تھا

کرتا تھا وہ رکھوالی کسی بینک کی امواؔج
جب گھر میں اُسی شخص کے ہاں ڈاکہ پڑا تھا

اسانغنی مشتاق رفیقی

جب سے اُن کے گھر کے آگے بیوٹی پارلر کُھلا
رات دن رہنے لگا ہے شیخ جی کا در کُھلا

بوڑھے بھی بن ٹھن کے اب لگنے لگے ہیں نوجواں
جب سے میرے گاؤں میں ممتاز کا دفتر کُھلا

اِن کم انگ اور آؤٹ گوئنگ کی ملی تفصیل جو
پیچھے ہر مس کال کے ہے اک پری پیکر کُھلا

اُس کی ہی جب چلتی دیکھا روم کے دربار میں
نام کس کا بھی رہے پر اصل ہے قیصر کُھلا

مفتیوں سے دور ہی رہنا خدارا دوستو!
لے کے پھرتے ہیں زباں میں وہ عجب خنجر کُھلا

اُس کی محفل میں جو بیٹھا میں سُنانے حالِ دل
قابلِ عزت فقط ہیں صاحبانِ زر کُھلا

جس کی دانائی کے چرچے تھے بہت اخبار میں
وہ نرا بدھو رہا یہ اُس سے ملنے پر کُھلا

ڈال کر ٹوپی جو بنتا ہے بڑا ہی مذہبی
کیوں ''مرینا بیچ'' میں وہ گھومتا ہے سر کُھلا

جب رفیقؔی نے خطیبِ شہر سے کی التجا
ہے امیرِ شہر کے تابع یہاں منبر کُھلا

نوید ظفر کیانی

تم جیسا سمجھتے ہو میں ویسا تو نہیں ہوں
اُترا ہوں میں بس سے کوئی کبڑا تو نہیں ہوں

دیکھو نہ یونہی رحم بھری نظروں سے مجھ کو
شوہر ہوں میں سچ مچ کوئی گونگا تو نہیں ہوں

بیماری سے ہلتی ہے مسلسل میری گردن
میں تیری کسی بات کو سمجھا تو نہیں ہوں

آنکھیں ہیں کہیں اور تو نظریں ہیں کہیں اور
پالیسی ہے ایسی کوئی بھینگا تو نہیں ہوں

کیدو اُسے بننے کا یونہی شوق ہے ورنہ
میں ہیر کے چاچے سے اکڑتا تو نہیں ہوں

دنیا تو تماشہ ہے مگر سوچ رہا ہوں
دنیا کے لئے میں بھی تماشا تو نہیں ہوں

اِتنا بھی نہ سمجھو مجھے شرفائے زمانہ
پانامہ کی لیکوں سے میں رِستا تو نہیں ہوں

لڈو نہیں بٹتے تھے سرِ دشت کہ جاتا
مجنوں کی طرح اُلو کا پٹھا تو نہیں ہوں

رکھتے ہیں عبث لوگ ترنم کی توقع
شاعر ہوں ظفر کوئی گویا تو نہیں ہوں

نوید ظفر کیانی

اپنی شامت خود بلانی ہو تو بتلا دیجئے
پھر خیالِ عقدِ ثانی ہو تو بتلا دیجئے

زوجۂ اوّل سے کوئی بال سر کا بچ گیا؟
پھر سے نیت شامیانی ہو تو بتلا دیجئے

جس سے ہو خمیازۂ عقد و تجرد سے مفر
ایسی صورت درمیانی ہو تو بتلا دیجئے

کیوں نہ اُس کی ہر خبر لسّی دماغوں کی بنے
نیوز چینل کی مدھانی ہو تو بتلا دیجئے

آج ساری قوم کے چہرے پہ بارہ بج گئے
حوصلۂ شادمانی ہو تو بتلا دیجئے

ہم تو ہیں سو جان سے قربان لیکن آپ نے
اور ہی کچھ دل میں ٹھانی ہو تو بتلا دیجئے

ظرف کے سگریٹ کو سلگا لوں گا میں بھی آن کر
خواہشِ شعلہ بیانی ہو تو بتلا دیجئے

کون سی حسرت کا خمیارہ ہے شوقِ ازدواج
مشغلۂ مرغ بانی ہو تو بتلا دیجئے

اب تو خاصے دُم ہلانے والے شوہر ہیں ظفر
کوئی ماضی کی کہانی ہو تو بتلا دیجئے

محمد اشفاق ایاز

میاں لچھن اور قربانی

ایک پاؤ کدو، آدھ پاؤ دال چنا، ایک ٹماٹر، ایک پیاز، دو ہری مرچیں، یہ تھی آج کی کل خریداری، جسے میاں لچھن اپنے کالے کپڑے کے تھیلے میں ڈالے، سوچوں میں گم، بڑے بوجھل قدموں کے ساتھ بازار سے گھر جانے والی گلی میں یوں داخل ہوئے، جیسے گندم کی دو تین بوریاں سر پر لاد رکھی ہوں۔ ابھی انہوں نے گھر کے اندر داخل ہونے کے لئے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ''میاں جی اس دفعہ کس کی قربانی کر رہے ہیں''۔ میاں جی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شریف نائی تھا۔ ایک تو نائی اور اوپر سے مسکرا بھی رہا تھا۔ میاں لچھن نے اپنا نیفہ ٹٹولا کہ شائد کوئی پسٹل نکل آئے۔ اپنے تھیلے کو ہلایا کہ کوئی کلاشنکوف چھپی ہو تو نظر آ جائے۔ جس سے اس شریفے کا بھیجا اڑا دیں۔ میاں جی نے گلی میں ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں اینٹ پڑی نظر آ جائے۔ جسے اٹھا کر اس ناہنجار کے سر پر دے ماریں۔ اتنے میں بیگم لچھن اپنی چھٹی حس کے ساتھ دروازے پر آ گئیں۔ اور بیرونی حالات سے بے خبر میاں جی کو اندر کھینچ کر لے گئیں۔ شریف نائی حیرت زدہ سا ہو کر آگے بڑھ گیا۔ یوں چشم فلک گلی میں، میاں لچھن کے گھر کے عین سامنے، خون کی ندیاں بہتا دیکھنے سے محروم رہ گئی۔

بات دراصل یہ تھی کہ بڑی عید کو دس روز رہ گئے تھے۔ مگر میاں لچھن کا آنگن کسی میمنے کی مے مے یا بکرے کی بے بے کی گونج سے خالی چلا آ رہا تھا۔ میاں لچھن ہر سال قربانی ضرور کرتے تھے۔ کبھی حصہ ڈال کر اور کبھی چھوٹا جانور خرید کر۔ بکرا ایک ماہ پہلے ہی خرید لیا جاتا۔ میاں صاحب کے پاس اور کوئی مصروفیت تو تھی نہیں ایک ماہ تک اسے ٹہلاتے، نہلاتے اور گلیوں میں بکھرے سبزیوں کے پتوں اور پھلوں کی باقیات کو کھلاتے گزر جاتے۔ لیکن اب کی بار ایسا لگتا تھا جیسے یہ گھر کسی کی چشم بد کی زد میں آ چکا ہو۔ گزشتہ چھ ماہ سے آمدنی میں خسارہ ہی خسارہ چلا آ رہا تھا۔ چھ ماہ قبل بیگم لچھن کی ایک دور کی رشتہ دار پندرہ دن میں واپسی کا وعدہ کر کے میاں لچھن کی دو ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم ادھار لے گئی تھی۔ ابھی تک خود اس دور کی رشتہ دار کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ رقم کہاں سے واپس آتی۔ افواہ یہ تھی کہ وہ اپنے دو بچے سابقہ سسرالی گھر چھوڑ کر نئے جیون ساتھی کے ساتھ نئی مہم پر روانہ ہو چکی تھی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ میاں لچھن کی تنخواہ چند ماہ سے برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ اکاؤنٹس برانچ والے اس کا قصور وار بنک والوں کو ٹھہرا رہے تھے۔ جبکہ بنک والوں کا کہنا تھا کہ اکاؤنٹس برانچ نے ان کی تنخواہ کے بل پر بنک اکاؤنٹ نمبر درست نہیں لکھا تھا۔ اس لئے ایک ماہ کی تنخواہ کسی اور

اسٹاک مارکیٹ اور چنے کی دال

مجھے اسٹاک مارکیٹ کے بارے میں زیادہ علم نہیں، بس ٹی وی پر کچھ پوائنٹس کے گھٹنے بڑھنے کا سنتا رہتا ہوں۔ آج بھی کچھ پوائنٹ بڑھنے کا سُنا۔۔۔غور کرنے پر میرے موٹے دماغ میں جو کچھ آیا وہ کچھ یوں تھا کہ ”اگر پہلے اسٹاک مارکیٹ میں ۱۰۰۰ روپوں کی سرمایہ کاری تھی تو ان اسٹاک مارکیٹ میں ۱۳۰۰ روپے کی سرمایہ کاری ہے۔ ترقی تو ہے۔۔۔ابھی اس ترقی پر پوری طرح خوش نہ ہوا تھا کہ بیگم نے آواز دی ”آدھا کلو چنے کی دال تو لا دیجئے!“ اور ۱۴۰ روپے فی کلو کے حساب سے آدھا کلو دال کے ۷۰ روپے ادا کئے اور واپسی میں دماغ میں جو کچھ آیا وہ یہ تھا کہ ”پہلے اسٹاک مارکیٹ میں چنے کی دال میں سرمایہ کاری کرتی تو ۵۲ روپے کلو کے حساب سے ۱۰۰۰ روپوں میں تقریباً ۲۰ کلو دال خریدی جاسکتی تھی اور اب اسٹاک مارکیٹ میں چنے کی دال میں سرمایہ کاری کی جائے تو ۱۳۰۰ روپے میں ۹ کلو سے زیادہ دال نہیں خریدی جاسکتی۔

اعظم نصر

اکاؤنٹ میں چلی گئی تھی۔ اب جب تک وہ حساب برابر نہیں ہوتا۔ تنخواہ جاری نہیں ہوگی۔ دو اداروں کے درمیان چپقلش کا نتیجہ میاں پُھن کے گھر میں فاقوں کی صورت میں جلوہ گر ہو رہا تھا۔

بیگم پُھن، میاں صاحب کی حالت سے نہ صرف واقف تھی بلکہ گاہے بگاہے ان کی ڈھارس بندھاتی، انہیں ہمت اور حوصلے سے کام لینے کی تلقین بھی کرتی جاتی۔ ایک دن ایسے ہی دو رکنی اجلاس میں جب بیگم نے انہیں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی تلقین کی تو میاں تڑاخ سے بولے ”پُھن کی ماں، کئی بار اس سے بھی زیادہ تلخ حالات کے باوجود میں نے آج تک تمہارا دامن نہیں چھوڑا، صبر کا دامن کیسے چھوڑ سکتا ہوں“۔

اس شام، کدو دال نصف نصف روٹی کے ساتھ تناول فرمانے کے بعد جب حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کی باری آئی تو بیگم پُھن نے لجاتے ہوئے کہا: ”اگر کہیں تو عید کے دنوں میں ہم فیصل آباد خالہ زری کی بیٹی رمشا کے گھر نہ چلے جائیں۔“

”پاگل ہوئی ہے کیا“ میاں پُھن چیخے۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ بیگم حیرانی سے بولیں

”چند سال پہلے بھی تو ہم وہاں گئے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی“

”اس وقت بات اور تھی“ میاں بولے ”اس کے اب پورے چھ بچے ہیں۔ ایک ایک کو پانچ پانچ سو روپے عیدی دئے تو۔۔۔“

”یہ چھوٹی عید تھوڑی ہے جو انہیں عیدی دینی ہے“۔

”بس یہی تم میں عقل کی کمی ہے“ میاں پُھن بڑی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے ”عید عید ہوتی ہے۔ چھوٹی ہو یا بڑی۔ نہ بابا میں تو نہ جاؤں گا۔ میرا دل تو کچھ اور ہی کرنے کو چاہ رہا ہے۔ آمدنی کی آمدنی اور ثواب کا ثواب“

”ہائیں“ بیگم پُھن مسکراتے ہوئے بولیں۔ جیسے انہیں میاں پُھن کی بات پر یقین نہ ہو۔ ”اب تک تو سوائے نوکری کے کوئی ڈھنگ کا کام تو کیا نہیں۔ آمدنی کہاں سے ہوگی“۔

”ہے، ہے۔ میرا دوست ہے پریس والا۔ اس نے فضائل قربانی پر ایک کتابچہ شائع کرایا ہے۔ آج کل ہزاروں کی تعداد میں لوگ قربانی کے لئے ٹرین کے ذریعے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ کیوں نہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور کتابچے کی کچھ کاپیاں لے کر ٹرین پر سوار ہو جاؤں۔ لوگ ثواب دارین کے لئے ضرور خریدیں گے۔“ میاں پُھن نے اس منصوبے سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”آج کل کئی جیب کترے ہاتھوں میں نماز اور اسی طرح کے کتابچے لے کر بسوں اور ٹرینوں میں وارداتیں کرتے ہیں۔ تمہاری تو شکل بھی۔ . . . . .“ بیگم نے ایک پیاری سی چپت ان کے سر پر لگاتے ہوئے کہا ”کسی نے جیب کترا سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا تو؟ میں کہاں ضمانت کرواتی پھروں گی“۔

میاں پُھن اپنے اس عظیم منصوبے کی بیگم کے ہاتھوں یوں درگت بنتے دیکھ کر اداسی اور مایوسی کی گہری لپیٹ میں آ گئے۔ پھر اچانک یوں اچھلے جیسے جوانی کے دنوں میں انہیں بیگم چٹکی بھرا کرتی تھی۔ بیگم کو وہ دن یاد آ گیا۔ فوراً بولیں ”میں نے تو کچھ نہیں کیا“۔

’’کیوں نہ میں لاہور کے کسی باغ میں جھولے لگالوں۔ بچے خوش ہوں گے ۔ کچھ تو پیسے ہاتھ آئیں گے‘‘۔ میاں لچھن کی آنکھوں میں چمک تھی۔لیکن یہ چمک بھی بیگم نے اسی لمحے یہ کہہ کر چھین لی ’’اسی لئے میں کہتی ہوں ہر وقت گھر میں پڑے رہنے کی بجائے کچھ باہر جا کر دنیا کے حالات بھی معلوم کرلیا کرو۔ بڑی عید پر بڑے تو کیا بچے بھی جھولے لینے نہیں آتے ۔ وہ گھروں میں سیخ کباب اور دیگر گوشت پکوانوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ یا پک نک پر چلے جاتے ہیں۔‘‘

میاں لچھن اس استعاری انکشاف پر ایک دفعہ پھر چکرا گئے ۔لیکن پھر سنبھلے اور ایک مزید وار کیا ’’اچھا اب اعتراض نہ کرنا۔اپنے فلسفوں کی پوٹلی بند ہی رکھنا‘‘

’’اب کیا ترکیب اس ذہن نارسا و بے صدا میں آئی ہے‘‘، بیگم لچھن یوں سنبھل کر بیٹھ گئیں جیسے انڈیا اور پاکستان کی فوجیں اس انتظار میں مورچہ بند ہو جاتی ہیں کہ کب دشمن کی طرف سے گولی آئے اور وہ توپوں کے منہ کھول دیں۔

’’بیگم ذرا ہوش کے ناخن لو۔ ہمیں پیسوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔اور عید پر گوشت کی بھی۔ وہ عید قربان ہی کیا جس میں چھٹانک بھر گوشت بھی کھانے کو نہ ملے۔‘‘ میاں لچھن کے ذہن میں کوئی نیا منصوبہ پکتا ہوا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ پھر وہ خود ہی بولے ’’میرا خیال ہے کسی بڑے شہر میں جا کر ٹنڈ کروالوں اور ہرا چولا پہن کر گوشت اکٹھا کروں۔ جس گھر سے گوشت نہ ملے گا وہاں سے پیسے ہی سہی‘‘۔

ٹنڈ کا سنتے ہی بیگم لچھن کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ انہوں نے صحن میں ادھر اُدھر یوں دیکھا جیسے کوئی ڈنڈا نما چیز ڈھونڈھ رہی ہوں جس سے میاں جی کی اس جرأت پران کی تواضع کی جا سکے۔ ’’دیکھیں جی میں اس گھر میں ہر زیادتی برداشت کر سکتی ہوں لیکن ٹنڈ والا بندہ برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ دن بھول گئے جب تمہارے سر میں جوؤں نے زخم کر دئے تھے اور تم ٹنڈ کروا کر گھر آئے تھے۔‘‘ بیگم لچھن کا چہرہ پہلے سرخ پھر غضب ناک ہو گیا۔

میاں بیوی کے اس رشتے میں ایک بات طے تھی۔اول بیگم کو ٹنڈ والے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ چاہے وہ ان کا شوہر نامدار ہی کیوں نہ ہو۔ بازار میں یا گلی میں گزرتے ہوئے اگر کوئی ٹنڈ والا نظر آجاتا تو راہ بدل لیتی تھیں۔اس کے پیچھے کیا راز تھا یا کس قسم کی کڑوی میٹھی یادیں وابستہ تھیں، میاں لچھن کو کبھی پوچھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی تھی۔ دوسری بات، میاں لچھن کو بیگم کی غضبنا کی سے بہت ڈر لگتا تھا۔بیگم کو ذرا غصہ آنا شروع ہوا اور میاں لچھن کے اوسان خطا ہونا شروع ہو گئے۔ یہی وہ ظالم لمحہ ہوتا تھا جب بیگم کا ہاتھ بھی اٹھ جاتا تھا۔ اگرچہ بعد میں اپنے زمینی خدا سے دست بستہ معافی کی طلبگار ہوتی تھیں۔لیکن میاں لچھن کئی دن کی مالش اور ٹکور کے بعد ہی واپس اس دنیا میں آنے کے قابل ہوتے تھے۔ بیگم کی دھمکی سے انہیں بارہ سال پہلے کا حادثہ یاد آ گیا جب وہ کسی سیانے کے کہنے پر ٹنڈ کروا بیٹھے تھے۔ ہوا یوں تھا کہ ان کے سر میں جوئیں پیدا ہوگئیں جنہوں نے اس جوش و خروش سے خون پینا اور کاٹنا شروع کیا تھا کہ سر میں ہر وقت خارش رہنے لگی۔ بلکہ پیپ سی پیدا ہوگئی۔ میاں لچھن کا خیال تھا کہ بیگم گھر میں صفائی کا خیال نہیں

کہا جاتا ہے کہ سندھ میں نئے پٹواریوں کی نوکریوں کے لئے سینکڑوں نوجوان کوششیں کر رہے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ وہ پٹواری ہی کیوں بننا چاہتے ہیں، وجہ ظاہر ہے کہ پٹواری کے پاس ہی زمینوں کا حدود اربعہ اور کھیتوں کی حدود کا نقشہ ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس کا کھیت کہاں سے کہاں تک ہے مگر اس بار کے سیلاب میں تمام نقشے مٹ گئے، تمام حدود فنا ہو گئیں، اب تو اندازے سے بتانا بھی مشکل ہے کہ کونسا گاؤں کہاں آباد تھا کیونکہ بے شمار گاؤں صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں، جہاں کہیں ایک بڑا باغ تھا وہاں شاید دو چار درخت ہی سلامت رہ گئے ہیں، گھروں کا حال یہ ہے کہ پہلے وہ کھنڈر بنے پھر یہ کھنڈر بھی معدوم ہو گئے۔۔۔اب نئی حد بندیاں ہوں گی، نئے سرے سے تعین کیا جائے گا لیکن اپنے گھروں کا تعین کرانے والے سیکڑوں لوگ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لہٰذا پٹواری کی ملازمت کے خواہش مندوں سے یہ پوچھنا بے کار ہے کہ آخر وہ پٹواری ہی کیوں بننا چاہتے ہیں، ظاہر ہے کہ پٹواری ہی بتائے گا کہ جہاں اب ویرانہ ہے وہاں آبادی کہاں کہاں تھی اور پٹواری کی یہ صوابدید اور کھیتوں کی نئی حد بندیاں کس قدر منفعت بخش ہوں گی اس کا اندازہ مشکل نہیں ہے کیونکہ وہ جو غریب دیہاتی تھے صرف وہی مرے ہیں، جاگیرداروں اور وڈیروں میں سے کسی کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ سیلاب کے ہاتھوں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

اطہر شاہ جیدی

رکھتیں، جس کی وجہ سے بستر میں جوئیں پیدا ہوگئیں تھیں۔ جبکہ بیگم لچھن کا خیال بلکہ پکا یقین تھا کہ میاں جی کے سر میں جوئیں اس تکئے سے چڑھی ہیں جوانہوں نے پڑوسن کو بڑے چاؤ سے اس کے گھر میں شادی کے موقع پر مہمانوں کی خاطر داری کے لئے دیا تھا۔ میاں لچھن نے اس دردسری سے نجات کے لئے سرکاری ہسپتال سے رجوع بھی کیا۔ لیکن افاقہ کہاں ہونا تھا۔ بھلا سرکاری ہسپتال کی دواؤں سے بھی کسی کو افاقہ ہوا ہے۔ سر کے حالات بگڑتے دیکھ کرانہوں نے ایک ''سیانے'' سے اس کا حل پوچھا۔ جس نے فوری طور پر ٹنڈ کرانے کا مشورہ دیا۔ یہ طریقہ علاج سستا بھی تھا، قابل عمل بھی اور سب سے بڑھ کر مجبوری بھی۔ میاں لچھن کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بیگم علاج کے طور پر کرائی گئی اس ٹنڈ پر اس قدر شدید ردعمل کا اظہار کرے گی۔ ٹنڈ کرانے پر سنگین نتائج کی دھمکیاں ضرور دیتی تھی مگر آج سب کچھ عملی طور پر ثابت ہوگی۔

اپنی پیاری ٹنڈ کے ساتھ جونہی میاں لچھن نے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ بیگم لچھن نے فوراً دروازہ بند کرلیا اور اس وقت تک گھر میں داخل ہونے سے منع کر دیا جب تک سر پر قابل قبول بال نہیں اُگ آتے۔ گھر کا دروازہ بند ہوگیا تو میاں لچھن جس دوست کے گھر گئے۔ اور چند دن رہنے کی استدعا کی، اس نے مختلف بہانے سے معذرت کرلی۔ سب طرف سے مایوس ہوکر میاں لچھن آخری ٹھکانے کے طور پر اپنے آبائی قبرستان گئے۔ جہاں اپنی والدہ اور والد مرحومین کی قبروں پر بیٹھ کر زاروقطار رونے لگے۔ سیانے کہتے ہیں رونے میں بھی سُر ہوتا ہے۔ لیکن اس بے وقت، بے طلب، بے مقصد، بے سرے رونے کی آواز سن کر قبرستان کا گورکن گھبرا کر اپنے ایک کمرے پر مشتمل گھر سے باہر نکل آیا۔ اور قریب آکر اس گریہ وزاری کا سبب پوچھا۔ میاں لچھن بھی دل کا اس قدر سادہ نکلا کہ گورکن کو صاف صاف بتا دیا کہ بیگم نے اس کی ٹنڈ کی وجہ سے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب وہ اپنی اماں اور ابا کے ساتھ یہیں سویا کرے گا۔ گورکن کا دل جو روزانہ مردوں کی اکھاڑ پچھاڑ کرتے اور انہی کے ساتھ رہتے، سوتے اتنا نرم نہیں رہا تھا۔ پھر بھی پتہ نہیں اسے کیوں ترس آگیا۔ اس نے میاں لچھن کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اس شرط پر کہ بوقت ضرورت میاں لچھن کو قبر تیار کرنے میں اس کا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ گورکن نے مزید مہربانی کرتے ہوئے ان سے وعدہ کیا کہ ہاتھ بٹانے کی صورت میں وہ ان کی مالی طور پر خدمت بھی کیا کرے گا۔ سودا مہنگا نہیں تھا۔ اس طرح گورکن کے ساتھ گزارے چند دن ان کی زندگی کے سنہرے دن ثابت ہوئے۔ شام کے وقت کسی نہ کسی گھر سے کھانا آجاتا تھا۔ جو دو آدمیوں کی ضرورت سے بھی زیادہ ہوتا۔ باقی کھانا صبح کام آجاتا۔ واہ ری ٹنڈ، کتنی بھاگاں والی نکلی تھی۔

میاں لچھن اور بیگم لچھن کے درمیان بڑی عید کے پروگرام پر مذاکرات جاری تھے۔ اب میاں لچھن کے سامنے ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ انہوں نے ہار مانتے ہوئے کہا ''بیگم آخر تم ہی بتاؤ، ہم یہ دن کیسے گزاریں۔ ایک طرف پائی پائی کے محتاج ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف قربانی کرتے تھے تو محلے میں کچھ عزت تھی، اب تو وہ بھی سلامت رہتی نظر نہیں آتی۔ کچھ ایسا کرو کہ ۔۔۔۔ بس لوگوں کی نظروں میں بھی نہ آئیں''۔

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے''۔ بیگم لچھن بولیں۔

''کیا ؟ کیا؟ جلدی بولو''۔ میاں لچھن اچھلے۔

''تم ایسا کرو۔ یہ جو دس بند باقی بچے ہیں ناں، تم شیدو قصائی کی دکان پر بیٹھا کرو۔ اور اس سے جانور ذبح کرنے اور گوشت بنانے کا طریقہ سیکھو۔ پھر کسی بڑے شہر جا کر قربانی کرو''

''لیکن مجھے تو گائے اور بڑے جانور کے پاس جانے سے ہی ڈر لگتا ہے!''

''بڑے نہ سہی۔ ایک دو بکرے ہی سہی'' بیگم بولیں ''بڑے شہروں میں کون کسی سے پوچھتا ہے کہ کیسے ذبح کر رہے ہو۔ گھر والے بھی ہاتھ بٹا دیتے ہیں''

اور یہ ترکیب کامیاب رہی۔ میاں لچھن اسی وقت بات کئے بغیر اٹھے۔ اور سیدھا شیدو قصائی کی دکان پر جا پہنچے۔

خادم حسین مجاہد

رَن out

بیسویں صدی اِس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں کئی خوفناک واقعات ہوئے، مثلاً اِس ہیروشیما کی تباہی، کوئٹہ کا زلزلہ اور ہماری شادی وغیرہ۔ یوں تو ہر نوجوان کو نکاح کا ذائقہ ایک نہ ایک دن چکھنا ہی ہوتا ہے لیکن سولہ سترہ سال قبل ہمیں یہ ذائقہ چکھنے کی خواہش شدت سے اس لئے پیدا ہوئی کہ ہمارے عزیز دوست یکا یک شادی شدہ کیا ہوئے ہمیں رنگین وسنگین حالات وواقعات سنا کر شادی کے لئے مشتعل کرنے میں مصروف ہوگئے، پھر شادیوں کا جو سیزن شروع ہوا تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔ بس یوں سمجھیں کہ اور وہ بندہ شاید ہم ہی تھے، انتہا یہ ہوئی کہ اِسی دوران ہمارے ایک ماموں تیسری شادی کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اُن کے وسیع تجربات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم اُن کے گٹوں گوڈوں میں بیٹھ گئے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے والدین کو خوابِ غفلت سے بیدار کریں تا کہ ازدواجی جہاد شروع کیا جا سکے۔

ماموں کی اس تحریک پر خاندان کے طول وعرض میں ہلچل مچ گئی اور مقصد کے حصول کے لئے خاندانی ''میرج بیورو'' تشکیل دی گئی اور سن گن کے لئے چاروں طرف ہرکارے دوڑا دیئے گئے۔ رشتوں کی تو کمی نہ تھی مگر کسی بھی رشتے پر خاندان بھر کا اتفاق ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کیونکہ ہر ایک کا اپنا معیار تھا، جس سے دوسروں کا اتفاق ہونا ممکن ہی نہ تھا اور جیسا کہ معمول ہے کہ اس معاملے کے مرکزی کردار یعنی ہم سے کوئی رائے لینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی گئی جیسے یہ شادی ہماری نہیں، اُن کی ہورہی ہو۔ ویسے عموماً ہوتا یہی ہے کہ والدین اپنی شادی پسند سے نہ ہونے کا بدلہ اپنی اولاد کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کر کے لیتے ہیں۔ جوں جوں شادی لیٹ ہوتی ہے تو لڑکے اور لڑکی کی ڈیمانڈ محدود ہوتے ہوتے بس صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ''لڑکی ہونی چاہئے'' یا ''لڑکا ہونا چاہئے''۔

شادی کے محاذ پر لشکر کشی کے بعد کئی ماہ کی سر توڑ کوششوں اور محاصرے کے باوجود منگنی نامی قلعہ فتح نہ ہوسکا تو میر جعفر اور میر صادق کی تلاش شروع ہوئی اور مخبری پر کھلے حملے سے قبل ایک خاندان سے ازدواجی جھڑپوں کے بعد جب اُنہیں دعوتِ مبارزت دی گئی تو اُنہوں نے جوابی حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان کا واسطہ ہمارے خاندانی آثار قدیمہ سے پڑ گیا کیونکہ باقی لوگ تو دسترخوان سجانے میں مصروف تھے۔ ہماری نانی صاحبہ نے پہلا رجز ہی غلط پڑھ دیا کہ ہمیں رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں، ابھی ابھی میں نے اپنے تیسرے بیٹے کی شادی کی ہے۔

بس یہیں سے فنی خرابی پیدا ہوگئی اور ''معاہدۂ صلح'' یعنی منگنی کھٹائی میں پڑ گیا۔ دراصل وہ لوگ ڈر گئے تھے کہ اُن کے ہاں بار

بار شادیاں کرنے اور طلاقیں دینے کا رواج ہے۔ بڑی مشکلوں سے اور کئی سفارشوں کے بعد انہیں یہ یقین دلایا جاسکا کہ یہ ہماری ننھیالی روایت ہے، ددھیالی تاریخ ایسی نہیں، اس لئے آپ پریشان مت ہوں، یوں خدا خدا کرکے معاہدہ صلح طے پایا۔

منگنی نامی قلعہ روند کر پیش قدمی کرتے ہوئے شادی نامی قلعے کو محاصرے میں لے لیا گیا لیکن مخالفین کی ایک لمبی لسٹ کے ساتھ قلعہ بندی کے باعث محاصرہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ شدید گرمی اور حبس کے باعث سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا۔ جرنیلوں نے امن وامان کے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی بڑے حملے کے لئے مزید بھرتی کا اعلان کر دیا، جس کے لئے دور و نزدیک اطلاعات بھجوادی گئیں۔ اس کا ردعمل بھی جلد ظاہر ہونا شروع ہو گیا، ایک دوست نے لکھا ''ٹھہرو میں آ رہا ہوں'' (پرنس کاشمیری) دوسرے نے لکھا ''جو بلا اب تم پر نازل ہونے والی ہے اس کے بعد تم ریموٹ کنٹرول سے چلا کرو گے اور ریموٹ کنٹرول اس بلا کے ہاتھ میں ہوگا۔'' (ارشاد)۔ تیسرے نے گل افشانی کی ''ہمارا تو خیال تھا کہ تم اکیسویں صدی میں کنوار پن کو سینے سے لگائے داخل ہو گے مگر تمھارے بڑوں نے اس سے قبل ہی تمھارے کنوار پن کا جنازہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہم اسے کندھا دینے اور آخری رسومات میں شریک ہونے ضرور آئیں گے، بس یہی خیال رہے کہ کنوار پن کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' (بابا شوقی)۔ ایک اور دوست نے ماہرانہ رائے دی ''شادی کے مرض سے بچا جاسکتا ہے، کبھی شوہر کے پاس بیٹھ کر اس کا رونا دھونا سننے سے اُس کے حالات سے آگاہ ہونے سے لیکن یہ مرض کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے، اگر دولہا کے پاس بیٹھا جائے اور اُس کے ولیمے کے چاول کھالئے جائیں اور دلہن کی سہیلیوں کو میک اپ میں دیکھ لیا جائے۔ اس مرض کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جو بغیر شادی کرائے دور نہیں ہوسکتیں لیکن شادی کے بعد غلط فہمی دور ہو بھی جائے تو کیا فائدہ "(ایم مسعود تنہا)''۔ ایک دوست نے ازراہِ عنایت آبادی کی منصوبہ بندی کے عنوان سے شادی کارڈ تیار کر کے بھجوادیا:

''مکرمی ومحترمی ۔۔۔۔۔۔۔السلام وعلیکم

ہمارے خودسر، ناخلف الرشید، دوچشمی ہمراہ چشم خادم حسین مجاہد (اللہ اس کے شر سے ہر ایک کو محفوظ رکھے) مدیر آمنہ فلاں اینڈ فلاں کی شادی خانہ آبادی غیر متوقع طور پر نجانے کیسے طے پا گئی ہے۔ آپ سے گذارش ہے کہ تشریف لائیں تاکہ دو چار بندے برات کے لئے جمع ہوسکیں۔ تمام اوقات کا کھانا ہمراہ لائیں تاکہ کسی سے مانگنا نہ پڑے، ورنہ شہادت اور شرمندگی نصیب ہوگی۔ بچے کو اپنی دعاؤں میں رخصت کریں۔

پروگرام (اگر برادری مان گئی تو)

رسم حنا رات بارہ بجے زبردستی ہوگی کیونکہ دولہا ہندووانہ رسم ورواج کے خلاف ہے)۔

سہرابندی برات والے دن نو بجے صبح دولہے کو کھینچ کر بستر سے نکالا جائے گا اور ٹھنڈے پانی سے غسل دے کر سہرا باندھ کر گیارہ بجے دھوپ میں رکھ کر اس کے نام کی سلامیاں لوٹنا شروع کی جائیں گی۔

روانگی برات اگر کسی گاڑی والے سے بھاؤ تاؤ ہو گیا تو گیارہ بجے روانہ ہوگی۔

نکاح مسنونہ قاضی کے آنے پر شروع ہوگا اور لڑکی کے مان جانے تک جاری رہے گا۔

دعوت طعام حکومتی پابندی کے باعث چائے پانی پر ٹرخایا جائے گا کیونکہ دلہن والوں کے پاس حکومتی پابندی کا معقول جواز موجود ہے۔

رخصتی جب دلہن تمام رشتہ داروں سے گلے مل کر رونا دھونا ختم کرلے گی تو میک اپ دوبارہ درست کیا جائے گا، اِس دوران کچھ فتنہ جو رشتہ داروں کی وجہ سے لڑائی کا امکان بھی ہے، لہٰذا دولہا دلہن اُن رشتہ داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جلد فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ گذارش ہے کہ اس موقع پر براتی بھی کھسک لیں ورنہ سر پھٹول کا اندیشہ موجود ہے۔

منجانب شرکت پر زبردستی تیار۔ میرزا رقیب

نمونہ کا یہ کارڈ لے کر ہم ڈیزائن پوائنٹ پر پہنچے اور اپنے ڈیزائنر دوست کو مواد دیتے ہوئے کہا ''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا غلامی کا کارڈ تیار کرنے کی سعادت آپ حاصل کریں تا کہ مستقبل کا مؤرخ اِس تاریخ ساز واقعے کے حوالے سے ہمارے ساتھ ساتھ آپ کا نام بھی سنہرے لفظوں میں درج کرے۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ مؤرخ اِس کارنامے پر ہمارا نام سنہری لفظوں میں لکھتا ہے یا سیاہ حرفوں میں'' ڈیزائنر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شادی سے ایک دن قبل ملک بھر سے کئی نوجوان شاعر ادیب ہمارا تماشہ دیکھنے پہنچ گئے، حالاں کہ ہم تک پہنچنا اِتنا آسان نہ تھا کیونکہ ہمارا علاقہ ہی نہیں، ٹرانسپورٹ بھی نہایت خطرناک تھی۔ اِسی سے دوستوں کی مہم جویانہ فطرت کا اندازہ لگالیں۔

مہندی والی رات مہندی کی رسم سے بھاگ کر میں دوستوں کی محفل میں جا پہنچا جہاں ضعیف رضا تمام مقامی اور غیر مقامی شعراء ادباء کو گھیر کر اپنا دیوان کھولے بیٹھے تھے اور ان بیچاروں کے پاس کوئی راہ فرار بھی نہ تھی۔ مجھے محفل میں شریک ہوتا دیکھ کر انہوں نے پینترا بدل کر کہنا شروع کر دیا ''لوگ شادی میں کھسرے نچاتے ہیں لیکن چونکہ خادم حسین مجاہد شاعر اور ادیب۔ اِس لئے ان کی شادی کے موقع پر بھی شعراء اور ادباء کو ہی زحمت دی گئی ہے اس کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میرا خصوصی سہرا پڑھنا شروع کیا۔

اے دوست تجھے شادی سو بار مبارک
جیون کی یہ بربادی سو بار مبارک
اک سابقہ محبوبہ کی یہ آہ جگر سوز
بیوی سے پڑے روز تجھے مار مبارک
بیگم زدہ اک دوست کا پیغام کہ الحمد
مل بیٹھ کے روئیں گے میرے یار مبارک
اب شوق سے اس حاصل ارمان کو بھگتو
ڈولی میں سجا لائے جو آزار مبارک
لے آئے ہو نوخیز سی اک نار عقد میں
لے جائے گی یہ کھینچ کے فی النار مبارک
وہ کار جو آجاتی تو کیا کار نہ کرتی
اس دور میں ہو بیویٔ بیکار مبارک
سہرے میں چھپے چہرے کو سالی نے جو دیکھا
دلہن سے کہا شوہرِ دمدار مبارک
شادی شدہ ہوتے ہیں کنوارے بھی پریشاں
یہ جیت ہے یا ہار میرے یار مبارک
لکھا ہے بصد شوق رضا میں نے یہ سہرا
چہرے پہ برستی ہوئی پھٹکار مبارک

دوسرے دن تقریباً سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا اپنے تجربات کی روشنی میں مرزا رقیب نے خدشات کی صورت نمونے کے کارڈ میں ظاہر کیا تھا چونکہ تمام معاملات تقریباً پہلے ہی طے پا چکے تھے اس لئے مقررہ تاریخ کو قاضی نے نکاح نامی دروازہ کھول کر فوجوں کو داخل ہونے دیا اور شہر کے مرکز میں ہمارے کنوار پن کو تۂ تیغ کر کے رخصتی کی زنجیروں سے جکڑ دیا، یوں اِس طویل اور صبر آزما محاصرے کا اختتام ہوا اور خانگی جنگوں کے نئے سلسلے کی بنیاد رکھی گئی۔ مولوی صاحب نکاح پڑھا رہے تھے کہ ہمارے ایک شادی شدہ دوست نے سرگوشی کی ''اب بھی وقت ہے ہم سے عبرت حاصل کرلو اور راہِ فرار اختیار کر سکتے ہو تو کرلو۔''

مگر اس وقت، وقت کہاں تھا اور نہ ہی فرار کا کوئی چانس تھا۔ پھر کچھ دوستوں نے جو سبز باغ شادی شدہ زندگی کے دکھائے تھے ان کی وجہ سے ہم نے بخوشی اپنے پروانۂ آزادی پر دستخط کر دیئے۔ ریفریشمنٹ کے بعد ''آخری رسومات'' کے لئے بلاوا آ گیا۔ لیڈیز سیکشن مین رنگ و نور کے سیلاب میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑی سالی سجی ہوئی پلیٹ والے گلاس میں دودھ لائی، گلاس پر ڈھکن اور اندر اسٹرا تھا کئی دوستوں کی شادیوں میں ہمیں بطور شابالا اس دودھ سے واسطہ پڑ چکا تھا، جس میں عام طور پر کوئی نہ کوئی واردات ہوتی تھی۔ یا تو سرے سے دودھ ہوتا ہی نہ تھا بلکہ پانی ہوتا یا دودھ میں پانی چینی کی جگہ ڈھیر سارا نمک مرچ ہوتا۔ اور اگر دودھ ٹھیک ہوتا تو اسٹرا ایلفی سے بند ہوتا۔ جب ہم

نے اسٹرا سے دودھ پینے کی کوشش کی تو حسب توقع وہ بند تھا لہٰذا ہم نے ڈھکن اتار کر اسٹرا نکال کر منہ سے لگا لیا۔ ابھی بمشکل ایک گھونٹ ہی پیا ہوگا کہ چیٹنگ کہہ کر واپس لے لیا گیا اور پھر پانچ ہزار روپے مانگ لئے گئے۔ ہم نے ہزار کے نوٹ کے اوپر پانچ کا نوٹ رکھ کر دینے کی بڑی کوشش کی کہ یہ پانچ ہزار ہی ہیں مگر بے سود۔ پورے ہی دینے پڑے، یوں ایک گھونٹ دودھ پانچ ہزار میں پڑا، مگر یہ تو صرف آغاز تھا۔ رخصتی کے بعد رات کو گھر پہنچے اور دلہن کو محلے دار عورتوں اور رشتہ داروں کے دیدار کے لئے بٹھا دیا گیا۔ ان دنوں آج کی طرح دولہے کو ساتھ نہیں بٹھایا جاتا تھا لہٰذا ہمیں رات بارہ بجے تخلیہ میسر آیا۔ ہم حسب عادت بولنا شروع ہوگئے تو پتہ ہی نہ چلا کہ دلہن کب کی سوگئی ہے جبکہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سن رہی ہے اور جھجک کی وجہ سے ہوں ہاں نہیں کر رہی۔ اس لئے جگا کر سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

ولیمے کے بعد ہنی مون کے لئے مری گئے اور سلامی کی رقم ٹھکانے لگا کر واپس آگئے تو بذریعہ ڈاک مبارکبادوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

گل نوخیز اختر نے لکھا ''بھابھی مبارک۔ امید ہے مقامی تھانے میں رپورٹ درج کرادی ہوگی۔''

بابا شوقی نے شرانگیزی کی ''مبارکباد! جب ہماری شادی ہوئی تھی محلے کی لڑکیوں اور ان کے والدین نے ''یوم نجات'' تھا تمھاری شادی پہ کس کس نے یومِ نجات منایا؟''

سعید رضا نے ارشاد فرمایا

اے دوست تجھے شادی صد بار مبارک
اک جیتی ہوئی بازی کی یہ ہار مبارک
کہتے ہیں یہ روتے ہوئے کچھ دوست کنوارے
یہ مقطع آزادی صد بار مبارک

آخری درویش نے پھلجڑی چھوڑی ''کل نفسِ ذائقۃ الموت۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

ابن عاصی نے شرانگیزی کی ''مبارک باد بھابھی کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی بنا بنایا خادم بطور خاوند مل گیا۔''

محسن احسان نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا ''آخر تم نے بھی سپر پاور سے ٹکر لے لی سمجھو کہ اب تمھاری مجاہدانہ زندگی کا اینڈ آگیا میری طرف سے تمھیں زندگی کی آخری حقیقی خوشی مبارک ہو۔''

سعید انجم نے لکھا ''میں آپ کو زندگی کے نئے سفر کے آغاز پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

خالد یوسفی نے ارشاد کیا

ہنستے روتے یا منتیں کرتے
بیویاں جن کی اک سے زیادہ ہوں
آپ کہتے تھے شہزادہ ہے
ایک بیوی تو آپ لے آئے
تین کا کب تلک ارادہ ہے

ڈاکٹر شفقت علی نے یوں پرسہ دیا ''سمجھ میں نہیں آتا کہ مبارکبادوں یا اگر پہلے پتہ چل جاتا تو میڈیکل سرٹیفکیٹ ہی دے دیتا کہ بخوشی مجاہد کنوارا ہی بھلا۔ بہتر یہ ہے کہ اب تم اپنا نام مجاہد سے اسیر رکھ لو۔''

دراصل شادی انسان کی نشاۃ الثانیہ ہے۔ شادی کرنا بہت آسان ہے مگر بیگم نبھانا بہت مشکل ہے۔ شادی کے بعد ''آؤٹ ڈور گیمز'' کم ہو جاتی ہیں کیونکہ شادی بذات خود ان ڈور گیم ہے۔ بقول آخری درویش، میری بہت سی بیویاں ہیں پھر میں امیر کیسے ہوسکتا ہوں۔ دراصل ایک بیوی ہی اتنا خرچ کر دیتی ہے کہ بندہ دوسری کا سوچے ہی نہیں۔ خود ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ بیویاں کم از کم دو ہونی چاہئیں تاکہ اوقات میں رہیں، لیکن اب یہی خیال ہے کہ ایک بھی زیادہ ہے حالانکہ شرع میں بھی گنجائش موجود ہے اور دل میں بھی۔۔۔ ویسے دنیا میں عورتوں کی آبادی مردوں سے زائد ہے کیونکہ مردوں کی شرح اموات زیادہ ہے اور اس کی وجہ بھی عام طور پر عورتیں ہی ہیں۔ اِن زائد عورتوں کے لئے صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے کہ کچھ مجاہد آگے بڑھ کر عقد ثانی کی قربانی دیں، ہم تو توبہ تائب ہو چکے۔

مزاحیہ

م۔ ص۔ ایمن

مراثی کی قبر

بعض تحریریں مدتوں یاد رہتی ہیں جو سڑکوں پر گاڑی چلاتے ہیں اور بالخصوص اپنی ذاتی گاڑی چلاتے ہیں جب ان کے رستے میں کسی میراثی کی قبر آئے گی تو انہیں ہماری یہ تحریر یقیناً یاد آئے گی۔

راستے کی رکاوٹ دور کرنا اگرچہ بھلائی کا کام ہے لیکن اس کے برعکس آج کل راستہ بند کرنا اور اس نیت سے بند کرنا کہ کوئی بھی ''یہاں سے گزر کر تو دکھائے''؟ جمہوری حق بن چکا ہے جس کا جہاں چاہا شامیانہ تان کر راستہ بند کر دیا۔ کسی بھی گزرگاہ پر بیریئر لگا کر عام لوگوں کا راستہ بند کر دیا۔ کسی بھی اہم شاہراہ پر دھرنا دے کر ملازمت پر، روزگار پر جانے والوں کا راستہ بند کر دیا جہاں چاہا سڑک کے بیچوں بیچ ''اچھلو'' بنا دیے۔ اچھی خاصی چلتی ہوئی گاڑی بھی اچھل اچھل جاتی ہے اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ اس 'اچھلو' پر اس طرح اچھل پڑتے ہیں کہ بعض اوقات ان کا سر گاڑی کی چھت سے جا ٹکراتا ہے۔ یہی حال رہا تو عنقریب ہی ٹریفک قوانین میں تبدیلی ناگزیر ہو جائے گی اور 'روڈ سائن' کے کتابچے میں شامیانہ تنا ہوا دکھایا جائے گا جس کا مطلب ہوگا ''آگے سڑک پر شامیانہ لگا ہے متبادل راستہ اختیار کریں۔''

ایک سائن میں تین تین وکٹیں گڑی دکھائی جائیں گی جس کا مطلب ہوگا ''گلی میں کرکٹ کھیلی جا رہی ہے۔''

جنازے کی چارپائی دکھائی جائے گی کہ ''گلی میں میت رکھی ہے۔''

خالی سڑک پر بے شمار سر ہی سر دکھائے جائیں گے کہ پریشان لوگ! لوگوں کو پریشان کرنے کے لیئے دھرنا جمائے بیٹھے ہیں۔

انسان ناہموار رستے پر دیکھ بھال کر قدم رکھتا ہے جبکہ ہموار سطح پر بلا کھٹکے چلتا چلا جاتا ہے۔ گاڑیاں بھی ناہموار رستوں پر جھولا جھلاتے سفر کرواتی ہیں اور گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص سوچتا ہے کہ اس گاڑی کی نسبت پیدل چل کر وہ اپنی منزل پر جلد پہنچ سکتا تھا۔

گاڑی پر سفر کرنے کا واضح مطلب ہوتا ہے وقت کی بچت۔ سڑک گاڑیوں کے لیے بنائی جاتی ہے تاکہ گاڑیاں بغیر کسی رکاوٹ کے رواں رہیں۔ کچھ لوگ سڑک پر ٹھیلے کھڑے کر کے یا میزیں لگا کر کاروبار کرتے ہیں۔ گاڑیوں کی رفتار کم رکھنے کے لیے سڑک پر 'اچھلو' یعنی جمپ بنا دیے جاتے ہیں۔ اس کا عام مطلب یہی ہوتا ہے کہ سڑک! گاڑیوں کے لیئے نہیں بلکہ پیدل چلنے والوں کی سہولت کے لیئے ان کے کاروبار کے لیے بنائی گئی ہے۔ ان ''اچھلو'' پر سائیکل موٹر سائیکل سے لے کر ٹرک، کنٹینر، ٹرالر تک کی سپیڈ 'بریک' ہو جاتی ہے اور ''اچھلو'' کے بعد از سر نو چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔

اِن سپیڈ بریکر کا ایک فائدہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ گاڑی میں

سفر کرتا نابینا مسافر اچانک ہی ہانک لگاتا ہے"روکنا بھئی روکنا !میرا گھر آگیا ہے"۔۔دیگر مسافر حیران رہ جاتے ہیں۔۔وہ نہیں جانتے کہ وہ جمپ گن رہا تھا۔

ایک گدھا گاڑی جس میں بیک وقت دو دماغ کام کرتے ہیں ایک گاڑی بان کا اور دوسرا گدھے کا اپنا! گدھا آخر گدھا ہے لیکن اتنا بھی گدھا نہیں ہے کہ اس "اچھلو" کو بھول جائے ۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ جہاں"اچھلو"آیا، گاڑی بان نے گدھے کی راسیں کھینچ کر گاڑی کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی۔اس کے برعکس گدھے نے دو چار گام تیزی دکھائی اور اس"پہاڑی" کو عبور کر گیا۔وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے گاڑی بان کہ خواہش پر رفتار توڑ دی تو اس کے لیے اس'اچھلو' کو پار کرنا مشکل ہو جائے گا۔

جمپ یا سپیڈ بریکر انگریزی نام ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریز کی ایجاد ہے۔'اچھلو' اس کا عوامی نام ہے۔اسے اردو میں کیا کہتے ہیں؟

سکندر صاحب نے خالی رکشہ کو رکنے کا شارہ کیا۔ڈرائیور سے بولے"عوامی چوک تک جانا۔۔اور آنا ہے۔"

رکشہ والا بولا"بیٹھیں صاحب! لے چلوں گا"

حسب دستور چند منٹ کی بحث کے بعد"بھاؤ" طے ہو گیا ۔سکندر صاحب رکشہ میں سوار ہوئے۔۔۔رکشہ چل پڑا۔

ایک جگہ سے گزرتے ہوئے اچانک سکندر صاحب ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بول اٹھے "یہاں سے چلو!"

رکشہ ڈرائیور بولا "یہ رستہ خراب ہے۔۔۔میں آپ کو صاف رستے سے لے چلوں گا۔"

"تم سمجھ کیوں نہیں رہے؟۔۔مجھے جلدی ہے۔۔وقت کم ہے۔۔یہ رستہ شارٹ کٹ ہے۔یہاں سے چلو۔"

رکشہ والے نے رکشہ کی رفتار کم نہ کی اور بولا"صاحب!۔۔آپ فکر نہ کریں میں آپ کو جلدی ہی پہنچا دوں گا"

اِس دوران رکشہ۔۔۔اس"شارٹ کٹ" راستے سے دور نکل آیا تھا۔۔سکندر صاحب بولے"مجھے جانے کی ہی نہیں۔واپس آنے کی بھی جلدی ہے۔میرے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔اس لیئے کہہ رہا تھا کہ شارٹ کٹ اختیار کرو"

وہ بولا"میں آپ کو جلدی ہی واپس بھی لے آؤں گا جناب!۔ یہ راستہ دیکھنے میں طویل لیکن صاف ہے"

سکندر صاحب خاموش ہو گئے۔۔متعلقہ دفتر کے سامنے پہنچے

ترقی پسند افسانوں کے بعد جذباتی افسانے آتے ہیں۔جذباتی افسانوں میں جذبات اور احساسات کی شدت کو نمایاں طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ مختلف جذبوں کے زیر اثر افسانے کے کردار عجیب و غریب حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔مثلاً ایک افسانے میں سریش کو جب پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے نرملا سے شادی نہیں کر سکتا تو وہ نرملا کو اس طرح مخاطب کرتا ہے۔"نرملا! تم آج سے میری بہن ہو۔"

"تمہاری بہن؟"نرملا نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں ہاں میری بہن۔"سریش نے بہن کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔"میں سچ کہہ رہا ہوں۔تم آج سے میری بہن ہو۔کاش کہ تم عمر میں مجھ سے پانچ دس سال بڑی ہوتیں اور میں تمہیں"ماں" کہہ سکتا۔"

اسی طرح ایک افسانے میں دو بھائی ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے ہیں مگر جب چھوٹے بھائی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا بھائی ان دونوں کی مشترکہ محبوبہ سے شادی کرنے کو تلا ہوا ہے تو وہ مندر میں دیوی یا دیوتا کے سامنے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے بڑے بھائی کے ہاتھ میں دے کر خود سادھو بن کر زندگی گزارنے کا حلف اٹھاتا ہے۔جذباتی افسانوں میں قہقہے، آنسو، سسکیاں، قسمیں، بچکولے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔عموماً انجام خودکشی ہوتا ہے اور محبت کے دیوتا کے سامنے عجیب و غریب قربانیاں دی جاتی ہیں۔

سنگ و خشت از کنہیا لال کپور

اور رکشہ والے سے بولے۔''مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔۔ یہ فائل دے کر فوراً ہی آجاؤں گا۔''

وہ بولا''کوئی بات نہیں صاحب!۔۔۔میں انتظار کرلوں گا''

سکندر صاحب کی واپسی واقعی دو منٹ میں ہوگئی تھی ۔۔۔۔رکشہ ڈرائیور نے رکشہ اسٹارٹ کیا اور'یوٹرن' لیا۔

سکندر صاحب جلدی سے بولے''یہاں سے لے چلو! یہ شارٹ کٹ ہے۔۔۔ میرے گھر مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔۔۔ مجھے جلدی ہے۔''

رکشہ ڈرائیور نے رکشہ روک دیا''صاحب!۔۔ یہ رستہ ٹھیک نہیں ہے۔۔میں یہ رستہ استعمال نہیں کیا کرتا۔''

وہ بولے''میں آج ہی دن میں پیدل گزرا ہوں۔۔ یہاں سے یہ رستہ بالکل ٹھیک ہے۔۔تم یہیں سے لے چلو''

رکشہ ڈرائیور مجبور ہوگیا اور رکشہ پھر اسی جانب گھمادیا جس جانب سکندر صاحب نے اشارہ کیا تھا۔

سکندر صاحب بولے''اس دفتر میں میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مجھے جب جلدی نہیں ہوتی تو میں اسی راستے سے پیدل بھی آتا جاتا رہتا ہوں۔۔آج دن میں بھی پیدل ہی آیا تھا۔''

چند گز چلا کر اس نے رکشہ پھر روک دیا۔بولا''صاحب! سچ پوچھیں تو میرا جی بالکل بھی نہیں چاہتا اس راستے سے جانے کو۔۔ اس رستے پر میراثیوں کی قبریں بہت ہیں۔ان کا احترام کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔آپ کو جلدی بھی ہے۔۔۔ پہلے بتادوں۔۔اس رستے سے آپ جلدی نہیں پہنچ سکیں گے''۔۔۔

''میراثیوں کی قبریں''سکندر صاحب حیرت سے بولے ''میں نے تو کبھی نہیں دیکھیں۔۔آج دن میں بھی نہیں تھیں''

''صاحب! آپ کو پتہ نہیں ہے۔اس لیئے کہہ رہے ہیں۔۔ ورنہ تو جب سے یہ سڑک بنی ہے۔۔۔سڑک کے بیچوں بیچ کئی میراثی دفنا دیئے گئے ہیں۔۔اس لیے میں اس راستے سے گزرتا ہی نہیں''۔

''بڑی عجیب بات کہہ رہے ہو!۔۔۔ یہ سڑک بنتے میں نے خود دیکھی ہے۔۔میں نے یہ بات کسی سے سنی بھی نہیں ہے۔''

اُن کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔

''آپ اجازت دیں تو آپ کو اِسی رستے سے لے چلوں جہاں سے آئے ہیں۔اس شارٹ کٹ کی نسبت جلدی پہنچ جائیں گے اور جاتے ہوئے میں آپ کو وجہ بھی بتادوں گا کہ میں یہ شارٹ کٹ کیوں استعمال نہیں کیا کرتا۔''؟

''چلو!۔۔اپنی مرضی کے رستے سے چلو۔۔اور مجھے ان میراثیوں کی قبروں کے بارے میں بھی بتاؤ''وہ اپنی ''جلدی'' کو بھول گئے اور پرتجس لہجے میں بولے۔

رکشہ ڈرائیور نے خوشی خوشی ایک بار پھر رکشہ گھمایا اور اسی طویل راستے پر ہولیا جس رستے سے گزر کر آیا تھا۔

''صاحب! میں پہلے اس شارٹ کٹ' سے ہی گزرا کرتا تھا۔۔۔'' اس نے کہنا شروع کیا اور سکندر صاحب نے حتیٰ الوسع اپنے کان اس کے قریب کردیئے۔''شارٹ کٹ'' سے ہماری ہی بچت ہوتی ہے۔وقت کی بھی اور ایندھن کی بھی۔ایک بار ایک ایسے صاحب میرے رکشہ میں سوار ہوئے جو مصنف تھے،اُنہیں بھی اسی جگہ آنا تھا جس دفتر میں آپ گئے تھے۔میں اُنہیں اسی شارٹ کٹ' سے لانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ اس راستے سے نہ گزروں۔۔انہوں نے طے شدہ کرائے سے پچاس روپے زیادہ دینے کی پیش کش کردی اور کہا کہ مجھے طویل راستے سے لے چلو میں پچاس روپے زیادہ کرایہ دوں گا۔۔اور صاحب !میں نے ان سے پوچھ لیا کہ کیا وجہ ہے؟۔وہ اس راستے سے کیوں نہیں گزرنے دے رہے۔۔جبکہ یہ شارٹ کٹ' ہے۔۔تو ان مصنف صاحب نے ایسی بات بتائی۔کہ میرے دماغ سے نہیں نکل رہی۔۔اب میں اکیلے میں بھی یہ راستہ استعمال نہیں کرتا۔گو کہ میرے گھر کا راستہ بھی اسی ''شارٹ کٹ'' سے قریب ہوجاتا ہے''

''وہ کیا بات تھی؟۔۔۔ مجھے بتاؤ''۔۔۔وہ صاحب بے حد اشتیاق سے بولے۔

''صاحب! ان مصنف صاحب نے بتایا کہ میں کہانیاں

لکھتا ہوں اور چلتے پھرتے ۔۔۔آس پاس کے ماحول کو دیکھتے ۔۔میرے ذہن میں کہانیاں بن جاتی ہیں۔۔یوں سمجھو کہ رکشہ چلتا ہے تو میرا دماغ بھی چلتا ہے۔۔۔رکشہ رکے۔۔۔یا رفتار کم ہو تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔میں بھی دائیں بائیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔۔۔جب رکشہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو میں بھول جاتا ہوں کہ کیا سوچ رہا تھا۔اس طرح میرے خیالات کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔"

"میں ان کی بات بالکل بھی نہ سمجھ سکا۔۔میں نے کہا" صاحب! میں رکوں گا ہی نہیں۔بغیر کہیں رکے آپ کو آپ کی منزل پر پہنچا دوں گا"۔۔تو وہ بولے"تم اس رستے پر چلتے ہوئے رکو گے ۔۔۔اور بار بار رکو گے۔۔۔تم رکنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔۔۔میں بتاؤں کہ اس رستے سے چلتے گزرتے ہوئے میرے خیالات میں انیس بار رکاوٹ پڑے گی۔۔۔اس لیئے بہتر ہے کہ اس لمبے راستے سے چلو۔"

"تو صاحب! ان کے کہنے پر میں نے طویل لیکن سیدھا رستہ اختیار کیا۔اسی طرح آہستہ آہستہ رکشہ چلاتا ان کی بات سنتا رہا۔ وہ بتا رہے تھے کہ"میراثی ساری زندگی اپنی باتوں سے لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔کبھی کسی بات پر سنجیدہ نہیں ہوتے حتیٰ کہ وہ موت کی، مردے کی بھی ہنسی اڑاتے ہیں۔ایسے ہی ایک میراثی اپنے بیٹے سے بولا"بیٹا! میری خواہش ہے کہ جب میں مر جاؤں تو میری قبر ایسی جگہ بنانا جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ میری قبر کی زیارت کر سکیں۔مجھے روحانی خوشی حاصل ہو گی۔"

بیٹا بھی میراثی کا ہی بیٹا تھا بولا"ابا!۔۔آپ فکر ہی نہ کریں۔۔۔میں آپ کی قبر ایسی جگہ بناؤں گا جہاں دن بھر میں ہزاروں لوگ آپ کی قبر کی زیارت کریں گے ۔آپ کی قبر کو دیکھ کر رکیں گے۔۔سر کو تعظیم کے لیئے خم کریں گے اور آہستہ سے، بڑے احترام کے ساتھ آپ کی قبر پار کر جائیں گے۔"

میراثی نے حیران ہو کر پوچھا"تم کہاں دفناؤ گے مجھے؟"

بیٹا بولا"میں آپ کی قبر جی ٹی روڈ پر بناؤں گا۔۔قبر کی قبر ہو گی اور جمپ کا جمپ۔"

"تو میرے بھائی! اس رستے سے گزرتے ہوئے جب کسی میراثی کی قبر آتی ہے۔۔۔تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اچھی بھلی چلتی ہوئی گاڑی اس میراثی کی قبر کے احترام میں رک گئی ہے۔۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے۔۔ اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے۔۔مسافروں کی پیٹھ۔۔ٹیک سے الگ ہو جاتی ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر وہ"تعظیماً" میراثی کی قبر کو سلامی دیتے ہیں۔۔۔اور گاڑی بے حد احتیاط کے ساتھ اس قبر کو پار کر جاتی ہے اور پھر حسب سابق چلنے لگتی ہے اس رستے پر تو میراثیوں کی انیس قبریں ہیں میرے بھائی!۔۔۔میں کس کس کو سلامی دوں گا۔"

سکندر صاحب سن رہے تھے اور رکشہ والا بتا رہا تھا"بس صاحب! وہ دن ہے اور آج کا دن۔۔میں اس رستے سے گزرنے کی غلطی نہیں کرتا۔۔اس کے علاوہ بھی کسی دوسرے رستے پر کوئی جمپ آجائے تو اسے دیکھ کر دور سے ہی میں احتراماً اپنے رکشے کی رفتار کم کر دیتا ہوں اور بے حد احتیاط سے اس میراثی کی قبر کو پار کر جاتا ہوں۔۔اگر ایسا نہ کروں تو یہ"سپیڈ بریکر"۔۔"رکشہ بریکر"۔۔بن جاتے ہیں۔"

جذباتی افسانوں کے بعد ایک آدھ نمونہ دیہاتی افسانوں کا بھی ملاحظہ فرمایئے۔یہ افسانے اپنے دلکش ماحول اور طرزِ تحریر کی سادگی کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں۔ان میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی ایسی بات تحریر نہ کی جائے جو غیر فطری یا غیر دیہاتی ہو۔چنانچہ تشبیہیں، استعارے، محاورے سب دیہاتی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ احساسات تک دیہاتی ہو جاتے ہیں۔مثلاً بیگماں کا قد کماد کے پودے کی طرح لمبا اور اس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ تھے۔اس کی آنکھیں جگنو کی طرح چمکتی تھیں اور اس کی باتیں شکر سے زیادہ میٹھی تھیں۔وہ جب اُپلے بناتی تو اس کے گوبر سے لت پت ہاتھ اس طرح معلوم ہوتے جیسے کسی دلہن نے دل کھول کر مہندی لگائی ہے۔اس وقت شیرو اس کو دیکھ کر اس طرح بیتاب ہو جاتا جس طرح گائے کو ملنے کے لئے بچھڑا۔وہ اپنا ہل کندھوں سے اتار کر پھینک دیتا اور بیگماں کی طرف اس طرح دیکھتا گویا وہ بیگماں نہیں بلکہ کپاس کا خوبصورت پھول ہے۔اس وقت اس کے دل میں خیال آتا کہ وہ بیگماں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں پکڑ لے اور اسے اس زور سے بھینچے کہ اس کا چہرہ انار کے پھول کی طرح سرخ ہو جائے۔

سنگ دخشت از کنہیا لال کپور

کائنات بشیر، جرمنی

اُگے تیرے بھاگ لچھیئے!

میرا چھوٹا سا اک بنگلہ ہے
جہاں سارا زمانہ اپنا ہے
آنکھوں میں سہانے سپنے
اورسپنوں کا چمن اپنا ہے

ہاں تو۔۔دوسروں کی زندگیوں میں جھانکنے والو، میرا نام علیشاہ ہے۔ میں جھونپڑپٹی میں رہتی ہوں۔ گھر والے مجھے لاڈ سے کئی ناموں سے پکارتے ہیں۔ جبکہ میں نے انھیں کتنی بار منع کیا ہے کہ بھئی لاڈ اپنی جگہ لیکن میرے نام کا ستیاناس تو نہ کرو لیکن ان پر رتی بھر اثر نہیں ہوتا، جب تک وہ مجھے کئی بار ایلو ایلو، ایشو ایشو، نہ پکار لیں۔ شارٹ کٹ میں بلانا ہو تو پھی پھی کہہ کر اپنا کام نکالتے ہیں۔

میں ایک غریب سی بے چاری ہوں جس کا دھن دولت سے دور دور تک واسطہ نہیں۔ ہمارے ہاں تو ورثے میں بھی دولت نہیں ملتی۔ اگر بالفرض یہ لاٹری لگ بھی جائے تو بس ایک آدھ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی اور مل جاتی ہے۔ صبر کا سبق پڑھنے والے کہتے ہیں کہ دنیا میں سب کچھ پیسہ ہی تو نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے اس لیے میں یہ اُمنگوں بھرے گیت گانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ دل اور جذبات ہمارے سینے بھی ہوتے ہیں۔ اب اگر اللہ میاں مجھے امیر کے گھر پیدا کرنا بھول گیا تو کیا ہوا، سپنوں کی دنیا تو پوری دی ہے نا۔۔ جہاں میں جھولا ڈال کر بیٹھی رہتی ہوں۔

چھوٹا سا گھر ہو گا بادلوں کی چھاؤں میں
ہم ہی ہم چمکیں گے تاروں کے اس گاؤں میں

شکر میرے مولا کا، اِدھر سے تو قسمت نے کوئی ڈنڈی نہیں ماری۔ گانے وانے سننے اور سنانے پہ تو کوئی پابندی نہیں۔ کیا پتہ۔۔گاتے گاتے میں کسی دن گلوکارہ بن جاؤں۔ آخر اللہ میاں نے گانے والوں پر اوپر سے ٹیگ لگا کر نہیں بھیجا تھا۔ جب قصور والے لاہور پہنچ گئے اور لاہور والے بمبئی تو کیا عجب کسی دن جھونپڑی سے اُٹھ میں کسی سٹوڈیو کے ریکارڈنگ روم پہنچ جاؤں اور اپنا من پسند گیت گاؤں،

ساڈی میٹرو والے ٹیشن تے بلا کے
تے کھورے ماہی کتھے رہ گیا
ساڈی اکھاں وچوں نیندراں اڈا کے
تے کھورے واپڈا کتھے رہ گیا

ہاں تو۔۔۔ اس میں دیدے پھاڑ کر اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب آسمان پہ بنی جوڑی زمین پہ ڈھونڈنی پڑتی ہے تو کیا عجب کسی روز کوئی موسیقار ساز کے ساتھ آواز ڈھونڈتے میری گلی تک آن پہنچے۔ ویسے اللہ میاں جی میں جھونپڑی میں پیدا ضرور ہوئی ہوں لیکن مجھے کسی امیر کے گھر برتن دھونے مت بھیج

دینا۔

خیر، ابھی آگے کی بات کیا کروں۔ ابھی تو پیچھے کی طرف چلتے ہیں، جب میں نے آنکھ کھولی تو اتنی بڑی دنیا کو چھوڑ کر خود کو ایک جھونپڑی میں پایا۔ ماں تھوڑے فاصلے پر جھلنگی سی چارپائی پہ لیٹی تھی۔ اندر دھوئیں کے پیرہن سے لپٹی کالی سیاہ جھونپڑی، اوپر سیرات کی تاریکی، گھپ اندھیرا اور سناٹا۔۔لیکن مجھے اتنا فرق نہیں پڑا۔ کیونکہ اگر میں مڈل کلاس محلے کے کسی گھر میں پیدا ہوتی تو وہاں پر بھی تو اس وقت لوڈشیڈنگ ہی ہوتی تھی نا۔قسمت اگر زیادہ زور آور ہوتی اور میری پیدائش کسی کوٹھی، بنگلے میں ہوتی تو وہاں جنریٹر سے بجلی ہوتی۔ کوٹھی ضرور جگمگا رہی ہوتی لیکن زبردستی مانگے تانگے کی بجلی سے اور۔۔۔اور،

ایسی بجلی سے ہم باز آئے

جو دل کو جلائے، ستائے، دُکھائے

ملک کے کئی گھروں کو اندھیرے میں ڈبو کر صرف ایک گھر میں اپنی روشنی پھیلائے۔ مجھے تو وہ بجلی چاہیئے جو منگلا ڈیم کا منصوبہ مکمل ہو کر اس سے دستیاب ہو۔ ملک کا کونا کونا اس سے جگمگ جگمگ کرے۔ صنعتی انڈسٹری ترقی کرے۔ لوگوں کے کاروبار، روزگار بڑھیں۔ کرمو نائی کی دکان میں چٹی ٹوب لائٹ کی روشنی ہو اور فراٹے بھرتے پنکھے کی ہوا میں وہ عارف لوہار کا اِک پھل موتیے دا مار کے جگا سوہنیے۔۔۔سن کر جھومتا ہوا کسی کے سر پر اپنا استرا چلائے۔ فیقے دودھ دہی والے کی دکان میں اوپر تلے رکھی دہی کی کنالیاں چاندی جیسی روشنی میں جگر جگر کر رہی ہوں۔ کڑاہے میں ابلتا دودھ لڈیاں ڈالے اور لسّی کے بھرے بھرے گلاس بجلی کی روشنی میں لِشک لِشک کرتے ہماری روایات کو جیتا جاگتا رکھیں۔ ایسی تیسی بجلی کا کیا فائدہ، جس سے صرف ایوان چمکیں اور پارلیمنٹروں کے گھر ہی روشن ہوں اور باقی جائیں بھاڑ میں۔ امیر بیٹھیں اے سی میں اور غریب نہر میں چھلانگیں مارتے رہیں۔

سارے جہاں کا درد ہمارے دل میں ہے۔ لو میں پھر آگے بڑھ گئی۔ چلو پھر پیچھے چلتے ہیں۔

میں نے اماں کی جانب دیکھا تو اپنی زندگی کی پہلی امڈتی خواہش کی ممکن تعبیر دیکھی، ویسے جب اماں جھونپڑی سے باہر لے جا کر تاروں کی چھاؤں میں مجھے لوری سنایا کرے گی تو پارلیمنٹ کی بھاری بھرکم کرسیوں پر چوڑے ہو کر بیٹھنے والے اہلِ ایوان کے بچوں کو بھی اتنا مزہ نہیں آئے گا جتنا مجھے آئے گا، آہا۔۔ہو ہو۔:

بچپن آخر بچپن تھا جو اماں، بہنوں بھائیوں کی گودیوں میں کُود پھاند کرتے گزر گیا۔

جھونپڑی میں اماں ابا کے علاوہ ڈھیروں اور لوگ رہتے تھے بھائیوں، بہنوں کی صورت۔۔۔جانے کتنی جوڑیاں تھیں جو پہلے ہی مکمل تھیں اور میں شائد۔۔چونگھے۔۔۔میں چلی آئی تھی۔ مجھے لگا اب خوب دنگل ہوا کرے گا۔ دو پارٹیاں تو لازمی بنیں گی۔ ایک صنفِ نسواں اور دوسری معاشرے پہ حاوی مردوں کی، دونوں مجھے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کریں گے لیکن میں نے روزِ اول سے ہی ان کا حصہ نہ بننے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے نہ تو ابھی مردوں کا غصہ اور غیرت دیکھی تھی اور نہ ہی مجھے صنفِ نسواں کو زیادہ بڑھاوا دے کر خوامخواہ کے پنگے میں پاؤں ڈالنے کی ضرورت تھی۔ بھئی اب دلوں، نیتوں کا حال تو اللہ جانے کہ کون سیر ہے اور کون سَوا سیر۔۔۔!

لیکن ہوا وہی، دونوں پارٹیاں سرکش لہروں کی طرح مجھ پہ امڈی چلی آئیں لیکن میں ان کا حصہ نہ بنی۔ ذرا عقل کو ہتھ مارو، اللہ کے بندو، کل کو مجھے بھی خدا کو منہ دکھانا ہے۔ میں پہلے ان ٹیموں کی خوب لڑائی دیکھتی۔ دونوں پارٹیوں کے دھواں دھار نکات سنتی۔ پھر ان کے درمیان۔۔۔امن کی آشا۔۔۔بن جاتی۔ اور ایمپائر کی طرح اپنا فیصلہ سنا دیتی۔

ہاں تو۔۔۔آپ نے کیا سوچا تھا کہ میں جلتی پر تیل چھڑکوں گی۔ نہ نہ نہ۔۔۔ایسا سوچنا بھی مت۔ غریب کے پاس پہلے ہی تعلیم، طاقت، دولت نہیں تو اب کیا ہم لڑ لڑ کر شرافت بھی ختم کر دیتے۔ مارنے کو تو پہلے ہی مہنگائی پڑی ہے۔ گھی سے تر بتر پراٹھے پہلے صرف زن، زر والے کے ہاں پکتے تھے۔ کنوارے بچارے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ جاتے تھے۔ پَر اب تو پراٹھے صرف امیر

کے ہاں پکتے ہیں۔ کیونکہ پراٹھا پکانے کے لیے اسی کے گھر پوری چیزیں ملیں گی آٹا، گیس اور گھی۔ ہمارے ہاں تو صرف دال، گاجریں یا نمانے آلو ہی پکتے ہیں۔ یہی غریبوں کی سبزی اور دال دلیہ ہے۔ شکر میرے مولا کا۔۔ یہی ہمارا من و سلویٰ ہے۔ اگر پرچہ اچھے سے حل کر لیا تو ان شاء اللہ دنیا کے اُس پار سفید، میٹھے شیریں دودھ سے بھری نہر کوثر و تسنیم کے کنارے بیٹھ کر میں رَج رَج کر پیوں گی۔ کھانوں سے سجے خوانوں سے اپنی دنیاوی بھوک مٹالوں گی۔

پر کیا کریں بندہ بشر ہیں۔ خطا لازم ہے۔ گوشت کا سواد پورا کرنے کے لیے اماں جس کوٹھی میں کام کرتی ہے۔ اس باجی سے کبھی کبھی۔۔ چکن کنور۔۔ کی ایک دو ٹکیہ مانگ لاتی ہے۔ جسے ہم دال میں ڈال کر دال گوشت بنا لیتے ہیں۔ آلوؤں میں ڈال کر آلو گوشت کے چٹخارے لے لیتے ہیں۔ بھئی شکایت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ آخر کل کو آخرت میں ہماری بھی پکڑ ہو سکتی ہے کہ،

صبر کیوں نہیں کیا؟

زبان کے چٹخارے کو کیوں نہیں روکا؟

دال، آلو، گاجریں کھا کر شکر کیوں نہیں کیا؟ (پھر گاجریں تو بنی ہی ہم غریبوں کے لیے ہیں)۔

گو غریبی کی چھت ہمارے سروں پر تھی لیکن ہم بہن بھائی خودرو بیل بوٹوں کی طرح خود ہی بڑھتے جا رہے تھے۔ کسی کے پاس جوتے نہیں تو کسی کے پاس سویٹر نہیں۔ کسی کے پاس قمیض نہیں تو کسی کے پاس جرابیں نہیں۔ ویسے اصول سے دیکھا جائے تو یہ ذمہ داری تو اوپر والے کی تھی نا۔ کہتے ہیں کہ آنے والی روح اپنا رزق ساتھ لے کر آتی ہے۔ اب اگر ہمارے ساتھ نوٹوں کے بکسے نہیں آئے، کپڑوں، جوتوں کے بیگ، دال، چاولوں کی تھیلیاں نہیں آئیں، گستاخی معاف جب زادِ راہ پورا نہیں تھا تو اس میں ہمارا کیا قصور؟

اُوپر سے اللہ نے علم حاصل کرنے کے لیے چین جانے کا بول دیا مگر مجال ہے اگر اس نے کسی مسافر کو ایک بھی کاپی، پنسل دے کر بھیجا ہو یا چین کا ویزہ دیا ہو یا چینی زبان سکھا کر بھیجا ہو یا ان کے کھانوں سے واقفیت کرائی ہو۔ اب بندہ خود ہی سوچے کہ چین جا کر پڑھائی تو بعد میں پہلے تو چینیوں سے واہ پڑے گا نا۔

ہاں تو، اب اگر اللہ نے اماں ابا کے ہاتھ نوٹ گننے کی بجائے ابنائے جہاں کو جھلا جھلا کر لوری دینے کے لیے بنائے تو پھر کیا کر سکتے تھے۔!

اب کیا اس بات کو لے کر ہم آپس میں جھگڑا کرتے۔ معاشرے میں فساد پھیلاتے۔ اپنی ٹینشن دوسروں کو دیتے۔ ٹینشن تو پہلے ہی ملک کے دانشوروں اور سائیکالوجسٹوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہر طرف پھیل چکی ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے کہتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار سیاستدانوں کو ٹھہرایا جا رہا ہے جو کچھ لوگوں میں۔۔ لیپ ٹاپ۔۔ بانٹ دیتے ہیں تو باقی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس بندر بانٹ پر وہ خاموش نہیں بیٹھتے۔ انھیں ٹینشن ہونے لگتی ہے تو وہ اسے آگے دینے لگتے ہیں۔ ہاں تو پھر کیا ہے، جس کے پاس جو چیز ہوگی وہ وہی تو آگے دے گا نا۔۔ ویسے بھی منا بھائی نے کہا ہے ”ٹینشن لینے کا نہیں دینے کا ہے۔“

ہم غریبوں کے پاس بجلی تھی نہ انٹرنیٹ، گوگل نہ یاہو، فیس بک نہ ٹوئٹر اور نہ ہی لیپ ٹاپ کے چونچلے۔۔ اس لیے ہمیں تو اتنا فرق نہیں پڑا۔ لیکن جنھیں پڑا انھیں بہت پڑا۔ جبکہ ہمیں تو مکمل طور پر کیلشیم مل رہی تھی نہ کاربوہائیڈریٹس، نہ پروٹین نہ وٹامن۔ لیکن اللہ کی شان۔۔ جھومتی ہوائیں، تاروں کی چھاؤں، چاند کی چاندنی، رِم جھم برستی بارش، ساون کے جھولے، بغیر تگ و دو کے ہمیں حاصل تھے۔ صبر اور شکر ہمارے اندر خود بخود جگہ بنا رہا تھا۔ ہم ٹینشن فری تھے۔ اسی لیے جھونپڑی کے اندر ایک سے بڑھ کر ایک حسینائیں اور شاندار گبھرو تیار ہو رہے تھے۔ اب آگے ہماری زندگی کا فیصلہ اپنی اپنی شکل صورت اور قسمت کے زور پر ہونا ہے۔ سو دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد میں کسی کوٹھی میں منتقل ہوتی ہوں یا کسی دوسری جھونپڑی میں، اَگے تیرے بھاگ لچھیے۔۔۔!

اشرف المخلوقات گدھا اور سونامی لہر

حنیف سیّد

امّاں ''سورہے ہو کیا۔۔۔؟'' گدھے نے منّے راجا یعنی کہ اشرف المخلوقات کو ہڑ بڑا کر آواز دی۔

''نہیں تو؟'' اشرف المخلوقات نے اپنی ماں کے بطن سے برجستہ جواب دیا۔

''اپنی ماں سے کہو، کہ وہ فوراً نیند سے بیدار ہوکر، میری پیٹھ پر سوار ہو جائے!'' گدھے نے اشرف المخلوقات کو صلاح دی۔

''اَبے گدھے۔۔۔! کیا بکتا ہے تُو؟''

''میں ٹھیک کہتا ہوں، اشرف المخلوقات!''

''میری ماں، کاروں، ٹرینوں، اِسٹیمروں اور جہازوں میں سفر کرنے والی، تجھ گدھے پر سوار ہوگی؟''

''میں گدھا ضرور ہوں، لیکن تمھاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' گدھے نے سر جھکا کر بڑے ادب سے عرض کیا۔

''کیا! بھلائی کیا ہے اِس میں؟''

''بھلائی یہ کہ ایک بہت بڑا طوفان آنے والا ہے، سمندر میں۔'' گدھے نے آگاہ کیا۔

''یہ تو ماہرِ موسمیات ہی بتا سکتے ہیں، تجھ گدھے کو کیسے علم۔۔۔؟'' اشرف المخلوقات نے بحث کی۔

''میری حِس بتا رہی ہے مجھ کو۔''

''تجھ کو تیری حِس بتائے اور میں اشرف المخلوقات لاعلم رہوں! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہم جانوروں کو یہ سب پتا لگ جاتا ہے۔''

''بکواس بند کر۔۔۔! اور سونے دے میری ماں کو۔''

''سونے کا وقت نہیں، اشرف المخلوقات! اب دھما کا ہونے ہی والا ہے سمندر میں۔''

''چُپ رہ۔! میری ماں کی آنکھ کھل گئی، تو پیٹ ڈالے گی تجھے'' اشرف المخلوقات نے ڈانٹا۔

''ڈر تو مجھے بھی یہی ہے، نہیں تو نیند سے بیدار کر دیتا اُن کو۔''

''ایسی بھول نہ کرنا کبھی۔۔۔! ورنہ پچھتائے گا تُو۔۔۔!''

''تم خود اُٹھا دو۔۔۔! نہیں تو مجھے اپنا فرض پورا کرنا پڑے گا۔'' گدھے نے اشرف المخلوقات کو اپنا فیصلہ سنایا۔

''نہیں، میں نہیں اُٹھاؤں گا اپنی ماں کو۔'' اشرف المخلوقات نے جواب دیا اور گدھا دُم اُٹھا کر زور زور سے ڈھینچو ڈھینچو کرنے لگا۔ ساوتری نے اُٹھ کر آٹھ دس بید جڑ دیے اور گدھے مہاراج شانت ہوگئے۔

''ٹھیک ہوگئے گدھو؟'' اشرف المخلوقات نے مذاق اُڑایا۔

''اشرف المخلوقات۔۔۔! ایک بات اور بتا دوں، وہ یہ کہ کسی کو گدھا مت کہنا کبھی! اور نہ حقیر سمجھنا کسی کو کبھی! ورنہ اگلے جنم میں گدھے بنوگے، میری طرح، تم بھی..!'' گدھے نے اشرف المخلوقات کو سمجھایا۔

''تو کیا پچھلے جنم میں اِنسان تھا،تُو؟''

''ہاں ،انسان ہی تھا!بہت بڑا ہی اِنسان، یعنی کہ نمرود تھا میں۔'' گدھے نے بتایا۔

''اوہ۔۔۔!،نمرود۔۔۔!اِسی لیے تو گدھا بنا ہے تو،تھا ہی تو اِسی لائق۔'' اَشرف المخلوقات نے مذاق اُڑایا۔

''ہاں بھئی،ہاں۔۔!تھا اِسی لائق میں،اِسی لائق سہی،لیکن تم ماں کو سمجھا دو،کہ وہ مجھ پر سوار ہو جائے،بھلائی اِسی میں ہے تمھاری۔''

''میری بھلائی چھوڑ،اپنی بھلائی سوچ!''

''تم اگر میری بھلائی چاہتے ہو تو،اپنی ماں سے میری پیٹھ پر بیٹھنے کی ضد کرو،ورنہ میں لاکھ بار چلاؤں گا،چاہے مار کھاتے کھاتے مر کیوں نہ جاؤں۔تم اگر میری مار بچانا چاہتے ہو،تو میری بات مان لو اَشرف المخلوقات!'' گدھے نے مار کھانے کے باوجود اَشرف المخلوقات سے گزارش کی۔

'' میں نے کہا نا کہ میری ماں تجھ گدھے پر کبھی نہ بیٹھے گی۔''اَشرف المخلوقات نے اپنا فیصلہ سنایا ہی تھا کہ سمندر میں ایک بہت ہی زوردار دھما کا ہوا،جس سے سارے لوگ لرز گئے۔

''دیکھو میں نے کہا تھا نا۔۔۔!اور اَب کچھ ہی دیر بعد اُونچی اُونچی سونامی آ کر سب کچھ غرق کر دے گی۔''

''سب کچھ غرق کر دے گی، تو تُو کہاں جائے گا،اَبے گدھے؟''

''میں جانور ہوں،نا..!اس لیے بچ جاؤں گا۔''

''میں اَشرف المخلوقات ہو کر غرق ہو جاؤں گا اور تُو گدھا ہو کر بچ جائے گا۔۔؟''اَشرف المخلوقات نے گدھے کا پھر مذاق اُڑایا۔

''ہاں،ہم سارے کھلے جانور بچ جائیں گے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ اِس لیے ممکن ہے کہ ہم جانور گناہ گار نہیں ہوتے،کیوں کہ ہم دوسروں کی سیوا کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور اپنا فرض نبھاتے ہیں۔'' گدھے نے کہا ہی تھا کہ ایک زوردار سونامی،اُونچی اُونچی عمارتیں غرق کرتی گزر گئی اور سارے کھلے جانور تیرنے لگے۔کچھ لمحوں بعد پانی کی سطح پر ہاتھ پانو مارتے، کہرام مچاتے ،چیختے اور پکارتے لا تعداد لوگ غرق آب ہونے لگے۔پھر کچھ دیر بعد دیگرے غرق آب ہوئی لاشیں پانی کی سطح پر آنے لگیں۔

''گدھے اَنکل۔۔۔!بچاؤ۔۔۔!بچاؤ۔۔۔!اَنکل جلدی آؤ۔۔۔!مجھے بچاؤ۔۔۔!''ایک آواز آئی۔

''کون ہو تم..؟اور کہاں سے بول رہے ہو۔۔۔؟'' گدھے نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں پاس ہی ہوں انکل،یعنی کہ اپنی ماں کے پیٹ میں۔''

''اچھا،تو تم ہو اَشرف المخلوقات!'' گدھے نے دیکھا کہ پاس میں ساوتری کی لاش تیر رہی ہے۔

''ہاں اَنکل۔۔۔! مجھے جلدی بچاؤ۔۔!مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے،میں تو مرے جا رہا ہوں۔''

''لیکر کیوں پیٹ رہے ہو؟منے راجا!سانپ تو نکل چکا ہے اب،یعنی کہ تمھاری ماں مر چکی ہے،اَب تم کو کیسے بچا سکتا ہوں میں؟'' گدھے نے بے قرار ہوتے ہوئے مجبوری ظاہر کی۔

''جیسے بھی ہو،بچا لو گدھے اَنکل،پلیز۔۔۔!''

''اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔تم اپنی فریاد سونامی آنٹی سے کرو اَب!'' گدھے نے مشورہ دیا۔

''سونامی آنٹی!بچاؤ ،بچاؤ۔۔۔!جلدی بچاؤ مجھ کو۔''

''کون ہو تم،اور کہاں ہو؟''

''میں ہوں اَشرف المخلوقات،اور اپنی ماں کے پیٹ سے بول رہا ہوں۔'' ساوتری کے بطن سے آواز آئی۔

''اَشرف المخلوقات؟ہا۔۔۔ہا۔۔ہا۔۔۔!''

''ہاں آنٹی!اَشرف المخلوقات ہوں میں ۔ مجھے بچا لو جلدی سے،پلیز۔۔۔!''

''میں ایک ناچیز سونامی، بھلا تمھارے کیا کام آ سکتی ہوں؟ اور تم تو اَشرف المخلوقات ٹھہرے،تمھاری دسترس تو چاند ستاروں تک ہے۔تم نے تو سمندر کے سینے چیر کر بحرِ ظلمات میں گھوڑے

تک دوڑائے ہیں،تم ہی کچھ کروا پنے لیے!''

''لیکن میں تو اپنی ماں کے پیٹ میں ہوں، بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟تم اِس وقت میری مدد کرو۔۔۔!'' اَشرف المخلوقات گڑگڑائے۔

''بیٹا! میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''آنٹی! تم واپس چلی جاؤ۔۔۔! تم آئی ہی کیوں ہو؟''

''جب جب اَشرف المخلوقات اپنے آپے سے آگے بڑھ جاتی ہے،یعنی کہ جب اُس کے گناہ حد سے گزر جاتے ہیں،تب تب خدا؛ خاکی، بادی، آتشی اور آبی عتاب نازل کرتا ہے۔مجھ کو خدا نے حکم دیا ہے،اِس لیے آبی عتاب لے کر گنہ گاروں کو موت کے گھاٹ اُتارنے آئی ہوں اور اپنا کام کر کے ہی جاؤں گی۔''

''خدا کا یہ کیسا عتاب ہے کہ گدھے محفوظ ہیں اور ہم اَشرف المخلوقات ہونے کے باوجود مر رہے ہیں؟''

''مر رہے ہو لیکن حسد کی آگ اَب بھی دہک رہی ہے تمھارے سینے میں۔ یہ تمھاری سرشت کی دین ہے۔ اَشرف المخلوقات ہو نا تم۔۔۔! انسان تو انسان، شیطان تک دہل جاتے ہیں،تمھارے ظلم وستم سے۔''

''اچھا! یہ ہم نہیں جانتے، آنٹی۔''

''ہو تو اَشرف المخلوقات تم، پر یہ نہیں جانتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں کہ میں ابھی بچّہ ہوں نا، آنٹی!''

''بچّہ ضرور ہو،لیکن باہر آتے ہی اپنے کرتب دکھانا، فتنے کرنا شروع کردوگے، جیسی کہ سرشت ہے تمھاری۔''

''کیا ہے میری سرشت؟''

''جھوٹ ، چوری، مکاری، عیاری، دغابازی، بے حیائی، زنا کاری اور نافرمانی وغیرہ وغیرہ۔۔۔ایسے ایسے ظلم وستم کیے ہیں تمھارے اَجداد نے کہ شیطان بھی پناہ مانگ گیا، ایسے ایسے فتنے بپا کیے ہیں، کہ بس!''

''فتنے ! کیسے فتنے؟''

''فتنے۔۔۔! ایک ہوں تو بتاؤں۔جگہ جگہ پر فتنے۔خدا کے گھر تک بدنام کر ڈالے ہیں تمھارے اَجداد نے۔خدا کے گھروں سے کچھ لوگ نماز پڑھ کر یعنی اُس کی اطاعت کا وعدہ کر کے،ماتھے پر کالے کالے ڈھٹّے اور بڑی بڑی داڑھی والے،کلمہ پڑھتے ہوئے نکلتے ہیں، جیسے: سیدھے جنت سے چلے آرہے ہوں، ماتھے پر بلوں کا جمگھٹ لیے، گھمنڈ میں چور، چاہتے ہیں کہ دوسرے سلام کریں، اُن کو۔بداخلاق کہیں کے، اور بازار میں آتے ہی جھوٹ فریب ، بے ایمانی اور دغابازی پر تُل جاتے ہیں۔سڑے گلے پھل، پولی تھین میں بھر کر الگ رکھ لیتے ہیں۔پیشانی پر نور اور ماتھے پر نماز کا ڈھٹّا دیکھتے ہی انسان،اُن کو ایمان دار سمجھ کر آتا ہے اور اپنے ہاتھ سے چھانٹ چھانٹ کر پسندیدہ پھل تُلوانے کے بعد جیسے ہی پیسے نکالنے میں مصروف ہوتا ہے، جھٹ سے اُس کے پسندیدہ عمدہ پھلوں کی پولی تھین بدل کر سڑے گلے پھلوں کی پولی تھین پکڑا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔'' ''فرنیچر میں لکڑی، یوکلپٹس کی۔ پالش، شیشم وغیرہ کی۔''

''صبح صبح کباڑ خریدنے نکلتے ہیں تو اُن کے کانٹے کی ڈنڈی میں ایک طرف نٹ کی کھانچ ہوتی ہے، کباڑ، تولتے وقت کانٹے میں جڑے نٹ کو کھانچ میں فِٹ کر کے بڑے بڑے دانش وروں، ایم۔ پیز، ڈی۔ ایمز، انجینئرز اور ججز وغیرہ تک کی آنکھوں میں دھول جھونک آتے ہیں۔''

''میٹ کی دُکان پر خونی ہڈّیاں، چھیچھڑے اور حرام مغز وغیرہ ۔۔۔! خدا کی قسمیں کھا کھا کر فروخت کر کے مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ترازو کے پلڑے کے نیچے چمبک لگا ہوتا ہے، بانٹ، گھِسے ہوتے ہیں اور اُن سے رانگا لگی مہر غایب ہوتی ہے۔کھانے کی اَشیا میں ملاوٹ سرِ عام ہے۔سبزیوں اور پھلوں کو انجکشن لگا لگا کر بڑھایا جا رہا ہے، بھینسیوں کے انجکشن لگا کر دودھ اُتارا جا رہا ہے ،اُن کے بچوں کو بنا دودھ کے تڑپا تڑپا کر مارا جا رہا ہے ، دودھ میں پانی نہیں بل کہ پانی میں دودھ ملایا جا رہا ہے۔مسافروں کو نشیلی اَشیا کھلا کر لوٹا جا رہا ہے۔ بدیشی مال کی اِسمگلنگ سرِ عام ہے۔جمع خوری، کالا بازاری کا بازار گرم ہے۔سونے چاندی کا ٹنچ کرتا جا رہا

اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں!

ماسٹر فاخر حسین کی اپنی انگریزی کی عمارت فنِ تعمیر کے کمال کا "نادر نمونہ اور کےاز ہفت عجائباتِ عالم" تھی۔ مطلب یہ کہ بغیر نیو کی تھی، بیشتر جگہ تو چھت بھی نہیں تھی اور جہاں تھی، اسے چمگادڑ کی طرح اپنے پیروں کی اُڑواڑ سے تھام رکھا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی بھی اردو میں پڑھائی جاتی تھی لہٰذا کچھ گرتی ہوئی دیواروں کو اُردو اشعار کے بر محل پشتے تھامے ہوئے تھے۔ بہت ہی "منجھے اور گھسے" ہوئے ماسٹر تھے۔ سخت سے سخت مقام سے آسان گزر جاتے تھے۔ مثلاً "پرسنگ" کروا رہے ہیں۔ اپنی دانست میں نہایت آسان سوال سے ابتداء کرتے۔ بلیک بورڈ پر "ٹو گو" لکھتے اور لڑکوں سے پوچھتے، اچھا بتاؤ یہ کیا ہے؟ ایک لڑکا ہاتھ اٹھا کر جواب دیتا، "سمپل انفینی ٹو"۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے فرماتے، بالکل ٹھیک۔ لیکن دیکھتے کہ دوسرا اُٹھا ہوا ہاتھ ابھی نہیں گرا۔ اس سے پوچھتے، "آپ کو کیا تکلیف ہے؟" وہ کہتا، نہیں سر! "ناؤن انفینی ٹو" ہے۔ فرماتے، "اچھا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں"۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ کلاس کا سب سے ذہین لڑکا ابھی تک ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے۔ اُس سے کہتے، "آپ کا سگنل ابھی تک ڈاؤن نہیں ہوا۔ کہیے، کہیے!" وہ کہتا یہ "گرنڈیل انفینی ٹو" ہے جو "ریفلیکسو ورب" سے مختلف ہوتا ہے۔ "میسفیلڈ" گریمر میں لکھا ہے۔ اس مرحلے پر ماسٹر فاخر حسین پر واضح ہو جاتا کہ:

گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم

لیکن بہت سہج اور نکتہ فہم انداز میں فرماتے، "اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں"!

اتنے میں نظر اُس لڑکے کے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر پڑی جو ایک کانوینٹ سے آیا تھا اور فر فر انگریزی بولتا تھا۔ اس سے پوچھا "ویل، ویل، ویل؟"

اس نے جواب دیا:

Sir, I am afraid, this is an intransitive verb!

فرمایا، "اچھا! تو گویا آپ اُس لحاظ سے کہہ رہے ہیں!"

آبِ گم از مشتاق احمد یوسفی

ہے۔ دورِ حاضرہ میں تولنے کے ایسے کانٹے بنائے گئے ہیں، جس میں صرف ایک جانب ہی پلڑا کٹورے نما ہوتا ہے، جس میں اَشیا رکھتے ہیں اور اُوپر کا سیلنگ فین تیزی سے گھومتا رہتا ہے، جس سے پلڑا ہوا کے دباؤ کے باعث خود بہ خود نیچا ہو جاتا ہے، اور اَشیا کم تلتی ہے۔"

"گاڑیوں کے پنچر جوڑنے والوں نے کاغذوں وغیرہ میں کیلیں چبھو کر قریب کی سڑکوں پر ڈال رکھی ہیں اور ٹیوبوں میں پانچ پانچ پنچر نکال کر بٹھایا ہوا ٹیوب بتا کر ٹیوبوں کی بکری کر رہے ہیں۔"

"دُکان داروں نے دُکانیں، سڑکوں پر بڑھا رکھی ہیں۔ سبزی اور فروٹ کے ٹھیلے والوں نے، سڑکیں گھیر رکھی ہیں۔ لوگوں نے پالتو جانوروں کو سڑکوں پر کھلے عام آوارہ چھوڑ دیا ہے۔"

"ٹیچرز، کلاسز میں جاتے نہیں۔ کلرکز آفسز میں کام کرتے نہیں۔ لوگ، غریبوں اور محتاجوں کو ستاتے ہیں۔ صدقہ، فطرہ، خیرات اور زکوٰۃ، جو اُن کا حق ہے، نہیں دیتے، بل کہ جھڑک دیتے ہیں۔ جاے داد کے نام پر حق تلفی کرتے ہیں۔ اُن کی جائدادوں پر ناجائز قبضہ کر کے فروخت کر لیتے ہیں۔ آباو اجداد کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ والدین کا دِل دکھاتے ہیں۔ اَساتذہ اور بزرگان کا اِحترام نہ کر کے بدسلوکی کرتے ہیں۔ احسان فراموشی کا بول بالا ہے۔ حرام اور سود کھانے پر تلے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ مُردوں پر گِلے برف اور اُس کا پانی سرِ عام بِک رہا ہے۔ لوگ بے زبان چرندوں اور پرندوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں۔ اُن کا شکار کرتے ہیں اور انھیں قید کر کے تڑپنے کا مزہ لیتے ہیں۔ پریشان افراد سے ہم دردی کے نام پر فارملٹی کرتے ہیں۔ دیش کا نمک کھا کر دوسرے دیش کی جیت پر گولے چھڑا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے دیش کی ہار پر گولے چھڑا کر دوسروں کو بدنام کر کے فرقہ پرستی پھیلاتے ہیں۔ بیٹیوں، ماؤں اور نوں کی عزتیں، محفوظ نہیں ہیں۔"

"وقف کی جائداد سے متولّیوں کے چولھے روشن ہیں۔ لوگ گھروں سے باہر نکلتے وقت دروازے میں رکھے کلامِ الٰہی کو سینے سے لگاتے ہیں، بڑی عقیدت سے بوسے لیتے ہیں اور مساجد کی کمائی سے مرغ کی بریانی کے مزے لیتے ہیں۔ دھرم کے ٹھیکے دار اپنے ججمانوں کے بال مونڈ رہے ہیں۔ مذہب کے نام پر دُکانیں سجی ہیں۔ مذہبی فرقے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھال کر اپنی روٹیاں سینک رہے ہیں۔ نقلی مکتبوں کے نام سے رسیدیں کاٹی جا رہی ہیں۔ عبادت گاہیں، محفوظ نہیں ہیں۔ حلف نامے فرضی بن رہے ہیں۔ عدالتوں کے فیصلوں کو ٹھکرایا جا رہا ہے۔ رشوت لیتے پکڑے

گئے رِشوت خور، رِشوت دے کر چھوٹ رہے ہیں۔ وکلا؛ رسوخ اور رِشوت کے بل بوتے غلط فیصلے کروانے پر تلے ہیں۔ سٹے اور لاٹریوں کا بول بالا ہے۔ بچوں میں منشیات کی لت بڑھ رہی ہے۔ عورت؛ فیشن کے نام پر ٹی۔ وی کے پروگرامز میں ننگی ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے فلمی کلا کار؛ غلط اور سستی چیزوں کی مشتہری کر کے جنتا کو بہکا کر کمپنیوں سے موٹی رقم لے رہے ہیں۔ آئینے ؛انسانیت کا مُنہ چڑانے لگے ہیں۔ رشتوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے، آدمی پاشانؔ یگ کی مانند ننگا ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے اَفسروں کی بیویاں، پڑوسیوں کے مکانوں کی ڈیکوریشن کی ہوڑ میں اپنے شوہروں کی مرضی سے اپنی عزت ہتھیلی پر رکھ کر ہوٹلوں میں بانٹتی پھر رہی ہیں۔ بیویاں بدلنے کا چلن بڑھ رہا ہے۔ طلاقوں کے بعد بنا حلالے کے رجوع کا رواج جمتا جا رہا ہے۔ عورتیں بازاروں میں بنا پردہ گھوم رہی ہیں۔ مشرقی تہذیب پر مغربی تہذیب کا رنگ جمتا جا رہا ہے۔ طلبہ؛ کالج کے بہانے ہوٹلوں میں عیاشی کر کے والدین کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ والدین ؛ بیٹوں، بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر بی۔ ایف۔ دیکھ رہے ہیں۔ مرد؛ عورتیں اور عورتیں؛ مرد ہو گئیں ہیں۔ یعنی کہ ایک دوسرے کا زیورات اور لباس پہن رہے ہیں۔ خواجہ سراؤں کا آتنک بڑھتا جا رہا ہے۔ ہم جنسی رِشتوں کا چلن ہو گیا ہے۔ جہیز کی مانگ نے لڑکیوں کو خودکشی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ رِشوت کے طور پر معصوم بچیوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ الٹرا ساونڈ کی رپورٹ پرپیٹ میں پل رہی بچیوں کے اسقاط ہو رہے ہیں۔ نرسیں ہسپتال میں اِنعامات کے لالچ میں امیروں کی زچاؤں کی لڑکیوں کو غریبوں کی زچاؤں کے لڑکوں سے بے دھڑک بدل رہی ہیں۔ سرکاری ہسپتال کے حرام خور ڈاکٹرز؛ زچاؤں اور مریضوں کو ورغلا کر پرائیویٹ نرسنگ ہومز میں آپریشن کرانے کی تجویز دے کر کمیشن مار رہے ہیں۔ نرسنگ ہومز؛ اِنسان کے ہاڑ ماس کو اپنی فلک بوس عمارتوں میں سریے اور سیمنٹ کی جگہ استعمال کر رہے ہیں۔ مُردوں اور مریضوں کے عُضو یعنی کہ گُردے وغیرہ تک اِسمگلنگ ہو رہے ہیں۔ نقلی دوائیں ،انسانیت کا مُنہ چڑا رہی ہیں۔ سرکاری ہسپتالوں کی قیمتی دواؤں کو بازار میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹرز؛ مریضوں کو بازار سے قیمتی دوائیں لکھ کر فارمیسٹ سے و مریضوں کو بیماریوں کی فضول جانچیں لکھ کر لیبوریٹریز سے کمیشن لے رہے ہیں۔ معذوروں کا کیمپ لگا کر اور اُن سے دست خط کرا کر بنا آپریشن ویسے ٹرخایا جا رہا ہے۔ حرام کے لالچ میں ہندستان سے پولیو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ کچھ لوگ فیملی پلاننگ اور پولیو ڈراپز پلوانے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ٹریفک کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے لوگوں نے۔ ہرے درختوں کو کاٹا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ پر لگے جنریٹروں کے دھویں کے باعث سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ معصوم بچّوں کو کام کرنے اور بھیک مانگنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ ملک کے نیتا اپنی کُرسی بچانے کے لیے سرحدوں پر نورا کشتی کرا کر بے گناہوں کا خون بہا رہے ہیں۔ کرسی کے لالچ میں سیاسی پارٹیاں غریبوں کو موٹی رقم دے کر آتنک پھیلا کر ایک دوسرے کو بدنام کر رہی ہیں، اور بڑے بڑے گھوٹالوں میں سرکار کو کھوکلا کر کے جنتا کا خون چوس رہی ہیں، لوگ بجلی اور ٹیلی فون کے بل ادا نہیں کر رہے ہیں، انکم کو چھپا کر ٹیکس چوری کیا جا رہا ہے۔ جنتا کی بہبودی کے لیے کرائے گئے کاموں میں کمیشن کا پرسینٹیج بڑھتا جا رہا ہے۔ پرسینٹیج بڑھ جانے کے باعث سڑکیں اگلی طرف سے بنتے ہوئے پچھلی طرف سے ٹوٹنے لگی ہیں۔ عمارتیں پوری ہونے سے پیشتر گر جاتی ہیں۔ غنڈے گولیوں کی نوک پر چناؤ لڑ کر برسرِ اقتدار آ رہے ہیں۔ پولس کو واردات ہونے سے پہلے ہی علم ہو جاتا ہے کہ واردات کہاں ہونے والی ہے۔ میڈیا سرِ عام بِک رہا ہے۔"

"سرکاری رسائل کے مدیران اپنی لابی والوں کی جھوٹے ناموں سے تخلیقات شائع کر کے اُس کے معاوضے سے اپنی روٹیاں چلا کر سرکار اور زبانوں کو کھوکلا کر رہے ہیں۔ کچھ اُدبا دوسروں کی تخلیقات کا کھلے عام سرقہ کر رہے ہیں، اور کچھ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے پر تلے ہیں، کچھ شعرا اپنی تخلیقات دوشیزاؤں سے پڑھوا کر اُن سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ قلم

کار یک رہے ہیں۔ کچھ مدیران غیر معروف نام نہاد اُدبا سے موٹی رقم لے کر اُن کے نمبر اور گوشے شائع کر رہے ہیں۔ زیادہ تر مدیران غیر معروف اُدبا کی معیاری تخلیقات کو بنا پڑھے واپس کر کے حرام خوری پر تلے ہیں۔''

''میرے آنے سے لاکھوں بے گھر ہو جانے والے مظلوموں کے لیے سرکاری غیر سرکاری سیکڑوں تنظیمیں، بھیڑیوں کے لبادوں میں مگر مچھ کے آنسو بہا کر چندے کر کے اپنے خزانے بھریں گی، نئی نئی گاڑیاں خریدیں گی اور اپنی عمارتوں کی منزلوں میں اضافہ کریں گی۔ اُن کے چولھوں کی آگ سے اُٹھی مُرغ مسلّم اور بریانی وغیرہ کی خوش بوئیں محلّوں کو مہکا کر، اُن کی شخصیت میں چار چاند لگائیں گی۔'' سونامی نے اَشرف المخلوقات کے کالے کارناموں کی نشان دہی کرائی۔

''یہ سب تو میرے اَجداد نے کیا ہوگا، میں نہیں کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں، آنٹی۔'' اَشرف المخلوقات نے جواب دیا۔

''وعدے تو ہر عتابِ الٰہی کے بعد انبیاے کرام سے تمھارے اَجداد نے بھی کیے تھے، لیکن رہے کُتّے کی دُم ہی تم۔''

''میں کہاں آنٹی، میں تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا ہوں، میں یہ سب کیا جانوں!''

''دھرتی میں ڈالے گئے سبھی بیجوں کو اُنکر دینے کا حق نہیں، کچھ ناکارہ بیج، دوغلے اور روڑھے بھی ہوتے ہیں، تمھاری طرح؛ جن کا جمنے سے پہلے دھرتی کی خوراک ہونا اَشد ضروری ہے۔ تم بھی وہی بیج معلوم ہوتے ہو، یعنی کہ قلمی اور دوغلے بھی۔ اسی لیے تم جمنے سے پہلے اتنے دفدک اور بھبک رہے ہو۔ باہر آنے پر تو بُش سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو گے۔''

''اَے جابر سونامی! میں تو مر ہی رہا ہوں، لیکن مرنے سے پہلے صرف اِتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ سمندر کے کنارے رہنے والے یعنی کہ میرے آباو اجداد باہر سے آنے والوں کو سیر کراتے، نظارے دکھاتے اور ہر طرح سے اُن کی سیوا کرتے آئے ہیں۔ پھر اُن پر اتنا قہر کیوں؟''

''اَے نٹ کھٹ اور بے وقوف اَشرف المخلوقات۔۔۔! تو اِتنا بھی نہیں جانتا کہ ظالموں کے خلاف بغاوت نہ کر کے اُنھیں خوش کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔''

''چلو میں مان لیتا ہوں، لیکن میرے مرنے سے پہلے اِتنا ضرور بتا دے کہ یہ قہر، یہاں کے بجائے اُن ممالک میں کیوں نہیں آیا، جنھوں نے ساری دنیا میں آتنک مچا رکھا ہے۔ جن وحشی درندوں یعنی کہ بھیڑیوں کے فرات پر قبضے سے ساری دنیا کے معصوم میمنے پیاس سے تڑپ رہے ہیں، لرز رہے ہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے، دبوچ کر ہڑپ کر جاتے ہیں، اور ہم جیسی رُوحیں دنیا دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہیں۔

''آئے گا، وہاں بھی آئے گا قہر۔ وہاں تو ایسا آئے گا، جس کی مثال کہیں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ وجود تک مٹ جائے گا دنیا کے نقشے سے ایسے ملکوں کا۔

''مگر آئے گا کب؟''

''اُبھی ہیں کچھ وہاں، خدا رسیدہ لوگ۔''

''یہ خدا ہے کون، آنٹی؟''

''خدا یعنی کہ سپریم پاور، سارے جہانوں کی، جس کے قبضے میں ذرہ ذرہ ہے، کائنات کا، کوئی پتا بھی نہیں ہل سکتا اُس کی مرضی کے بغیر۔ میں اُسی کے حکم سے تو آئی ہوں یہاں، اور جاؤں گی بھی اُسی کے حکم سے۔''

''اے خدا! میرے اَجداد نے بہت گناہ کیے ہیں۔ تو معاف کر دے اُن کو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ظلم کے خلاف اپنی جان تک نچھاور کر دوں گا، لیکن میں معصوم ہوں، بھولا ہوں، ابھی تو دنیا بھی نہیں دیکھی میں نے تیری۔ اَے معبودِ حقیقی، مجھے بچا لے۔'' معصوم بچّے نے گڑگڑا کر فریاد کی، ساتوں طبق تھرّا گئے۔

''اَے سونامی! واپس آ وا!'' بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوا، اور سونامی واپس لوٹ گئی۔

''اِس مردہ عورت کا بطن حرکت میں ہے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔

اَگلے روز خبر عام تھی کہ ایک مردہ عورت کے بطن سے آٹھ ماہ کے بچّے کو ڈاکٹرز نے زندہ نکال لیا۔

کاتبِ تحریر

کاتب تقدیر سے تو سب واقف ہیں، ''کاتب تحریر'' سے صرف وہی واقف ہیں جو ہماری طرح لکھنے اور پھر اسے شائع کروانے کی عادتِ بد میں مبتلا ہیں۔ خیر ہم نے تو کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد جلد ہی آنے والے حالات کا اندازہ کر کے اُردو کمپوزنگ سیکھ لی تھی اور یوں ''برقی کاتب'' کی ستم ظریفیوں سے کافی حد تک محفوظ ہوگئے تھے۔ مگر اِس سے پہلے والا دَور جسے ہم اب بجا طور پر ''پتھر کا دَور'' کہہ سکتے ہیں وہ تھا جب ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر حضرتِ کاتب کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اسے بٹر پیپر پر (اور اس سے پہلے کے دور میں ''مسطر'' پر) اپنی خوشخطی میں تحریر فرماتے تھے۔ اب اُن میں کتابت کی غلطیوں سے جیسے جیسے لطیفے ایجاد اور ایسے سرزد ہوتے تھے وہ اپنی جگہ ایک داستان ہے جس کا ایک معمولی سا کردار ہم ہیں مگر جس کے بہت سے بڑے بڑے کرداروں (بلکہ نشانہ بننے والوں) میں آج کے کئی نامور ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں۔

لیکن خیرات ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے چنانچہ ہم اپنا ایک حالیہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ صورتِ حال کچھ یوں ہے کہ کچھ ادبی رسالوں نے تخلیقات کو اردو میں کمپوز کر کے بذریعہ ای میل بھیجنے کی سہولت اپنے لکھنے والوں کو مہیا نہیں کی جس کے سبب چاہے آپ بہترین کمپوزر ہی کیوں نہ ہوں، آپ کو اپنی تخلیقات کمپوز کرنے کے بعد پرنٹ کر کے بھیجنی پڑتی ہیں جو ایک مرتبہ پھر ان رسالوں سے وابستہ کمپوزروں کے حوالے ''تُو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر'' کی غرض سے ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک رسالے کو ہم نے راولپنڈی کے ایک معروف شاعر بشیر صرفی مرحوم کے بارے میں لکھا ہوا مضمون پرنٹ کر کے ارسال کیا۔ ان کا نام ہمارے ایک دوست بشیر سیفی مرحوم سے ملتا تھا (جو بعد میں ڈاکٹر بھی ہوئے۔) چنانچہ ہم نے اِس مضمون کا آغاز کچھ یوں کیا:

''ہم سے کچھ سینیئر ادیبوں میں تب تک اپنی کسی حد تک، اور کچھ ادیبوں کی کافی حد تک، پہچان بنا لینے والوں میں محمد منشاء یاد، شبنم مناروی، بشیر سیفی اور بیشمار دیگر ادیبوں کے ساتھ ساتھ بشیر صرفی کا نام بھی شامل تھا۔ پہلی مرتبہ کسی نے ان کے غیاب میں مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مَیں نے اپنی طرف سے فوراً اس کی ''کتابت کی غلطی'' درست کرتے ہوئے کہا: بشیر صرفی نہیں، بشیر سیفی۔۔۔ جس پر میرے مخاطب نے کہا: ارے بشیر سیفی نہیں، مَیں بشیر صرفی کا ذکر کر رہا ہوں''۔

جب یہ مضمون اس ادبی رسالے میں شائع ہو کر مجھ تک پہنچا تو یقین کیجئے کہ اس کی تین سطریں دوبارہ کمپوز ہونے کے بعد یوں شائع ہوئی تھیں:

اب سے پہلے والا دَور جسے ہم اب بجا طور پر ''پتھر کا دَور'' کہہ سکتے ہیں وہ تھا جب ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر حضرتِ کاتب کے سپرد ہوتی تھی اور وہ اسے بٹر پیپر پر (اور اس سے پہلے کے دور میں ''مسطر'' پر) اپنی خوشخطی میں تحریر فرماتے تھے۔ اب اُن میں کتابت کی غلطیوں سے جیسے جیسے لطیفے ایجاد اور ایسے سرزد ہوتے تھے وہ اپنی جگہ ایک داستان ہے۔ جس کا ایک معمولی سا کردار ہم ہیں مگر جس کے بہت سے بڑے بڑے کرداروں میں آج کے کئی نامور ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں۔

''۔۔۔ بشیر سیفی اور بیشمار دیگر ادیبوں کے ساتھ ساتھ بشیر سیفی کا نام بھی شامل تھا۔ پہلی مرتبہ کسی نے ان کے غیاب میں مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مَیں نے اپنی طرف سے فوراً اس کی ''کتابت کی غلطی'' درست کرتے ہوئے کہا: بشیر سیفی نہیں، بشیر سیفی۔ جس پر میرے مخاطب نے کہا: ارے بشیر سیفی نہیں، مَیں بشیر سیفی کا ذکر کر رہا ہوں''۔

یوں ''بشیر صرفی'' کی جگہ، ہر جگہ ''بشیر سیفی'' کا نام لکھے جانے سے تحریر کی بے ربطی پر جس طرح آپ نے سر پیٹا ہے اس سے کچھ زیادہ ہی شِدّت کے ساتھ ہم نے بھی پیٹا اور اسی برہمی کے عالم میں مدیرِ اعلیٰ کو ایک خط بھی لکھ دیا جس کے بعد ان کی کرم نوازی کے سبب معذرت کے ساتھ اگلے شمارے میں یہ مضمون درست حالت میں شائع ہوُا۔

ہمارے ایک اور دوست نے جو بہت اچھے مزاح نگار بھی ہیں اور ہر مہینے جن کی کئی تحریریں نظر سے گزرتی ہیں، ایک کمپوزر مستقل ملازم رکھا ہوُا ہے۔ گذشتہ دنوں ان سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کا کمپوزر کسی ایک مضمون کی کمپوزنگ میں یوں اٹک گیا جیسے کچھ شاعر کسی مشکل بحر میں اٹک جاتے ہیں۔ بار بار غلطیاں درست کروانے کے باوجود انہیں سخت کوفت ہوتی کہ مضمون میں کچھ نئی غلطیاں بھی ہو رہی تھیں اور پہلے والی غلطیوں کی تصحیح بھی نہ ہوتی تھی، جس پر تنگ آ کر انہوں نے کمپوزر سے یہ تاریخی جملہ کہا کہ میاں، کیا تمہاری روزی اسی ایک مضمون سے وابستہ ہو کے رہ گئی ہے؟

لیکن ہم لکھنے والے اگر کمپوزروں سے تنگ آ جاتے ہیں تو کچھ کمپوزر بھی ہم سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی مصنّف کی کتاب کا مسودہ کمپوزر نے جب کمپوز کر کے مصنّف کو دیا تو انہوں نے پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ اپنی ہی تحریر میں کچھ اضافہ بھی کر دیا۔ کمپوزر نے اسے اضافہ شدہ مواد اور تصحیح کے بعد دوبارہ مصنّف کو پیش کیا تو ایک مرتبہ پھر یہی ہوُا۔ ظاہر ہے کوئی بھی تکمیلیت پسند مصنّف اپنی پہلے والی تحریر کو اشاعت سے پہلے جب بھی دیکھتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ کر کے اسے بہتر بنانا چاہتا ہے۔ لیکن کمپوزر کے نزدیک تو یہ ایک ''بیگار'' ہی تھی کہ ایک ہی مسودے کو چھ سات مرتبہ مزید اضافوں کے ساتھ درست کیا جائے۔ چنانچہ اس نے بے بسی اور برہمی کے ملے جلے تأثرات کے ساتھ ایک جملہ ایسا کہا جسے شاید دیگر تمام کمپوزر سنہری حروف میں لکھ کر فریم کروالیں تو کچھ عجب نہ ہوگا۔ اس نے کہا: ''زندہ مصنّفوں سے اللہ بچائے!''۔ تکمیلیت پسند مصنّفین بھی اس جملے کو اپنے لئے ''جملۂ فکریہ'' بنا لیں تو ان کی عمرِ عزیز میں شاید کچھ اضافہ ہو جائے!

ایک اور کافی وسیع اشاعت رکھنے والے ادبی جریدے کے مدیر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انہیں کمپوزڈ یا ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں ای میل سے نہ بھیجی جائیں۔ ''غیر سرکاری ذرائع'' سے پتہ چلا کہ اُن کا کمپوزر اس بات پر برہم ہوتا ہے کہ انہیں کمپوزڈ تحریریں بھیجی جائیں کیونکہ یوں اُس کی ماہانہ بل کم صفحات کمپوز کرنے کی وجہ سے متأثر ہوتا ہے۔

ہمارے پاس کمپوزروں کی ایسی ہی ستم ظریفیوں کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں مگر ہم خود چونکہ اکثر حالتوں میں کمپوزروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اس لئے ہم ان کی ''ہجو نگاری'' سے گریز ہی کریں تو بہتر ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ یہ کالم ہم اپنے نام سے شائع نہ کروائیں لیکن وہی بات ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا تو پھر موسلوں کا کیا ڈر، اور اپنے نام سے یہ کالم شائع نہ کروانے سے ہم شاید اس لذّت سے بھی محروم ہو جاتے جسے ''آ بیل مجھے مار'' کہا جاتا ہے اس لئے ہرچہ باداباد!

ہم لکھنے والے اگر کمپوزروں سے تنگ آ جاتے ہیں تو کچھ کمپوزر بھی ہم سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی مصنّف کی کتاب کا مسودہ کمپوزر نے جب کمپوز کر کے مصنّف کو دیا تو انہوں نے پروف ریڈنگ کے ساتھ ساتھ اپنی ہی تحریر میں کچھ اضافہ بھی کر دیا۔ کمپوزر نے اسے اضافہ شدہ مواد اور تصحیح کے بعد دوبارہ مصنّف کو پیش کیا تو ایک مرتبہ پھر یہی ہوا۔

میر کیا سادہ ہیں۔۔۔

ابھی کل ہی کی بات ہے ہم چائے کی گرما گرم چسکیوں کے ساتھ اپنے دوست محسن ترمذی کی عوامی علم ودانش بھری گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ہمارے فرزندِ ارجمند نے دخل در نامعقولات کر دی (ہم نے یہاں "نا معقولات" کا لفظ اس لیئے استعمال کیا ہے کہ عوامی علم و دانش بھری گفتگو وہ ہوتی ہے جو کوئی بھی شخص صرف اپنے بے تکلف دوستوں ہی کی محفل میں کر سکتا ہے، خصوصاً اس میں استعمال ہونے والی تشبیہات، استعارات اور اشارے وکنائے تو ہرگز کسی معقول محفل میں استعمال نہیں ہو سکتے۔) ہمارے فرزند نے آتے ہی شکوہ کرنا شروع کر دیا کہ یہ شاعر لوگ اچھے بھلے آسان الفاظ والے شعر میں کوئی نہ کوئی ایسا مشکل لفظ کیوں شامل کر دیتے ہیں کہ پورا شعر ہی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ ہم نے پوچھا کیوں کیا ہوا تم کو آج کونسا مشکل لفظ مل گیا ہے؟ کہنے لگا یہ لفظِ ''عطار'' کو ہی دیکھ لیں، آج تک میں نے یہ لفظ سنا اور نہ ہی پڑھا۔ ہاں اگر اس شعر میں لفظ ''عطار'' کی جگہ لفظ ''عطاری'' استعمال ہوا ہوتا تو یہ لفظ سنا ہوا بھی ہے، اور اس سے شعر کا کچھ مطلب بھی بن جاتا ہے۔ یہ سن کر ہم عجیب گومگو والی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ ہم نے پوچھا کونسے شعر میں تم لفظ عطار کی جگہ لفظ عطاری استعمال کر کے اپنی مرضی کا مطلب نکالنا چاہتے ہو؟ لیکن یاد رکھنا یہ شاعری ہے، تعزیراتِ پاکستان کی کوئی دفعہ نہیں، کہ جب بھی کوئی وکیل جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کا مطلب نکال لے اور مقدمہ جیت بھی جائے۔ وہ کہنے لگا یہ شعر دیکھیں ۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

مزید کہنے لگا کہ اگر اس میں لفظ عطار کی جگہ لفظ عطاری استعمال ہو جاتا تو یہ شعر بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتا کہ مشہور و معروف میر صاحب (وہ والے نہیں جن کا نام اس وقت آپ کے ذہن میں آ رہا ہے بلکہ وہ والے جنہوں نے یہ شعر لکھا ہے) بیوقوفی کی حد تک اِتنے سادہ ہیں کہ وہ اپنے دوست عبداللہ عطاری کے گھر دعوت میں زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار بھی ہوئے اور دوا لینے بھی اُنہی کے بیٹے (جو ڈاکٹر بھی ہے) کے پاس چلے گئے۔

یہ شاعری ہے، تعزیراتِ پاکستان کی کوئی دفعہ نہیں، کہ جب بھی کوئی وکیل جس طرح بھی چاہے اپنی مرضی کا مطلب نکال لے اور مقدمہ جیت بھی جائے۔

یہ سن کر ہم دونوں کو ہنسی آ گئی، محسن تو باقاعدہ قہقہہ لگانے لگے۔ ہم نے اپنے برخوردار کو سمجھایا کہ یہاں لفظ عطار بالکل صحیح استعمال ہوا ہے۔ دراصل عطار کہتے ہیں کسی بھی دوا فروش کو یا کسی حکیم کے اس معاون کو جو حکیم صاحب کے نسخے کے مطابق کسی مریض کے لیئے دوائی بناتا ہے۔ (جس کو تم آجکل کی زبان میں کمپاونڈر یا فارماسسٹ بھی کہہ سکتے ہو۔) اب اگر کوئی شخص کسی عطار کی وجہ بیمار ہو جائے اور پھر دوائی لینے بھی اسی عطار کے لونڈے کے پاس پہنچ جائے تو اسکی بیوقوفی کی حد تک سادگی کو ظاہر کرنے کے لیئے یہ شعر پڑھا جاتا ہے۔ اور ہاں۔۔۔ یاد رکھو اس

شعر میں لفظ لونڈا اُن ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں آجکل لفظ چھوٹے استعمال ہوتا ہے۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ اب باری محسن ترمذی کی دخل درمعقولات کی تھی۔ وہ ہمارے فرزند سے مخاطب ہوئے کہ بیٹا تمہارے ابو پرانے وقتوں کے پڑھے ہوئے ہیں،ان کو جدید طریقہِ تعلیم کا بالکل بھی علم نہیں ہے،ان کو پتا ہی نہیں کہ جب کسی کو کوئی بات سمجھانی ہوتو اس کو آج کی چیزوں سے مثال دینی چاہیئے نہ کہ پرانی چیزوں سے تا کہ اس کی سمجھ میں آسانی سے بات آجائے۔ ہم نے محسن ترمذی کو گھورتے ہوئے کہا کہ اچھا چلیں آپ ہی بتادیں اس شعر کا مطلب۔ فرمانے لگے ہاں بالکل سمجھاؤں گا، اگر صحیح نہ سمجھا پایا یا غلط مثال دی تو تم میرے ساتھ وہی سلوک کر سکتے ہو جو آجکل کالے کوٹوں اور کالی وردی والے سفید کپڑے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم نے یہ شرط منظور کرتے ہی اپنے جوتوں کے بند کھولنا شروع کر دیئے......

ہاں بالکل سمجھاؤں گا، اگر صحیح نہ سمجھا پایا یا غلط مثال دی تو تم میرے ساتھ وہی سلوک کر سکتے ہو جو آج کل کالے کوٹوں اور کالی وردی والے سفید کپڑے والوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

وہ ہمارے فرزند سے بولے کہ تم اس شعر آج کی مثال سے اسطرح سمجھ لو، اپنے وقت میں اس ملک کی طاقتور ترین ہستی، ایک فوجی جرنیل اور وہ بھی کمانڈو جو بطور صدرِ مملکت اس ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا، جب دل کرتا ایک فون کال پر کسی کو لِٹا دیا کرتا اور جب دل کرتا ایک فون کال پر خود کسی کے آگے لیٹ جایا کرتا۔ کبھی چند ٹکوں کے عوض اس ملک کی بیٹی کو غیروں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتا، اور کبھی دل چاہتا تو اپنے گناہوں کا طوق محسنِ پاکستان کے گلے میں ڈال کر ان کو پسِ زنداں کر دیا کرتا۔ ایک بار نجانے اس کے دماغ میں کیا فتور آیا کہ اس نے اس ملک کے بناء وردی والے چیف سے پنگا لے لیا، اور آج یوسفِ بے کارواں بنا پھر رہا ہے، اب وہی سابقہ وردی والا چیف اُسی بغیر وردی والے چیف کے پاس دھائی لیکر جانا چاہتا ہے کہ الیکشن کمیشن مجھ پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ میں نے اپنے دور میں آپکو Chief کی بجائے Mischief (ایک غلطی) سمجھتے ہوئے آپ کو عوام کی نظروں میں Cheap ثابت کرنے کے لیئے آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو غیر قانونی طور پر ناں صرف برطرف کیا بلکہ بہانگِ دُہل یہ اعلان بھی کیا کہ

They are no more judges, They are history now.

(یعنی آپ لوگ اب مزید منصبِ منصفی پر فائز نہیں رہے، اب آپ لوگ تاریخ کا ایک بند باب ہو چکے ہیں۔) اب آپ

ایوانِ اقتدار کی یہ ریت ہے کوئی شخص جب تک اقتدار پر موجود ہے لوگ اس کو کندھوں پر بٹھاتے اور جونہی اس کے اقتدار کا سورج گہناتا ہے لوگ اس کو کندھوں پر لاد کر نفرتوں کے شمشان گھاٹ پر چھوڑ آتے ہیں۔

الیکشن کمیشن کو حکم دیں کہ وہ میرے ان اقدامات کو تاریخ کا ایک بند باب (بلکہ شائد تاریک باب) سمجھ کر ان کو بھول جائے اور میرے الیکشن لڑنے پر کوئی قدغن نہ لگائے۔ ہم نے کہا مثال تو محسن بھائی آپ نے بالکل صحیح دی ہے مگر ہائے

اِس سادگی پر کون مر نہ جائے اے خدا

یوں بھی اس کمانڈو جرنیل کو تاریخ سے یہ سبق ضرور لینا چاہیئے تھا کہ ایوانِ اقتدار کی یہ ریت ہے کوئی شخص جب تک اقتدار پر موجود ہے لوگ اس کو کندھوں پر بٹھاتے اور جونہی اس کے اقتدار کا سورج گہناتا ہے لوگ اس کو کندھوں پر لاد کر نفرتوں کے شمشان گھاٹ پر چھوڑ آتے ہیں۔ اس سے استثناء صرف ان ہی لوگوں کو ملتا ہے جنہوں نے لوگوں کے جسم پر نہیں بلکہ ان کے دلوں پر حکومت کی ہوتی ہے۔

حسین ہاتھ کا کنگن

اُسے زمانہ طالب علمی سے ہی لوگوں کی زمینوں پر پھرنے کا بہت شوق تھا وہ اکثر میر، درد، جوش ،غالب ،حالی اور دوسرے قدیم شعرا کی زمینوں میں اپنی فصل کاشت کرنے کی کوشش کرتا جواب میں اکثر وہ رات کو سوتے میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا جب کسی شاعر کو اپنے سرہانے ہاتھ باندھے کھڑا ہوا پاتا اسے محسوس ہوتا کہ جیسے اکثر شاعر اس سے کہہ رہے ہیں ’’کاکا۔۔۔!ہم پر رحم، جو زندہ ہیں ان سے زمین چھین کر دکھا‘‘۔وہ اسکول کے دوستوں کے ساتھ ڈرامہ کرتا اور ڈرامہ کے دوران ہی اپنی شاعری سنانے کی کوشش کرتا جنہیں چند سموسے، چاٹ کے شوقین طالب علم ایک ڈیل کے تحت دیکھتے، سنتے ہوئے کھاتے۔

سرگودھا کے ایک ادبی رسالے میں جب وہ اپنی غزل جس کا ایک مصرع ’’دل دھڑکتا ہے تو ماتم کی صدا آتی ہے‘‘ اشاعت کی غرض سے لے پہنچے تو ایڈیٹر کے پاس ان کے دوست کی غزل بھی پڑی ہوئی تھی جس میں بھی اسی مصرع سے استفادہ کیا گیا تھا ایڈیٹر کے استفسار پر اس کے دوست نے بتایا کہ وہ عموماً اکھٹے ہی بیٹھ کر شاعری کرتے ہیں، بس یہ مصرع میں ان کے سامنے گنگنا بیٹھا مزید کھوج نے ایک اور انکشاف کیا کہ ان دونوں نے یہ مصرع کسی اور شاعر کی غزل سے لیا ہے۔

سرگودھا کے ایک ادبی
رسالے میں جب وہ اپنی غزل جس کا ایک مصرع
’’دل دھڑکتا ہے تو ماتم کی صدا آتی ہے‘‘
اشاعت کی غرض سے لے پہنچے تو ایڈیٹر کے پاس ان کے دوست کی غزل
بھی پڑی ہوئی تھی جس میں بھی اسی مصرع سے استفادہ کیا گیا تھا ایڈیٹر کے
استفسار پر اس کے دوست نے بتایا کہ وہ عموماً اکھٹے ہی بیٹھ کر شاعری کرتے
ہیں، بس یہ مصرع میں ان کے سامنے گنگنا بیٹھا مزید کھوج نے ایک
اور انکشاف کیا کہ ان دونوں نے یہ مصرع کسی اور شاعر کی
غزل سے لیا ہے۔

جب وہ اپنی شاعری کے محاسن استاد دوست سے معلوم کرنے پہنچے تو انہوں نے ناک پر عینک رکھتے ہوئے ان کی شاعری پکڑ کر ایک نظر ڈالی اور کہا ’’یہ کیا ہے؟‘‘

اُس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا ’’یہ تو آپ نے بتانا ہے میرے مطابق تو شاعری ہے۔‘‘

جب استاد محترم اس کے کلام کو علم عروض کی کسوٹی پر، پرکھ کر کلام موزوں کر رہے تو وہ حیرانی سے انہیں کبھی اُنہیں اور کبھی اپنے کلام کو دیکھ رہا تھا وہ جب اپنا کلام استاد محترم سے کر گھر کی جانب روانہ ہوا تو ان کے اپنے کلام میں سوائے تخلص کے ان کا اپنا کچھ نہ بچا تھا۔

استاد صاحب کی بدولت کچھ شاعری چل تو نکلی تھی لیکن وہ اکثر یہی سوچتے اگر یہ استاد محترم کہیں دائیں، بائیں ہو گئے تو پھر اس کے آگے اُن کی سوچ اور شاعری دونوں جواب دے جاتے۔استاد محترم بوڑھے ہوتے چلے گئے وہ اور ان کی شاعری جوان ہوتی چلی گئی پھر ایک روز ان کی نظر کسی اور کی زمین پر پڑی

اوراس زمین کی رنگینی اسے بھاگئی یہ مصرع ’’کاش میں تیرے بن گوش کا بندہ ہوتا‘‘ تو جیسے اس کو مجبور کر رہا تھا کہ آؤ یہ زمین ہی تمہاری ہے پھر اس نے اپنی شہرہ آفاق نظم ’’کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا‘‘ مجید امجد کی زمین میں بودی وہ اپنے تئیں اپنے آپ کو سمجھا تا رہا میں نے اس نظم سے صرف کاش کا لفظ ہی لیا ہے اور یہ سینہ زوری تو نہیں ہے اس نظم نے اس سمیت، مجید امجد کو بھی دوبارہ زندہ کر دیا لوگ اس کی بدولت مجید امجد کے نام سے آشنا ہوئے۔اس پر ادب اور سکرین کے دروازے کھلتے چلے گئے لوگ اسے سرقہ، چربہ کا نام دیتے رہے اس کے ڈراموں کو خرید کا ڈرامے کہتے رہے لیکن اس میں ایک خوبی ضرور رہی کہ اس نے مڑ کر کسی کی تنقید کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا شائد چرچل کا مقولہ پلے سے باندھ رکھا ہے۔

جو اس کے استاد محترم تھے ’’رات گئے‘‘ وہ ان کے لئے اجنبی ٹھہرے، اپنے پروگرام میں انہوں نے استاد محترم کی غزل یہ کہہ کر پڑھنے سے انکار کر دیا کہ میں انہیں نہیں جانتا۔ ’’باباجی‘‘ کہتے ہیں

پھر ایک روز ان کی نظر کسی اور کی زمین پر پڑی اور اس زمین کی رنگینی اسے بھاگئی یہ مصرع

’’کاش میں تیرے بُنِ گوش کا بندہ ہوتا‘‘

تو جیسے اس کو مجبور کر رہا تھا کہ آؤ یہ زمین ہی تمہاری ہے

پھر اس نے اپنی شہرہ آفاق نظم

’’کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا‘‘

مجید امجد کی زمین میں بودی وہ اپنے تئیں اپنے آپ کو سمجھا تا رہا میں نے اس نظم سے صرف کاش کا لفظ ہی لیا ہے۔

’’تم لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ایک بندے نے اگر پانچ راتیں اور چھ دن سائیکل چلائی ہے تو اس نے کتنا جان جوکھوں کا کام کیا ہے، بجائے شاباشی دینے کے یہ کہہ دینا کہ یہ کام تو اس زمین پر صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے یہ کونسا کارنامہ ہے یہ زیادتی ہے‘‘۔ ’’بونگے بغلول‘‘ کے خیال میں موصوف کو اپنی پرانی شاعری ’’دو کی بجائے

’’باباجی‘‘ کہتے ہیں ’’تم لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ایک بندے نے اگر پانچ راتیں اور چھ دن سائیکل چلائی ہے تو اس نے کتنا جان جوکھوں کا کام کیا ہے، بجائے شاباشی دینے کے یہ کہہ دینا کہ یہ کام تو اس زمین پر صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے یہ کونسا کارنامہ ہے یہ زیادتی ہے‘‘۔

چائے بنائی تھی ایک کپ۔۔۔افسوس آج ہم بھی فراموش ہو گئے‘‘ کی جانب لوٹ جانا چاہئے کیونکہ ناقدان کی شاعری کی قدر نہیں جان سکتے حالانکہ کس قدر جاندار مصرع ہے ’’سمندر میں اترتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں‘‘ اب ناقد اس مصرع کو بھی تنقید کے کچوکے لگا رہے ہیں کہ اس میں کونسی شاعری ہے جب بندہ پانی میں اترتا ہے تو آنکھیں بھیگ ہی جاتی ہیں۔

اب وہ شاعری، ڈرامہ نگاری، اینکری سے لیکر کالم نویسی تک ہر میدان میں اپنے گھوڑے دوڑا رہا ہے، اب اس کی اپنی زمینیں، اپنے جگنو، اپنی تتلیاں اور اپنی پریاں ہیں۔ اس کے پرستاروں کا ایک ہجوم اس کے تعاقب میں ہے لیکن سائیڈوں پر کھڑے ناقد پھر بھی اس کو ایک جینوئن شاعر نہیں مانتے؛ ’’کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا‘‘ اس کے نام کے ساتھ چپک کر رہ گیا ہے۔

اقبال حسن آزاد

بھائی عبدالقدوس

کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی شخص اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر شہر گیا۔ایک عالیشان عمارت کے سامنے اس نے بھیڑ دیکھی تو گھوڑا روک کر اُتر پڑا۔وہاں اس نے دیکھا کہ بہت سارے لوگ ایک کھڑکی کے آگے قطار بنا کر کھڑے ہیں اور جس کا نمبر آتا ہے وہ اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ لیے شاداں و فرحاں پلٹتا ہے۔اس شخص نے ایک آدمی سے دریافت کیا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور کھڑکی سے لوگوں کو کیسا کاغذ دیا جا رہا ہے؟ جواب ملا کہ یہ یونیورسیٹی ہے اور یہاں لوگوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جارہی ہے۔تب اس شخص نے خوش ہوکر کہا کہ اگر ایسا ہے تو ایک ڈگری میں اپنے لیے لے لیتا ہوں اور ایک اپنے گھوڑے کے لیے۔ جواب ملا کہ یہاں صرف گدھوں کو ڈگری دی جاتی ہے،گھوڑوں کو نہیں۔

بھائی عبدالقدوس کے استادِ محترم پروفیسر شہاب ثاقب ہمیشہ ان پر مہربان رہے کیونکہ ان جیسا جیسا مطیع وفرماں بردار شاگرد چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔انہوں نے جب کالج میں داخلہ لیا تو پروفیسر موصوف کی تقرری اسی کالج میں تھی۔استاد نے شاگرد کو اور شاگرد نے استاد کو جب خوب اچھی طرح پہچان لیا تو پھر بھائی کو کالج جانے کی پابندیوں سے رہائی مل گئی۔اب وہ بجائے کالج جانے کے صبح سویرے پروفیسر صاحب کے دولت کدے پر پہنچ جاتے۔گھر کا چھوٹا موٹا کام کرتے،سودا سلف لاتے اور ان کے بچوں کو اسکول لے جاتے۔اس طرح ہنستے کھیلتے کالج کا عرصہ ختم ہوگیا اور انہوں نے پروفیسر صاحب کی مہربانیوں اور سفارشوں سے فرسٹ کلاس سے بی اے اُردو آنرز پاس کرلیا۔ اسی دوران پروفیسر موصوف ترقی پا کر یونیورسیٹی پہنچ گئے۔انہوں نے بھائی عبدالقدوس کو مشورہ دیا کہ وہ ایم اے میں داخلہ لے لیں اور اس طرح وہ ایم اے کے طالب علم بن گئے۔لیکن ان کے معمولات اب بھی حسب سابق تھے۔وہی علی الصباح پروفیسر صاحب کے درِ دولت پر حاضری دینا اور ان کے گھر کے کاموں میں پروفیسر موصوف کی اہلیہ کا ہاتھ بٹانا۔دو سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے اور وہ پروفیسر صاحب کی مہربانیوں سے جس طرح انہوں نے بی اے کیا تھا اسی طرح فرسٹ کلاس ایم اے بھی کر لیا۔اب ان کے دل میں پی ایچ ڈی کرنے اور پروفیسر بننے کی خواہشیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ پروفیسر صاحب ان کے نگراں تو بن گئے لیکن اب سوال یہ تھا کہ تھیس لکھے گا کون؟ آخر پروفیسر

صاحب نے ہی ان کی رہنمائی کی اور بتایا کہ یونیورسیٹی کے ایک جونیئر لکچرر جو مناسب حق المحت پر دوسروں کے لیے مقالے لکھتے ہیں وہی ان کا مقالہ بھی لکھ دیں گے۔ مقالہ کیا لکھتے ہیں بس ایک ہی مقالے کو عنوان بدل بدل کر فروخت کرتے ہیں۔ بہر کیف! مقالہ بھی تیار ہوگیا اور وائیوا کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔ پروفیسر صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ایکسپرٹ کو فرسٹ کلاس اے سی میں بٹھا کر لائیں۔ اُن کے لیے ایک بڑے ہوٹل میں کمرہ بُک کرائیں۔ ان کی خوب خوب خاطر داریاں کریں۔ وائیوا کے دوران اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ اور طلباء بھی ہوں گے۔ ان سبھوں کے لیے شاندار ناشتے کا انتظام کریں۔ وائیوا ختم ہو جانے کے بعد چند مخصوص لوگوں کے لیے چانکیہ ہوٹل میں لنچ رکھ لیں۔ چنانچہ بھائی عبدالقدوس پروفیسر صاحب کی رہنمائی میں سب کچھ کرتے گئے۔ ویسے اِتنے برسوں سے ان کے ساتھ رہتے رہتے وہ ان سارے مقامات سے واقف ہو چکے تھے جو عارف کو سالک کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ سب کچھ ہو جانے کے بعد جب وائیوا شروع ہوا اور ایکسپرٹ نے سوالات کرنے شروع کیے تو یہ ہونق کی طرح اپنے استاد کا منہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ صرف کھانا پینا ہوگا، یہاں تو سوال جواب ہو رہا ہے۔ استاد محترم ان کے دل کی بات سمجھ گئے اور مشکل کشا بن کر اُنہوں نے اپنے چپراسی کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ چپراسی بھی ایک ہی جہاندیدہ و گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے فوراً ناشتے کا پیکٹ سرو کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ لوگوں کا دھیان ناشتے کی جانب مبذول ہو گیا اور خوش گپیوں کے دوران ہلکے پھلکے سوالات کیے گئے اور اس طرح وائیوا کامیابی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ پھر سبھوں نے مل کر بھائی عبدالقدوس کو ڈاکٹر بننے کی مبارکباد دی اور انہوں نے نہایت خوشدلی کے ساتھ فرداً فرداً سبھوں کا شکریہ ادا کیا۔

بھائی عبدالقدوس کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک نیم پلیٹ لگوائی ''ڈاکٹر عبدالقدوس، ایم اے (فرسٹ کلاس) پی ایچ ڈی۔'' ایک رائٹنگ پیڈ چھپوایا، مہر بنوائی اور ہر جگہ اپنا نام اسی سابقے کے ساتھ لکھنے لگے۔ اب انہیں کسی کالج میں لکچرر بننا تھا اور اس کے بعد اپنے استاد پروفیسر شہاب ثاقب کا شرف غلامی حاصل کرنا تھا۔ غلام تو وہ پہلے بھی تھے اور اب بھی یہ فریضہ انجام دے رہے تھے لیکن اب وہ گھر داماد بننے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ مگر ریاست کی سیاسی صورت حال کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ عرصہ دراز تک کالج اور یونیورسیٹیوں میں کوئی بحالی نہ ہو سکی تھی۔ بے چارے چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا وقت گذارتے رہے۔ ایک دو دفعہ مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی شریک ہوئے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ انہیں کہیں کلرک کی نوکری بھی نہ مل سکی۔ اور اگر سچ پوچھئے تو وہ صرف چپراسی بن سکتے تھے کیونکہ اپنے استاد کی خدمت کرتے کرتے وہ اس معاملے میں کافی تجربہ کار ہو چکے تھے مگر یہ کام ان کے شایان شان نہ تھا لہٰذا انہوں نے اس کے متعلق کبھی سوچا تک نہیں۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ ایک روز گھورے کے دن بھی پھرتے ہیں چنانچہ بھائی عبدالقدوس کے دن بھی پھر گئے۔ جب یونیورسیٹی اور کالج کے اساتذہ یکے بعد دیگرے سبکدوش ہونے لگے اور بہت سے دوسرے اس دارفانی کو خیر آباد کہہ گئے۔ کیمپس میں طالبعلموں کی جگہ گدھے، کتے اور گائے بیل نظر آنے لگے مگر بعضے کالجوں میں تو سانڈ بھی اپنا فطری تقاضہ پورا کرتے دکھائی دینے لگے اور اس کے تعلق سے اخبارات میں روز خبریں آنے لگیں تب جا کر ریاستی حکومت کمبھ کرنی نیند سے جاگی اور اس نے لکچررز کی بحالی کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کے لیے اسے بہت ساری مشقت کرنی پڑی۔ خالی اسامیوں کا لیکھا جوکھا حاصل کیا گیا۔ طالبعلموں کی تعداد معلوم کی گئی اور پھر ایک یونیورسیٹی سروس کمیشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اتفاق دیکھئے کہ پروفیسر شہاب ثاقب کو اس کا چیئر مین بنا دیا گیا۔ پروفیسر موصوف چیئر مین کیا بنے کہ بھائی عبدالقدوس کی تو قسمت ہی کھل گئی۔ چہرے پر مردنی جگہ شادابی لہریں مارنے لگی۔ بدن میں سیروں خون بڑھ گیا اور ان کی رگ رگ میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ ادھر پروفیسر صاحب

کی صاحبزادی کی نگاہوں کے چراغ بھی جلنے لگے۔اشتہارات نکلے تو بھائی عبد القدوس نے پروفیسر صاحب کی مدد سے درخواست فارم پُر کیا اور اسے کمیشن کے دفتر میں جمع کر دیا۔ خدا خدا کر کے انٹرویو کا دن آیا اور ہمارے بھائی صاحب بج دھج کر انٹرویو روم میں پہنچے۔چیئر مین صاحب اپنی کرسی پر براجمان تھے۔اغل بغل دو ایکسپرٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں چیئر مین صاحب کے لنگوٹیا یار تھے اور وہ سب آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ بھائی قدوس اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے سبھوں کو باری باری سے مودبانہ سلام کیا۔اور جب انہیں کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے نہایت سلیقے سے حکم کی تعمیل کی۔ پہلے تو ان کی اسناد کی جانچ کی گئی اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔پہلے ایکسپرٹ نے دریافت کیا۔''آپ کا نام؟''

''ڈاکٹر عبد القدوس۔''

''کیا ڈاکٹر آپ کے نام کا حصہ ہے؟''

یہ سوال سن کر بھائی صاحب پہلے تو ذرا گڑبڑا گئے لیکن پھر سنبھل کر بولے ''جی! یہ میری ڈگری ہے۔''

''اچھا اچھا، یہ بتایئے کہ آپ کو نثری اصناف سے دلچسپی ہے یا شعری اصناف سے؟''

''جی مجھے ہر قسم کی اصناف سے دلچسپی ہے۔''

''واہ! کیا بات ہے۔''

پھر پہلے ایکسپرٹ نے دوسرے ایکسپرٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اب آپ کچھ سوالات کریں۔''

دوسرے ایکسپرٹ نے کہا۔ ''غالب کو کوئی شعر سنایئے۔''

بھائی صاحب نے پہلے تو سر کھجایا، پیشانی پر زور ڈالا، دیدے گھمائے، اپنے استاد کی جانب رحم طلب نظروں سے دیکھا اور پھر بولے ''دس برس ہو گئے ایم اے کیے ہوئے سب کچھ بھول بھال گیا ہوں۔''

اب سر کھجانے کی باری ایکسپرٹ صاحب کی تھی ۔لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور کہا''اچھا میر کا کوئی شعر سنا دیجیے۔''

''کہا نا جناب کہ سب کچھ بھول گیا ہوں۔''

''خیر! اقبال کا تو کوئی شعر یاد ہوگا؟''

''نہیں جناب! خدا کی قسم سب کچھ بھول چکا ہوں۔''

''اچھا منٹو کے کسی ایک افسانے کا عنوان بتایئے۔''

یہ سوال سن کر قدوس بھائی کا چہرہ کھل اُٹھا اور بولے

''کوئی شلوار تھی ۔۔۔شاید پیلی یا کالی۔''

چیئر مین صاحب جو یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے ، خاموش نہ رہ سکے۔انہوں نے ایکسپرٹ صاحب سے کہا۔

''رہنے دیجیے جناب! اس میں کنڈیڈیٹ کا کیا قصور؟ ساری غلطی اُوپر والوں کی ہے۔اگر میرے ساتھ یہ صورت حال پیش آتی تو میں غالب میر اور اقبال کا کلام تو کیا ان کے نام تک بھول چکا ہوتا۔اور یہ منٹو کوئی افسانہ نگار تھا کیا۔۔۔صرف شلواروں اور ساریوں کے نیچے جھانکتا رہتا تھا۔ لا حول ولا قوۃ۔ خیر آگے بڑھیے۔دوسرے ایکسپرٹ نے پھر سوال کیا۔

''عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یہ شعر کس کا ہے؟''

اتنی دیر میں بھائی عبد القدوس اپنے استاد کی حمایت سے کافی حد تک سنبھل چکے تھے اور انہوں نے نہایت اعتماد کے ساتھ جواب دیا ''یہ غالب اور آتش کا مشترکہ شعر ہے۔''

''مشترکہ شعر؟ یہ کیا ہوتا ہے؟؟'' ایکسپرٹ صاحب چونک پڑے۔

''ارے ، آپ کو نہیں معلوم؟؟ جس طرح فلموں میں موسیقاروں اور کہانی کاروں کی جوڑیاں ہوتی ہیں اسی طرح۔ جیسے شیام جی گھنشیام جی، کلیان جی آنند جی، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال، سونک اومی، ندیم شرون، شنکر احسان لوئی ،سلیم جاوید وغیرہ وغیرہ۔''

ان کا یہ عالمانہ جواب سن کر چیئر مین صاحب زور سے ہنس پڑے اور ایکسپرٹ صاحب سے کہنے لگے ''لگتا ہے ان میں حس

مزاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بھئی واہ! لطف آ گیا۔'' پھر وہ ایکسپرٹ صاحب کی جانب منہ کر کے کہنے لگے ''آپ بھی کیا بچوں کی طرح سوالات کیے جا رہے ہیں۔ ارے یہ کون نہیں جانتا ہے کہ یہ غالبؔ کا شعر ہے۔''

ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ایکسپرٹ صاحب کی کمر کو ہلکے سے دبایا اور آنکھوں سے خفیف سا اشارہ کیا۔ ایکسپرٹ صاحب سنبھل کر بیٹھ رہے۔ چیئرمین صاحب عبدالقدوس بھائی کہا ''ہم آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ آج ہمارے کالجوں کو آپ جیسے ہونہار لکچررز کی سخت ضرورت ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے You have been selected''

اس کے بعد تینوں نے مل کر بھائی عبدالقدوس، سوری! ڈاکٹر عبدالقدوس، سوری! ڈاکٹر پروفیسر عبدالقدوس کو مبارکباد پیش کی اور وہ شاداں و فرحاں انٹرویو روم سے نکلے اور بقیہ امیدواروں کو بنظر حقارت دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔

بھائی عبدالقدوس لکچرر کیا بنے کہ ان کی قسمت کے سارے پٹ فٹافٹ کھلتے چلے گئے۔

رشتوں کی وہ باڑھ آئی کہ اس میں ان کا پورا خاندان بہہ گیا لیکن ان کی پیشانی پر تو لکھنے والے نے پروفیسر شہاب ثاقب کی چھوٹی دختر نیک اختر کا نام لکھ دیا تھا لہذا کسی دوسری طرف نگاہ ڈالنے کی ضرورت تھی نہ جرأت۔ ادھر انہوں نے یونیورسٹی جوائن کیا اور اُدھر ان کے سر پر سہرا باندھنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور جلد ہی وہ پروفیسر شہاب صاحب کے داماد بن گئے بلکہ یوں کہیے کہ گھر داماد بن گئے۔ ان کی شادی کے موقع پر بڑے بڑے لوگ آئے تھے۔ ڈاکٹر، انجینئر، اعلیٰ افسران، یونیورسیٹی کے وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، رجسٹرار کے علاوہ بہت سارے پروفیسر حضرات بھی شامل ہوئے تھے۔ اور اس طرح پوری یونیورسیٹی بھائی عبدالقدوس سے واقف ہو گئی۔

شادی کا خمار کچھ ہلکا ہوا تو سسر صاحب نے داماد سے کہا کہ

میاں! اب تم پروفیسر ہو گئے ہو اور ہر وفیسر کا کام صرف تنخواہ لینا نہیں بلکہ یونیورسٹی جا کر کلاس بھی لینا ہے۔

یونیورسٹی جانے میں تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا مگر کلاس لینے کی قباحت سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی ''صلاحیتوں'' سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ''صحیح'' کو ''سہی'' اور ''غلط'' کو غلت'' لکھا تھا۔ ''فردا'' کو ''فروا'' اور ''ملاحظہ'' کو ملاخطہ'' پڑھتے آئے تھے۔ لیکن سسر صاحب کا حکم تھا لہذا یونیورسٹی تو جانا ہی تھا۔ سو انہوں نے یہ کام بھی شروع کر دیا۔ وقت پر تیار ہو کر نکل جاتے مگر بجائے کلاس لینے کے کبھی وائس چانسلر کو سلام کرنے پہنچ جاتے کبھی پرو وائس چانسلر کو اور کبھی رجسٹرار کو۔ انسان جب کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچ جاتا ہے تو اسے چمچوں کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ یہ چمچے ہی ہوتے ہیں جو اسے اس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ بھائی عبدالقدوس جیسا چمچماتا ہوا چاندی کا چمچہ بھلا کسے پسند نہ آتا؟ جلد ہی وہ یونیورسٹی کے عہدہ داران کی طفیل وی آئی پی پروفیسران میں شمار کیے جانے لگے اور یہ قیاس آرائیاں کی جانے لگیں کہ انہیں جلد آرٹس فیکلٹی کا ڈین بنا دیا جائے گا۔

ایک روز ایسا ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے لان میں موسم سرما کی نرم نرم دھوپ کا لطف اُٹھا رہے تھے کہ چند لڑکے اور لڑکیاں ان کے پاس آئے۔ پہلے تو ان لوگوں نے ادب سے انہیں سلام کیا اور پھر ان میں سے ایک کہنے لگا ''سر! کلاس۔۔۔'' مگر ابھی وہ صرف تنا ہی کہہ پایا تھا کہ بھائی قدوس اُبل پڑے ''ایں۔۔۔ کلاس؟ کیسا کلاس؟ میں نے کبھی کلاس لیا ہے؟ تم لوگوں نے مجھے کبھی کلاس لیتے دیکھا ہے؟ جو۔۔۔ ہوتے ہیں وہی کلاس لیتے ہیں۔''

بے چارے اسٹوڈنٹس اپنا سامنہ لے کر چلے گئے۔

ایک دفعہ یونیورسٹی میں Class-Less Society پر سیمینار ہو رہا تھا۔ بھائی عبدالقدوس اہم ترین لوگوں کے ساتھ اسٹیج پر جلوہ افروز تھے۔ سیمینار اختتام پذیر ہونے کے بعد جب وائس چانسلر صاحب صدارتی خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو انہوں نے کہا ''Class-Less Society کے بارے میں ہمارے پروفیسر عبدالقدوس سے بہتر کوئی نہیں جانتا کیونکہ انہوں نے آج تک کوئی کلاس لیا ہی نہیں ہے۔''

اُن کی بات سن کر پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا اور بے چارے قدوس بھائی شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ اس روز انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ دنیا کو دکھانے کے لیے ہی سہی اب میں کلاس لیا کروں گا۔ چنانچہ دوسرے ہی روز وہ اسٹاف روم میں دکھائی دیئے۔ ان کے کولیگ نے آنکھیں مل مل کر حیرت زدہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ کچھ زیرلب مسکرائے بھی۔ کچھ اشارے کنائے بھی ہوئے مگر وہ ان سب سے بے نیاز اپنی روٹین نوٹ کرنے میں لگے رہے۔ پھر جب ان کے کلاس کا وقت آیا تو انہوں نے نہایت شان کے ساتھ رجسٹر اٹھایا اور کلاس روم کی جانب روانہ ہوئے۔ اسٹوڈنٹس نے جب انہیں ہاتھ میں رجسٹر تھامے، گردن ٹیڑھی کیے کلاس روم کی جانب جاتے دیکھا تو ان کے پیچھے لپک پڑے۔ کلاس روم میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے تو حاضر طلبا وطالبات کی حاضری بنائی اور پھر انہوں نے ان سے پوچھا ''کیا پڑھنا ہے آج؟''

''سر! غالب کو پڑھا دیجئے۔'' پروفیسر موصوف کے لبوں پر پہلے تو ایک خفیف سا تبسم نمودار ہوا، پھر کہنے لگے ''غالب؟ ہوں غالب، بھئی غالب تو بہت آسان شاعر تھا۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے مشکل قرار دے دیا ہے۔ خیر! اگر کسی کے پاس ان کی کوئی کتاب ہے تو نکالے۔'' ایک لڑکے نے دیوان غالب سامنے کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''اچھا! پڑھو۔'' لڑکے نے پڑھ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

شعر سن کر پروفیسر موصوف نے اس کی تشریح یوں کی ''شاعر کہتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کیونکہ ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی ہے۔ کلیئر۔ چلو آگے بڑھو۔ اور اس طرح انہوں نے غالب کی پوری غزل کو ''کلیئر'' کر کے رکھ دیا۔

خادم حسین مجاہدؔ

میجر عاطف مرزا
(فنکارِ طرحدار، میرا یار)

عاطف مرزا ایک مکمل فنکار ہے کیونکہ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا نہ صرف ذوق رکھتا ہے بلکہ اِن میں سے اکثر میں کماحقہ، مہارت بھی رکھتا ہے۔ وہ محض فنکار ہی نہیں، نہایت اَدب پرور اور فن پرور بھی ہے۔ میں مضافات سے تعلق رکھنے والا ایک گمنام ادیب تھا، میری اولین حوصلہ افزائی کرنے اور شہر کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے والا میرا دوست یہ عاطف مرزا ہی تھا جس سے میری دوستی اب اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ ہم خاموشی کی زبان میں بھی ایک دوسرے کا مطلب سمجھ جاتے ہیں۔

شوخی اس کی فطرت میں شامل ہے اور یاروں کے ساتھ اس کا خلوص مثالی ہے۔ وہ لکھنے میں ہی نہیں، کھانے میں بھی چٹخارے کا قائل ہے اور اس کی گفتگو تو ہوتی ہی ہمیشہ لذیذ ہے، جسے گھنٹوں سن کر بھی ہم کبھی بور نہیں ہوئے۔

عاطف مرزا کے والد تدریس سے وابستہ تھے۔ اُنہوں نے اُردو سپیکنگ ہونے کے باوجود پنجابی میں بھی ایم اے کیا اور آفیسری سے ریٹائر ہوئے۔ اُنہوں نے جوانی میں کچھ شاعری بھی کی جو کاغذات کھنگالتے ہوئے عاطف مرزا کے ہاتھ لگ گئی، بس پھر کیا تھا، یہ شاعر بننے پر تل گئے اور شاعری اور عروض سے دست و گریباں ہو گئے۔ وراثتی اثرات تھے، ان کا شوق یا طفرتی مناسبت۔ یہ جلد ہی شاعری کے اسرار و رموز پا گئے اور مشاعروں میں جا کر اچھے بھلے شاعروں کی غلطیاں نکالنے لگے۔ میری زیادہ توجہ زبان کی طرف تھی اور ان کی فن کی طرف۔ اِس لئے شہر والے اپنی شاعری کو ہمارے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے ادبی

عیداور سیاستدان

سیاستدان تو عید یوں ملنے نکلتے ہیں، جیسے الیکشن کمپین پر نکلے ہوں۔ جیتنے سے پہلے وہ عیدمل کرآگے بڑھتے ہیں اور جیتنے کے بعد عیدمل کرآگے بڑھ جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک سابق گورنر کا عید ملنے کا انداز نرالہ ہوتا تھا۔ان کا حافظہ ہمارے ایک ادیب دوست جیسا تھا جو ایک ڈاکٹر سے اپنے مرضِ نسیان کا علاج کروا رہے تھے، دوماہ کے مسلسل علاج کے بعد ایک دن ڈاکٹر نے پوچھا ''اب تو نہیں بھولتے آپ؟''

''بالکل نہیں، مگر آپ کون ہیں اور کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

افراتفریح از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

پروگراموں اور مشاعروں کی اطلاع ہم سے چھپایا کرتے تھے۔ مگر ہمیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو ہی جاتی تھی۔ اور ہم وہاں پہنچ کر اپنی صلاحیتوں کا کھل کر اظہار کرتے۔ بزرگوں کا موقف تھا کہ ''خطائے بزرگاں خطا است'' جبکہ ہمارا خیال تھا کہ غلطی کوئی بھی کرے اس کی اصلاح ضروری ہے ورنہ کل کو وہ سند بن جائے گی۔ بہرحال منتظمین کی منت سماجت پر ہم نے اپنی صلاحتیں ہوٹنگ تک محدود کردیں تو اُنہوں نے سکھ کا سانس لیا۔

قدرتی طور پر عاطف مرزا شوخ طبع ہیں، کچھ اس وجہ سے اور کچھ میری صحبت میں اُنہوں نے سنجیدہ کے ساتھ ساتھ مزاحیہ شاعری بھی شروع کردی جو سنجیدہ شاعری کی طرح نپی تلی تھی بلکہ سنجیدہ شاعری سے زیادہ کامیاب ٹھہری، اِس لئے اُنہوں نے دونوں کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ ساتھ ساتھ مزاحیہ نثر بھی لکھنا شروع کردی جو اکثر ''پاک فوج'' کے رسالے ''ہلال'' میں دیکھنے کو ملتی رہتی ہے۔ نظم کی طرح نثر میں بھی اُن کی طبعی شوخی نمایاں ہے لیکن اس میں تفکر کا رنگ بھی ہے اور اس کی وجہ اِن کا بے تحاشہ مطالعہ ہے۔ کالج دور میں سب طلبہ کو ہفتے میں صرف دو کتابیں لینے کی اجازت تھی لیکن اَدب سے تعلق کی وجہ سے ہم دونوں ہفتے کے کسی بھی دن کتاب لے سکتے تھے۔ اِس سہولت کا ہم نے بے تحاشہ فائدہ اٹھایا اور بی ایس سی کی کلاس میں اُردو ادب کے حافظ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا تھا کہ بی ایس سی ہمارے لئے بھاری پتھر بن گئی۔

شعروادب کے علاوہ آرٹ بھی عاطف مرزا کا جنون ہے، بلکہ وہ فطری طور پر آرٹسٹ ہے اس نے کسی آرٹس کالج میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی پھر بھی کیلی گرافی، کارٹون گرافی، پینٹنگ اور پورٹریٹ بنانے میں مہارت رکھتا ہے اور صرف اس کے شوق کی بدولت اس نے ہرفن کے اساتذہ کے کام کو توجہ اور غور سے دیکھا اور پھر شروع ہوگیا۔ اس کی کیلی گرافی کی نمائش بھی ہو چکی ہے اور اس کے خوبصورت فن پارے فیس بک پر اس کے پیج پر بھی ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ قرآنی آیات کی خطاطی اور پاکستان سے وابستگی کی علامات اس کی کیلی گرافی اور پینٹنگ کے مرکزی مظاہر ہیں جو کہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک خالص مسلمان اور سچا پاکستانی ہے۔

ہر فنکار کی طرح عاطف مرزا ہر کام میں ترتیب نفاست اور اکملیت کا قائل ہے اور دوسروں سے بھی اس کا مطالبہ یہی ہوتا ہے۔ اپنے پیشہ ورانہ فرائض میں بھی اس کا رویہ یہی ہے اِس لئے لوگ اسے سخت گیر باس سمجھتے ہیں لیکن وہ طبعاً مہربان ہے، اس لئے اس کے ماتحتوں کو کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ بس اُنہیں اس کے اصولوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ گھر میں اس کی طبعی نرمی اور دوستانہ انداز بیوی بچوں کے لئے بڑی سہولت کا باعث ہے کیونکہ وہ گھریلو ذمہ داریوں میں ان کی بے حد مدد کرتا ہے۔ ہاسٹل میں اسی وجہ سے اس کے دوستوں نے اسے گھریلو کا خطاب دیا تھا۔ اس نے والد صاحب کی خواہش پر فوج کا پیشہ اختیار کیا کیونکہ انہوں نے ہجرت کے دُکھ اٹھائے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا فرزند ہندوستان سے اس کا بدلہ لے۔ یہی وجہ ہے کہ عاطف مرزا مکمل فوجی ہے جو ایک اشارے پر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کو تیار ہے۔ فنونِ لطیفہ میں اس کی دلچسپی دراصل اس کے اندر کے لاوے کو باہر نکالنے کا ایک ذریعہ بھی ہے کیونکہ جب اس نے دیکھا کہ مال جان اور عصمتوں کی قربانیوں سے حاصل کئے گئے پاکستان کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جا رہا ہے تو ایک لاوا سا اس کے اندر پکنے لگا جو نہ نکلتا تو ہر چیز تباہ کر دیتا۔

ڈاکٹر امواج السّاحِل

ڈاکٹر سمیر عبد المجید
(ایک مصری ہمزہ کی تلاش میں)

اُس شخص سے پہلی ملاقات ہی ۱۹۷۷ء میں کچھ ایسے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی کہ بھولتا ہی نہیں وہ۔۔۔

ہوا یوں کہ اُس دن میری روم میٹ کی دونوں بہنیں ملتان سے لاہور آئی ہوئی تھیں کہ باجی ہمیں لاہور کی سیر کرنی ہے، اُن کو دیکھ کر میرا بھی دل للچایا کہ اب لاہور آئے ہیں تو صرف پڑھائی کرنا تو اس شہرِ بے مثال کے ساتھ نا انصافی ہوگی اور اس طرح داتا صاحب کی ناراضی کا خطرہ ہے، کوئی آفت ہی نہ آجائے ہم پر یا شہر پر، اس لئے ان کا ساتھ دینا ضروری سمجھا اور کلاس چھوڑ کر ان تینوں کے ساتھ چڑیا گھر کا رخ کر لیا۔ اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا، اور نا قابل فراموش نیل گائے یعنی سینگوں والی ہرنی دیکھی، جس سے شعرائے کرام آنکھوں کی تشبیہ دیتے نہیں تھکتے، شاعروں نے تو پتہ نہیں کیسے اس کی آنکھ کو دیکھا ہوگا، میں نے تو بہت غور سے دیکھا کہ آخر اس میں کیا ایسی بات ہے، تقریباً پندرہ منٹ کے غور وخوض کے بعد سمجھ میں آیا کہ اس کی آنکھیں بڑی تو ہیں ہی، مگر جو خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ سرگیں ہیں، جیسے کاجل کی دھار کسی نے ڈال دی ہو۔۔۔ تو سمجھ میں آیا کہ شعرائے کرام اسی آنکھ سے کیوں تشبیہ

اکبر الہٰ آبادی کو جملوں کے مذاق میں بھی اچھا خاصا دخل تھا۔ اپنے اِس مصرع

پہلے بی۔اے تھے اور اب بیمار ہیں

کی تشریح کرنے لگے، فرمایا کہ ''اگر بیمار کے ''بی'' (B) کو (Bee) یعنی ''شہد کی مکھی'' سمجھ لو اور ''مار'' کو مار ہی رہنے دو تو مصرع کے معنی صاف سمجھ میں آسکتے ہیں یعنی بی۔اے کرنے کے بعد آج کل کے نوجوان بیچارے مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔

دیتے ہیں۔ جب دوپہر کی گرمی نے اپنا رنگ دکھایا اور بھوک بھی چمک اٹھی تو ہوسٹل کی یاد آئی اور ہم نے یونیورسٹی بس کا رخ کیا، اس زمانے میں آگے کا حصہ طالبات کے لئے ہوتا تھا، جس کو مردانہ حصے سے ایک جالی سکے ذریعے الگ کیا ہوا تھا، اس جالی میں کنڈیکٹر کے آنے جانے کے لئے دروازہ بھی تھا، وہاں پر بیٹھنے کو جگہ نہ ملی تو ہم چاروں کھڑی ہوگئیں، اب پیچھے سے اچانک عربی میں ہوٹنگ شروع ہوگئی۔

''یہاں آجاؤ لڑکیو!''

''یہ کبھی بھی نہیں آئیں گی۔۔۔یہ مصر تھوڑی ہے، جہاں لڑکی اور لڑکا ساتھ ساتھ بیٹھتے ہیں!''

''سچ ایسے ہے وہاں؟''

''تو اور کیا تمہارے ہاں ایسے نہیں ہوتا؟''

''نہیں مگر ہر کسی کو آزادی ہے جہاں چاہے بیٹھے۔''

''یہاں تو پوری قوم کمپلیکس کا شکار ہے، لڑکیاں اتنا ڈرتی ہیں لڑکوں سے۔۔۔اب یہ بیچاری سارا ٹائم کھڑی رہیں گی مگر یہاں آکر نہیں بیٹھیں گی۔''

''او لڑکیو آجاؤ!!''

میری ساتھی لڑکیوں نے پوچھا ''تمہیں سمجھ آرہی ہیں اِن کی باتیں؟''

میں نے جواب دیا ''ہاں!''

انہوں نے کہا تو پھر بتاؤ!!''

تو میں نے بتادیا کہ وہاں بیٹھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

لڑکیوں نے کہا ''اُن کو جواب دو!''

میں نے لیت ولعل کی۔۔۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ سب کو معلوم ہو کہ میں عربی بول لیتی ہوں، مگر لڑکیوں کے چیلنج پر کہ پھر تمہیں عربی آتی ہی نہیں ہم سے جھوٹ بولتی ہو، بولنا پڑا۔

میں نے عربی میں کہا ''کہاں آئیں ہم؟ کہاں ہے سیٹ؟''

سب سے پہلے تو بس میں سناٹا چھا گیا، وہ عرب خود بھی ششدر رہ گئے پھر انہوں نے جواب دیا کہ یہ سیٹ ہے۔''

میں نے کہا کہ ''ہم چار ہیں چار سیٹیں چاہئیں۔''

اُنہوں نے کہا کہ ''ہم دیں گے آپ آئیں تو۔۔۔''

میں تو گھبرا رہی تھی مگر ساتھی لڑکیوں نے ہمت بندھائی اور ہم پیچھے والے پورشن میں چلی گئیں، وہاں ایک تین کی سیٹ خالی تھی، اور ایک دو والی پر ایک لڑکا بیٹھا تھا، میں نے کہا اس کو اٹھائیں، وہ اٹھ گیا، اور ہم بیٹھ گئیں، اب مجھ پہ سوالوں کی بوچھار ہونے لگی، ہر کوئی پوچھنے لگا تم کہاں سے ہو؟ میں ان کو کہتی رہی آپ کو کیا؟ وہ تین تھے، آخر ایک نے مصری لہجے میں کہا تم قطر سے آئی ہو، اب میں جھوٹ نہ بول سکی اور بتایا، میں نے کہا تو تم خیریہ کے شوہر ہو؟ اس نے کہا کہ ہاں۔ (خیریہ سے میری ملاقات چند دن پہلے ہوسٹل میں ہو چکی تھی) دوسرے دو نوجوانوں میں ایک عراق سے تھا دوسرا فلسطین سے۔ اس طرح تعارف ہوا جو کئی سال تک چلا۔ اس کا نام سمیر عبدالحمید تھا۔ اور وہ اُردو میں ڈاکٹریٹ کرنے آیا ہوا تھا۔ اکثر عربی ڈیپارٹمنٹ میں اس سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اساتذہ سے گپ شپ لگانے آجاتا تھا، کہتا تھا اس قوم کے پاس جنرل نالج بالکل نہیں ہے، میں بتاتا ہوں کہ میں مصر سے ہوں ان کو نہیں معلوم کہ مصر دنیا کے نقشے پہ کہاں ہے۔ اس کی بیوی نے بھی کسی انگلش کے کورس میں داخلہ لیا ہوا تھا، اُن کی رہائش ہمارے ہوسٹل کے بہت ہی نزدیک گیسٹ ہاؤس میں تھی۔ ہم شاپنگ سینٹر کو جاتے تو راستے میں اگر اُن کی رہائش گاہ کا دروازہ ہوتا تو حال چال پوچھ لیتے تھے۔ دونوں ہی میاں بیوی بہت خوبصورت تھے، سمیر بحیرہ ء روم کے باسیوں جیسے نقش ونگار کا مالک تھا، یعنی درمیانہ

قد، گوری رنگت، نہ دبلا نہ لاغر درمیانہ جسم۔ اکثر ٹی شرٹ اور پینٹ پہنتا تھا۔ خیر یہ تو بہت گوری تھی اور نقوش بھی بہت جاذب تھے۔ وہ پہلے تو عربی فراک پہنتی تھی مگر بعد میں اس نے پاکستان ڈریس پہننا شروع کردیا تھا۔

اولڈ کیمپس کے ساتھ ہی انارکلی ہے وہاں میں ایک دن شاپنگ کرنے گئی تو وہ دونوں بھی وہاں پھر رہے تھے۔ سلام دعا ہوئی۔ کچھ میں نے دکاندار کے ساتھ اُن کی بات کا ترجمہ کردیا، واپسی پہ چلتے چلتے ایکدم کہنے لگا ''ایک بات تو بتاؤ، یہ آپ لوگوں نے ہمزہ کہاں پھینک دی؟''

سچی بات ہے مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آئی یہ کہہ کیا رہا ہے، پھر اس نے وضاحت کی، یہ ہمزہ قطع نہیں ہوتی عربی میں؟ میں نے کہا ہوتی تو ہے کہنے لگا تو کہاں گئی؟ اردو میں اس کا وجود ہی نہیں ہے، کیا تم نے نوٹ نہیں کیا؟ اب اسے کیا بتاوں کہ ہمیں خرچے پورے کرنے کے لئے نوٹ ملیں تو کچھ نوٹ بھی کریں۔

میں نے کہا ''نوٹ تو کیا ہے، مگر اس کا جواب نہیں ملا۔''

کہنے لگا ''غضب خدا کا اسلام، ایمان کسی لفظ میں ہمزہ نہیں ملتی، حتیٰ کہ جو قرآن یہاں چھپتا ہے اس میں بھی کسی لفظ میں نہیں ہے، یہ آخر ماجرا کیا ہے؟''

میں نے کہا ''بھئی مجھے تو اُردو نہیں آتی مجھے کیا پتہ، یہ تو تمہارا فیلڈ ہے تمہیں پتہ ہونا چاہئے۔''

کہنے لگا ''تم سرچ کرواس پر۔''

میں نے کہا ''میں تو نہیں کرسکتی، کیونکہ مجھے اُردو میں سرچ کرنا آتا ہی نہیں ہے، میں تو عربی میں اپنا کام کرلوں تو بڑی بات ہے، یہ تو تم خود کرو یا پھر کسی اُردو ڈپارٹمنٹ والے سے کہو۔''

اور بات آئی ہوگئی۔ ان سے ملاقاتیں بہرحال جاری رہیں، مگر پھر اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

پھر ایک دن، ان کے گھر میں تھی میں تو کہنے لگا ''میں نے تم سے ایک بات پوچھنی ہے!''

میں نے کہا ''پوچھ لو۔''

کہنے لگا ''سچ سچ بتانا، جھوٹ نہیں بولنا۔''

مجھے بہت تشویش ہوئی کہ اللہ جانے کیا پوچھے گا۔ ان عرب نوجوانوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کب اظہار عشق کردیں، بہت احتیاط سے بات کرنی پڑتی ہے، چند دن پہلے ہی میرے شوہر سے ملا تھا وہ، میں نے سوچا خدا خیر کرے، ادھر وہ بار بار کہہ رہا تھا سچ سچ بتانا،

تمھاری بھونکوں سے تو ہم خود بھی عاجز آ چکے ہیں۔

ادھر میں خود کو اس کے اظہار عشق کے جواب کے لئے تیار کر رہی تھی، بیوی کو کہنے لگا تم جاؤ، فلاں کام کرو میں ذرا اس سے بات کر لوں، اب تو میرا واقعی خون خشک ہونے لگا، آخر کار بولا تو یہ کہا۔۔۔تم پاکستانی لوگ فروٹ پر نمک ڈال کر کیوں کھاتے ہو؟ میری ایک دم ہنسی چھوٹ گئی، کہنے لگا دیکھا، ایسے ہی ہر کوئی ہنس کر دکھا دیتا ہے، بتاتا کوئی نہیں اصل بات کیا ہے۔ میری جان میں جان آئی تو سنجیدہ ہو کر میں نے کہا کہ یہ ایک رواج ہے جو سب ایک دوسرے کی تقلید میں کرتے ہیں، کہنے لگا اللہ نے رنگا رنگ ذائقے والے فروٹ پیدا کئے ہیں اور تم لوگ نمک ڈال کر سب کا ذائقہ ایک جیسا کر دیتے ہو، لطف نہیں اٹھاتے نعمتوں کا۔ میں نے کہا کہ بھئی میں تو نمک نہیں ڈالتی، کہنے لگا ڈالنا بھی مت کبھی۔

میں جب گھر گئی تو اپنی کزن کو بتایا اس نے کہا اسے کہنا کہ یہ ہمارا قومی راز ہے جسے ہم افشاء ہرگز نہیں کریں گے۔ اگلے سال پھر ایک دن انارکلی میں دور سے عربی میں مجھے آواز دے رہا تھا، بیوی بھی ساتھ تھی، میں رک گئی جب پاس پہنچے تو کہنے لگا ''تمہیں ہمزہ ملی؟''

میں نے کہا ''مجھے کہاں وقت ملا تلاش کرنے کا۔۔۔؟''

کہنے لگا ''مجھے تو مل گئی۔''

میں نے پوچھا ''کہاں؟''

اس نے بتایا کہ غدر کے زمانے کا کسی نواب کا لکھا ہوا خط ملا ہے جس میں ہمزہ موجود ہے۔

میں کہا ''چلو مبارک ہو آپ کو''

کہنے لگا ''میں نہ کہتا تھا کہ ہمزہ ضرور عربی کے ساتھ آئی ہے یہاں آ کر کہیں گری ہے، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عربوں نے یہاں کے لوگوں کو عربی زبان بغیر ہمزہ کے سکھائی ہو۔''

اُس کی بیوی نے کہا کہ یہ بات یہاں مارکیٹ میں کرنے والی ہے؟ گھر میں کرتے؟

کہنے لگا ''اب ملاقات نہیں ہوتی ناں۔ کیونکہ یہ بھی فائنل میں ہے بزی ہے میں بھی اپنے تھیسز میں بزی ہوں، میں نے سوچا کہ ابھی بتا دوں۔''

وہ کہہ رہی تھی ''لوگ تم کو پاگل کہیں گے۔''

اُس کا کہنا تھا ''کونسا کسی کو عربی آتی ہے یہاں۔۔۔''

ایک دفعہ (وہیں انارکلی میں) کہنے لگا ''تم نے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں!''

اُس نے کہا ''ضرور پڑھنا اس کے بارے میں اور اس کی شاعری۔''

پھر مجھے بتایا کہ اس کا اُردو کا فیورٹ شعر بہادر شاہ ظفر کا ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

اس کی بیوی نے مطلب پوچھا، وہ تو دکاندار کے ساتھ بزی ہو گیا تھا میں نے ترجمہ کر دیا، وہ کہنے لگی ''بھلا مرنے کے بعد محبوبہ کی گلی میں دفن ہونے کا کیا فائدہ ہوگا اسے؟''

اسے کہنے ''لگا یہ تمہاری سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ یہ جلاوطنی کی شاعری ہے۔ جیسے عربی میں احمد شوقی اور محمود سامی البارودی وغیرہ کی ہے، تو اس کی سمجھ میں آ گئی بات۔

ایم اے ختم کر کے میں تو آ گئی، مگر پی ایچ ڈی کے سلسلے میں کبھی کبھی جانا ہوتا تھا، تو اس سے ملاقات ہوتی تھی، پھر ایک دفعہ میں گئی تو پتہ چلا کہ وہ اپنا تھیسز ختم کر کے جا چکا ہے۔ اس دوران اُن کے ہاں ایک بیٹی کی پیدائش بھی ہوئی۔ یہاں کی اردو بک شاپ میں اُس کی لکھی ہوئی دو کتابیں پڑی ہیں۔ ایک عربی زبان میں اُردو سیکھنے کے لئے، اور ایک اردو بولنے والوں کے لئے عربی سیکھنے کی۔ ملتان کی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں عربی ڈپارٹمنٹ کی لائبریری میں بھی دیکھی ہیں یہ دونوں کتابیں۔ جامعۃ القاہرہ کے اردو ڈپارٹمنٹ سے اس کا تعلق تھا۔

اب بھی کبھی کبھی ہم اس کو یاد کرتے ہیں تو وہ منظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے جب وہ پردیسی طالب علم انارکلی میں ہمزہ تلاش کر رہا ہوتا تھا۔

بی بی شیریں

میرا دوست حمزہ

میرا بہترین دوست حمزہ۔۔۔ بے شمار خوبیوں کا مالک ہے۔ خوش اخلاق، ملنسار، لفظوں کا جادوگر۔ موقع، بے موقع شعر کہنے کا عادی، رکشے، ٹرک، پان کے سٹال کے باہر لکھا، شاید ہی کوئی شعر ہو جو اسے ازبر نہ ہو۔ دیکھنے میں سانولا، سجیلا، بانکا نوجوان۔۔۔ آنکھوں کو نامعلوم وجوہات کی بناء پر سرمے سے لادے رکھتا ہے۔ ماتھے پہ ہمہ وقت ایک چمکتی، خمدار لٹ سجی رہتی ہے، بال تیل میں ڈوبے رہتے ہیں گمان گزرتا ہے کہ مساج نہیں کرتا بلکہ تیل کے کنستر میں سر ڈال کے مدھانی کی طرح خوب گھماتا ہے۔ سارا گاؤں اسے جانتا ہے۔ حلقۂ یاراں میں موصوف کی وجۂ شہرت ان کے عشقیہ مزاج ہیں۔ حسن پرست ایسا ہے کہ کسی واجبی شکل صورت کی لڑکی کو دیکھ کے بھی خدا کی حمد کہے اور پوچھے" آخر کوئی لڑکی اتنی حسین کیسے ہو سکتی ہے۔"

موصوف کا مزاج عاشقانہ عین بچپن سے ہے۔ پہلا عشق گو کہ اتنی پرانی بات تو نہیں ہے مگر چونکہ پہلے عشق سے لے کر حالیہ عشق تک کئی عشقیہ حادثات رونما ہو چکے ہیں اس لیے اب صحیح وقت اور اعداد و شمار بارے متذبذب ہی رہتے ہیں۔ ذہن پہ زور دیتے ہوئے ایک دن بتایا تھا کہ پہلا عشق چھٹی جماعت میں اُردو کی استانی شگفتہ سے ہوا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی ننھے حمزو نے معصومیت سے خود سے پوچھا تھا" کوئی لڑکی اتنی حسین کیسے ہو سکتی ہے۔" انجام اس عشق کا وہی ہوا جو ہر شاگرد، استانی والے یکطرفہ عشق کا ہوتا ہے، ایسے عشق ناکامی اپنی کنڈلی میں لکھوا کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

عشق ناکام نہیں ہوا بلکہ بہت زیادہ ناکام ہوا۔ ہوا یوں کہ محبت کے جذبے سے سرشار بے خوف حمزو نے استانی جی کو دل، پھولوں، کبوتروں، بیل بوٹیوں سے مزین محبت نامہ لکھ ڈالا۔ اُردو کے ساتھ نالائق نے وہی سلوک کیا جو صلاح الدین ایوبی نے سومنات کے مندر کے ساتھ کیا تھا، نہ املا کا خیال نہ ہجے کا لحاظ، ڈرائنگ بدبخت کی اچھی تھی کاش اُردو بھی ہوتی۔ محبت نامہ پڑھنے کی دیر تھی کہ استانی جی اپنے نام کے انتہائی برخلاف رویے پہ اتر آئیں۔ حمزو کے حصے میں زناٹے دار تھپڑ آئے جو بہر حال اس کی عشقیہ تاریخ کا تاریک باب ہیں۔ آج تک معصوم جان سمجھ نہیں پایا کہ جلال استانی جی کو اُس کے جذبات پہ آیا تھا یا اُردو کی بے حرمتی کی جسارت پر، خیر" گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں" اور حمزو گرا تو کیا گرا ترین نکلا۔ عشق کے میدان میں کبھی پاس کے گرلز

سکول میں زیرِ تعلیم کسی لڑکی نے تو کبھی ماسٹر جی کی بیٹی نے حمزو کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ''آخر کوئی لڑکی اتنی حسین کیسے ہو سکتی ہے۔''

وقت گزرتا گیا اور حمزو نے بالآخر جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ لیا اب وقت تھا تمام تر تجربے اور مہارت کے ساتھ کامیاب عشق کرنے کا، عزائم بلند ہوں تو قسمت یاوری کرتی ہی ہے۔ پڑوس والا مکان کب سے خالی تھا۔ نئے کرائے داروں کی ایک دو روز قبل ہی آمد ہوئی تھی۔ ایک دوپہر چھت پہ بیٹھے حمزو کی نظر ساتھ والی چھت پہ موجود اسلم کبوتر باز پر پڑی جو اسے پہلی ہی نظر میں کافی ناگوار گزرا ہاں البتہ جو خوشگوار گزرا بلکہ گزری وہ تھی اسلم کی بہن نسرین۔ حمزو سوچ میں پڑ گیا ''آخر کوئی لڑکی اتنی حسین کیسے ہو سکتی ہے۔''

اب کے مگر ایک الجھن بھی تھی آخر یہ سب پیاری لڑکیاں ایسے اوٹ پٹانگ لڑکوں کی بہنیں کیوں نکلتی ہیں۔ حمزو کا ذہن سوچوں کا جال بُن رہا تھا، اسلم کبوتر ایسا نامعقول شخص اس کا سالا بنے گا؟ کیا خوب حق ادا ہوگا لفظ ''سالا'' کا۔۔۔ خیر پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں، یہاں بھی تھے، اسے تو نظر اس گلاب پر رکھنی تھی جو کہ اس نے رکھی اور خوب رکھی۔

جولائی کی تپتی دوپہر میں نسرین کا انتظار کرتا یہ سانولا عاشق سانولا ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اکثر سوچتا، نسرین کیسی ناسمجھ ہے، آخر چھت پر کیوں نہیں آتی؟ کیا وہ نہیں جانتی جولائی کی دھوپ کی افادیت کو؟ عشق حمزو کا آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ دوسری طرف نسرین بیچاری چونکہ روحانیت سے دور دور تک لاتعلق تھی سو کوئی الہام یا وجدان اسے نہ ہو پایا کہ امرود کے پودے کی اوٹ سے ہمہ وقت جھانکنے والا یہ عاشق اب بالکل پک کے تیار ہو چکا تھا۔

وہ محبت ہی کیا جس میں ہجر کا مرحلہ نہ آئے، سو یہاں بھی آ گیا۔ حمزو کے قریبی دوست کو کسی کام سے شہر جانا تھا، زبردستی اس غریب کو بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔ تین دن یعنی بہتر گھنٹے، کوئی پوچھے کسی عاشق پر کیا گزرتی ہے۔ معشوقہ سے دور بادلِ نخواستہ حمزو گیا اور جیسے تیسے وقت گزار کے واپس آیا۔ گاؤں پہنچتے ہی دیکھا تو گلی کچھ سجی دھجی نظر آئی آگے بڑھا تو پڑوس میں جشن کا سماں تھا۔ ایک عجیب سی مسرت نے حمزو کو آ گھیرا ''آخر نگوڑے اسلم نے ساری زندگی کبوتر ہی تو نہیں اڑانے تھے، وہ بیاہا جائے گا تو نسرین کی باری آئے گی۔'' حمزو کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ گھر داخل ہوتے ہی پتہ چلا کہ سب پڑوس میں شادی میں شرکت کے لیے گئے ہیں سو یہ بھی چل دیا۔ رخصتی کا وقت تھا۔ دلہن خراماں خراماں دولہا کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ حمزو کی نظر دلہن پہ پڑی۔ زبان گنگ، آنکھیں حیران اور دل۔۔۔ دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ دلہن بنی نسرین واقعی بہت حسین لگ رہی تھی۔ حمزو کی دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کامیاب عشق کچھ نہیں ہوتا، کوئی حسینہ اس سے محبت کے لیے نہیں بنائی گئی اور وہ اب کبھی عشق نہیں کر پائے گا۔ اُس کا یہ خیال باقی رہا جب تک کہ ٹس کی نظر نسرین کے ساتھ چلتی اسکی سہیلی بانو پہ نہیں پڑ گئی۔ ٹوٹے دل پہ ہاتھ رکھے دُکھی حمزو مسلسل خود سے پوچھ رہا تھا ''آخر کوئی لڑکی اِتنی حسین کیسے ہو سکتی ہے؟''

سوال میرا خیال ہے کہ قدرت ایسی اشیائے مدرکہ سے مل کر بنی ہے جو ایک دوسرے کے کُل اور جزو کی حیثیت سے شامل ہیں، جہاں اضدادی اسلوبِ تفکر تمام اشیائے مدرکہ کو سمجھنے کے لئے کیا گیا ہے وہاں فلسفیانہ دقیقہ رسی، توازنِ اتصال اور اضدادی مادیت کو توتیاتی رتبہ حاصل ہے۔ کائنات کی حیاتِ مادی ہی مقدم ہے۔ اس کی حیاتِ روحانی ثانوی اور استخراجی ہے۔ اعصابی کیفیتیں اور ناآسودہ جبلتیں دراصل خارجی چیزوں اور ان کے ارتقا کا عکس نہیں ہیں بلکہ خارجی چیزیں ہیں اور ان کا ارتقا حقیقت کی شکل میں اور تصور کا محض عکس ہیں جو وجودِ کائنات سے قبل تھا۔ مفکروں کے نزدیک کائنات اور جملہ نظامات ابدی اور استقراری ہیں اور خیالِ نفسِ ناطقہ پر عالمِ بالا لے ترشحات کا نتیجہ ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کائنات کا ارتقا تجویز اور تردید کے تصادم سے عبارت ہوگا تو پھر تدریجی وقفے کے بعد نقطۂ تغیر کب ظہور پزیر ہوگا؟ وہ کون سی تردید ہوگی جو تجویز سے متصادم ہو کر نئی ترکیب کو وجود میں لائے گی؟

جواب اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

دریچے از ڈاکٹر شفیق الرحمن

میم سین بٹ

پھجو بھگت کا چیلا

اِن سے ملئے، یہ ادیب، صحافی اور کالم نگار کہلاتے ہیں اپنے اصل نام سے زیادہ قلمی نام سے مشہور ہیں، بعض خواتین وحضرات انہیں منڈا سیالکوٹیا بھی کہتے ہیں، تصویر میں اصل عمر سے آدھے کے لگتے ہیں چہرہ دیکھ کر بھی ان کی عمر کا درست اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تاہم سر کے بالوں میں اتر آنے والی چاندی بھانڈا پھوڑ دیتی ہے ان کا چہرہ کتابی، آنکھیں بادامی بلکہ چلغوزی، دانت بڑے، کان چھوٹے، ناک ستواں، قد متوسط، جسم فربہی مائل جبکہ رنگت گرمیوں میں گندمی اور سردیوں میں صاف رہتی ہے شاید اسی لئے تصویر صرف موسم سرما کے دوران کھنچواتے ہیں موسم گرما میں اس سے پرہیز اور ساون بھادوں کے موسم میں تو مکمل پرہیز کرتے ہیں۔

دل کے اچھے اور زبان کے بہت برے ہیں، صنف نازک کو اپنے دل کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے بلکہ زبان اور قلم کے ذریعے خواتین وحضرات کو خود سے دور کرتے رہتے ہیں اس کے باوجود ان میں مروت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ اگر کسی کو خود بھی فون کریں تو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ جسے کال کر رہے ہیں وہی فون بند کریں لہٰذا ان کے انکے اپنے موبائل کا کارڈ ختم ہونے پر کال خود بخود کٹ جاتی ہے، کسی سے ملاقات کیلئے جائیں تو بھی یہی کلیہ اختیار کرتے ہیں بعض بے تکلف میزبان تو بالآخر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جو بیچارے ان سے بھی زیادہ تکلف اور مروت کے مارے ہوتے ہیں وہ طویل ملاقات سے بچنے کیلئے اہلخانہ سے کہلوا دیتے ہیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

عملی صحافت میں آئے انہیں دو عشرے سے زیادہ مدت ہو گئی ہے، نیوز ڈیسک پر آنے سے پہلے رپورٹنگ کے زمانے میں بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھتے تھے لیکن اب اسے اپنا زمانہ جاہلیت قرار دیتے ہیں۔ اس دور کی تصویر میں ان کے چہرے پر ابابیل اپنے پر پھیلائے بیٹھی دکھائی دیتی ہے ماضی کی تصاویر دیکھنے سے ٹاپ ٹین ہی لگتے ہیں اور اسے خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر ادب

وصحافت کی طرف نہ آگئے ہوتے تو یقیناً ٹاپ ٹین بن جاتے اور شاید اب تک کسی اصلی یا جعلی پولیس مقابلے میں پار ہو چکے ہوتے ۔

انہیں بچپن ہی میں کہانیاں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا بچوں کیلئے ٹارزن، عمرو عیار وغیرہ کی کہانیوں اور بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ، تعلیم و تربیت اور پیغام جیسے رسائل کے بعد بچوں کے ناول پڑھنے کا آغاز انہوں نے اے حمید، اشتیاق احمد، مقبول جہانگیر اور نصیر الدین حیدر وغیرہ سے کیا تھا پھر ابن صفی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے جن کے فوت ہونے اور ان کے جاسوسی ناول دس دس بار پڑھنے کے بعد یہ اے حمید کے مداح ہو گئے تھے ان کی ہر تحریر ڈھونڈھ کر پڑھ ڈالی تھی ، اے حمید کی ریل گاڑی کے ذریعے بلا ٹکٹ آوارہ گردیاں انہیں بے حد پسند رہی ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لڑکپن کے دوران خود بھی سیالکوٹ اور نارووال کے درمیان ٹرین کے ذریعے اچھی خاصی آوارہ گردیاں کر چکے ہیں۔

اے حمید کے علاوہ ابن انشاء، ڈاکٹر شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر یونس بٹ کی تحریریں بھی انہیں پسند ہیں، اے حمید کے انداز تحریر سے تو بہت ہی زیادہ متاثر ہیں اور رانجھا رانجھا کرتے خود بھی رانجھا بنتے جا رہے ہیں، اے حمید مرحوم کی طرح انہیں بھی ماضی بہت اچھا لگتا ہے اور لکھتے وقت ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے رہتے ہیں اگر ان پر اعتراض کیا جائے کہ یہ ناسٹلجیا کا شکار ہو گئے ہیں تو فوراً اثبات میں سر ہلا کر علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھ دیں گے:

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا جو ماضی ہے میرے حال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزاء کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

انہیں علامہ اقبال کی نظم ''پرندے کی فریاد'' بہت پسند ہے ان کی تحریریں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا تحت الشعور یہ نظم گنگناتا رہتا ہے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ ڈالیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

علامہ اقبال کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پایا جاتا ہے بلکہ دونوں کی شخصیت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں یہ بھی سیالکوٹ شہر کے ایک متوسط کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا برج بھی عقرب ہے عمر میں علامہ اقبال سے ایک دن بڑے اور نوے سال چھوٹے ہیں یہ بھی ست الوجود ہیں اور انہوں نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ چار پائی یا فرش پر نیم دراز رہ کر لکھتے پڑھتے اور احباب کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے گزارا ہے یہ بھی مغربی بود و باش بالخصوص انگریزی لباس کے سخت خلاف ہیں کالج کے زمانے تک مجبوری کے عالم میں پتلون اور شرٹ پہن لیتے تھے اب برسوں سے سردیوں میں کھدر جبکہ گرمیوں میں کاٹن کی شلوار قمیض پہنتے ہیں، عام بول چال کیلئے پنجابی زبان کو ترجیح دیتے ہیں انہیں بھی پھلوں میں آم پسند ہیں، یہ بھی ایلوپیتھی ادویات کا استعمال پسند نہیں کرتے اور طب یونانی کے طریقہ علاج کو ترجیح دیتے ہیں یہ بھی دل کے بڑے کمزور ہیں اور خون بہتا ہوا دیکھ کر بے ہوش ہو جاتے ہیں عید الضحیٰ پر جانور کی قربانی کے وقت گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔

تعلیمی نصاب سے انہیں زیادہ دلچسپی کبھی نہیں رہی البتہ سالانہ امتحانات سے پہلے اتنی تیاری ضرور کر لیتے تھے کہ فیل ہونے اور والدین کے ہاتھوں پٹنے سے بچ جاتے تھے البتہ اپنی شرارتوں کے باعث سکول میں اساتذہ سے کبھی کبھار اور گھر میں والدہ کے ہاتھوں آئے روز مار کھاتے رہتے تھے جس نے انہیں بعدازاں باغی بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، یہ شروع ہی سے مزاج کے بڑے تیز ہیں ان کی زبان میں مٹھاس کم اور ترشی زیادہ پائی جاتی ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ میٹھا برائے نام اور نمک بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اسی لئے شوگر سے تو محفوظ ہیں لیکن ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے اور مزاج کیخلاف کوئی بات سن کر تو آگ

بگولہ ہی ہو جاتے ہیں، لڑکپن میں بڑے جھگڑالو ہوتے تھے مخالفین اور دوست احباب میں ''لڑاکا'' کے نام سے مشہور تھے کالج میں لڑائی آخری ثابت ہوئی تھی بعدازاں ادب کے مطالعہ نے انہیں صرف زبانی کلامی لڑائی جھگڑے تک محدود کر دیا تھا غالباً انہوں نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ آپا دھاپی شریفوں کا شیوہ نہیں اور شریف لوگ انہیں شروع ہی سے اچھے لگتے ہیں شاید اسی لئے سیاست میں شریف برادران کے حامی ہیں اور انکی حمایت میں سیاسی مخالفین کیخلاف اپنے قلم سے کلاشنکوف کا کام لیتے رہتے ہیں۔

ان کی تعلیم و تربیت بھی عجیب و غریب ماحول میں ہوئی تھی ان کے ددھیال کا تعلق پی پی پی جبکہ ننھیال کا پی این اے سے تھا، زمانہ طالب علمی کے دوران اپنے سیکنڈ کزن کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ میں رہے مگر فرسٹ کزن کے ساتھ جماعت اہلسنت (بریلوی) کے علماء کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے رہے تھے جبکہ ان کے اپنے خاندان کا تعلق اہلحدیث مسلک سے تھا تاہم ننھیال کی طرف جھکاؤ کے باعث انہوں نے اپنے والدین کے ساتھ حنفی (بریلوی) مسلک اختیار کر لیا تھا، عملی اعتبار سے تو امام ابوحنیفہ کے مقلد جبکہ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہیں اور اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ رسی تو جل چکی ہے مگر ابھی بل نہیں گئے، یہ بزرگان دین کا تو احترام کرتے ہیں لیکن انہیں پیر ماننے والوں کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑ جاتے ہیں ہر شعبے میں پیر پرست لوگ انہیں پسند نہیں حالانکہ ان کی اپنی شخصیت میں ایک چھوٹا موٹا سا مرید چھپا بیٹھا ہے جو ادب، صحافت، ثقافت اور سیاست کے شعبوں سے تعلق رکھنے والی بعض ''برگزیدہ ہستیوں'' کو پیروں کی طرح مانتا ہے لیکن یہ خود اسے پیری مریدی تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان میں سے کسی شخصیت کی چوکھٹ پر جا کر سجدہ ریز نہیں ہوتے شاید اپنے اندر کے غیر مقلد سے ڈر جاتے ہیں، یہ خود کو معتدل مزاج قرار دیتے ہیں انتہا پسندی یعنی کٹر پن انہیں پسند نہیں اسی لئے بیک وقت ملاؤں اور ملحدوں کے ''کٹر'' مخالف ہیں بالخصوص ترقی پسندوں کے خلاف خوب لکھتے رہتے ہیں غالباً ڈاکٹر انور سدید کا ریکارڈ توڑنا چاہتے ہیں۔

یہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہیں جو بھی بات پسند نہ آئے اسے پتھر کی طرح دوسروں کے منہ پر دے مارتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دوستوں کو بھی ناراض کر بیٹھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے دشمنوں کی تعداد دوستوں سے بہت زیادہ ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی کرتے جاتے ہیں، ان سے پہلی بار ملنے والوں کو فوری طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ عقرب برج کی حامل شخصیت سے پالا پڑ گیا ہے اور وہ لوگ محتاط ہو جاتے ہیں جنہیں برجوں کے طلسم کدہ سے دلچسپی ہوتی ہے جنہیں نہیں ہوتی وہ بیچارے مارے جاتے ہیں ویسے یہ عام طور پر اپنے شناختی نشان کی طرح بالکل بے ضرر ثابت ہوتے ہیں لیکن انہیں اگر کوئی چھیڑ بیٹھے تو پھر جب تک بچھو کی طرح اپنا زہر اس پر انڈیل نہیں لیتے انہیں چین نہیں آتا، ادلے کا بدلہ ان کے پسندیدہ محاوروں میں شامل ہے عقرب ہونے کی وجہ سے یہ نقاد تو پیدائشی ہیں لیکن حلقہ ارباب

یہ میری بیگم اور ان کی شریکِ جرم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ ان کی والدہ ہیں!

ذوق کے جلسوں میں چودہ، پندرہ برسوں کی مسلسل حاضری نے انہیں بڑا زہریلا تنقید نگار بنادیا ہے، عام طور پر علامہ اقبال کا یہ شعر گنگناتے پائے جاتے ہیں:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

علامہ اقبال اور عطاء الحق قاسمی کی ابتدائی زندگی کی طرح یہ بھی برادری ازم کے قائل رہے ہیں اور کشمیریوں کو ہر معاملے میں ترجیح دیتے رہے ہیں عطاء الحق قاسمی کے والد مرحوم کی طرح انہیں بھی پتا چل جاتا ہے کہ کون کشمیری ہے اور کون نہیں البتہ یہ ابھی مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم کے درجے تک نہیں پہنچے جن کی نگاہ ڈی این اے ٹیسٹ کا کام کرنے لگ گئی تھی لڑکپن میں عطاء الحق قاسمی کا ایک دوست انہیں ماڈل ٹاؤن ملنے آیا تو مولانا بہاء الحق قاسمی نے اسے دیکھ کر اپنے صاحبزادے سے کہا تھا کہ ''یہ لڑکا مجھے کشمیری لگتا ہے، عطاء الحق قاسمی نے جواب دیا کہ ''نہیں اباجی! سعید کے والد پنجابی شیخ ہیں'' جس پر مولانا بہاء الحق قاسمی مرحوم نے کہا تھا کہ ''وہ پنجابی شیخ ہی ہوگا مگر یہ لڑکا ضرور کشمیری ہے۔''

ان کے بیشتر قریبی دوست کشمیری ہیں تاہم ان کا اختلاف بھی زیادہ تر ان سے ہی رہتا ہے شاید اس لئے کہ وہ ان کے ہم مزاج ہیں، ان میں لسانی عصبیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مادری زبان پنجابی میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں اور اگر اردو میں بات کرنی پڑ جائے تو گویا انہیں موت ہی پڑ جاتی ہے شاید اسی لئے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں انہوں نے کبھی بحث میں حصہ نہیں لیا حالانکہ لکھتے پڑھتے اردو میں ہیں البتہ صرف اردو داں حضرات کے ساتھ اردو میں بات کر لیتے ہیں اور ان سے ایسے لہجے میں اردو بولتے ہیں جیسے ان پر احسان کر رہے ہوں بڑے متعصب پنجابی ہیں، انگریزی زبان وادب سے بھی انہیں کوئی لگاؤ نہیں دراصل ''فرنگیوں'' سے نفرت انہیں ورثے میں ملی ہے ان کے دادا مجلس احرار اسلام میں شامل رہے تھے لہٰذا فرنگی کلچر یعنی انگریزی لباس ہی نہیں زبان کے بھی خلاف ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں ان کی زبان یا قلم سے کہیں انگریزی کا کوئی لفظ نہ پھسل جائے، اردو زبان کی صحت خراب کرنے والی پاکستانی فلمی اداکاراؤں کے علاوہ ایف ایم ریڈیو اور ٹی وی چینلز کی میزبان خواتین بھی انہیں بڑی زہر لگتی ہیں۔

کھانے میں انہیں دال چاول اور نان نکیاں پسند ہیں اس کے علاوہ چنے پٹھورے، حلوہ پوری، ساگ اور مکئی کی روٹی بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں، بھلے اور لوبیا چاٹ انہیں بے حد مرغوب ہے، چھوٹا بڑا گوشت اور مچھلی نہیں کھاتے، دودھ اور اس سے بننے والی اشیاء مکھن، دہی، دیسی گھی، لسی، چائے وغیرہ بھی استعمال نہیں کرتے، دراصل بچپن میں ٹائیفائیڈ کے ہاتھوں موت کے منہ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے دودھ اور گوشت کا مکمل بائیکاٹ کر دیا تھا اور ضدی طبیعت کے باعث اب تک اپنے فیصلے پر سختی سے قائم ہیں اس سے ان کی استقامت کا پتا چلتا ہے بقول شاعر۔۔۔

''بائیکاٹ'' کیا ہے تو قائم بھی رہو ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

ان کے بعض دوست احباب انہیں کڑاہی گوشت، تکے کباب اور چائے و مشروب مغرب وغیرہ پینے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں لیکن یہ ''صاحب کردار'' کہلوانے کیلئے سختی کے ساتھ انکار کر دیتے ہیں، گرمیوں میں ٹھنڈا پانی جبکہ سردیوں میں سیاہ کافی اور سبز چائے کا قہوہ پیتے ہیں، انہیں ''مچھو بھگت کا سچا چیلا'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے، مچھو بھگت کو ماننے والے جھوٹ نہیں بولتے تھے، گوشت نہیں کھاتے تھے، شراب نہیں پیتے تھے اور شادی بھی نہیں کرتے تھے، یہ بھی سبزی خور اور صوفی بلکہ برہمچاری ہیں، ان کے پسندیدہ صوفی شاعروں میں سے شاہ حسین، وارث شاہ اور بلھے شاہ نے شادی نہیں کرائی تھی غالباً یہ بھی سمجھتے ہیں کہ صوفی بزرگ شاعروں کی پیروی کیلئے عورت سے دور رہنا ضروری ہے۔ ویسے بھی یہ عام ادیبوں، شاعروں اور صحافی دانشوروں کی طرح آزادی پسند ہیں لہٰذا شادی سمیت کسی بھی قسم کی غلامی کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

یوسف عالمگیرین

مستنصر حسین تارڑ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مستنصر حسین تارڑ اُدب میں جٹ برادری کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا اصل کام تو زمین کو سنوارنا ہوتا ہے لیکن اُنہوں نے لفظوں کو سنوارنے کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کو بچپن سے ہی ادب سے لگاؤ تھا۔لہٰذا اپنے والدین کی زمینداری میں اُنہوں نے دلچسپی ظاہر نہ کی اور ادب کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔یہ ادب سے محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ کلاس روم میں لحاف لے کر چلے جاتے تھے گویا یہ لحاف کی اہمیت کو اس وقت بھی بخوبی سمجھتے تھے۔عصمت چغتائی کا لحاف تو اُنہوں نے بعد میں پڑھا ہوگا۔

مستنصر حسین تارڑ میٹھی میٹھی باتیں کرنے والے آدمی ہیں۔یہی انداز سابق نگران وزیر اعظم (معراج خالد) مرحوم کا بھی رہا ہے۔مجوزہ یکسانیت شاید لاہور کے لکشمی مینشن کی بدولت طے ہوئی ہے جہاں یہ ان کے پڑوسی تھے۔اتفاق کی بات ہے کہ سعادت حسن منٹو بھی لکشمی مینشن میں ہی رہتے تھے۔اُن کی کھڑکیوں کے جتنے بھی شیشے ٹوٹا کرتے تھے وہ مستنصر حسین تارڑ کی باؤلنگ سے ہی ٹوٹتے تھے، گویا یہ بال تو پھینکتے ہی رہے ہیں لیکن غلط ڈائریکشن میں۔ویسے بھی ہمارے ہاں بال پھینکنے اور پتہ پھینکنے کو ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے۔اپنے سفرناموں میں مستنصر حسین تارڑ نے پتے پھینکنے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔بال پھینکنے کو بعض مسلمان تو درکنار ہندو بھی اچھا نہیں سمجھتے۔اسی لئے پاکستانی کرکٹروں کو بال ٹھاکرے کی موجودگی میں بال پھینکنے میں کافی دشواری پیش آتی رہی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ بہت خوش قسمت آدمی ہیں کیونکہ بیرون ملک جیسا سفر یہ لگاتے ہیں کوئی اور نہیں لگا سکتا، شائد اسی لئے بعض اوقات سفر پہ سفر لگا لیتے ہیں۔اب کسی آدمی کے انتظار میں ہر سٹیشن پہ ایک حسینہ پھول اٹھائے کھڑی ہو تو کون کافر اِس خوبصورت سفر سے دستبردار ہوگا۔عطاالحق قاسمی ایک دفعہ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون بار بار اُن کے کندھے کی جانب جھک جاتی۔اُس نے یہی

عمل دو تین بار دوہرایا تو انہوں نے کہا "بی بی سیدھی ہو کے بیٹھو، میں عطاالحق قاسمی ہوں مستنصر حسین تارڑ نہیں۔"

مستنصر حسین تارڑ کو لکھنے کا شوق گھر سے ملا ہے۔ اُنہیں بہت اچھا لکھنے کا شوق کہاں سے ملا ہے اس کے بارے میں تو وہ خود ہی بتا سکتے ہیں۔ اُن کے والد ظفر علی خان "زمیندار" میں کام کرتے تھے، یوں یہ ادب اور صحافت کے عین وسط میں پروان چڑھے۔ تارڑ صاحب بچپن میں ایک آدمی کے ہتھے بھی چڑھ گئے تھے، جس نے تھوڑی سی برفی کھلائی اور اپنے ساتھ ٹرین میں بٹھا لیا۔ اِتفاق سے کسی واقف کار نے اُنہیں دیکھ لیا اور بازیاب کروا کے گھر پہنچا دیا اور یوں اردو ادب ایک اچھے ادیب سے محروم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

مستنصر حسین تارڑ کو لکھنے سے عشق ہے اور وہ اِتنے انہماک سے لکھتے ہیں کہ جیسے سچ لکھ رہے ہوں۔

مجھے بعض اوقات عطاالحق قاسمی اور مستنصر تارڑ کے کام میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں نے ڈرامہ، سفر نامہ، کالم نگاری اور مزاح پر طبع آزمائی کی۔

مستنصر حسین تارڑ کی حال ہی میں ۷۵ ویں سالگرہ منائی گئی ان کو دیکھ کر یوں لگتا جیسے انہوں نے ۷۵ ویں سالگرہ نوجوانی میں ہی منا لی ہے۔ کوئی خوبصورت سوچ اور دلپذیر شخصیت کے بل بوتے پر اتنا تر و تازہ اور خوبرو رہ سکتا ہے، یہ ناممکنات میں سے لگتا ہے۔

شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مستنصر حسین تارڑ عام زندگی میں بہت ڈسپلنڈ واقع ہوئے ہیں۔ اپنے رائٹنگ روم میں لکھ رہے ہوں تو گھر والے چاہتے ہوئے بھی کوئی کال تھرو نہیں کر سکتے کہ کال تھرو کرنے والی نہیں کال ملانے والی چیز ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے لکھنے کو عبادت جانا ہے اور اپنے حروف میں کبھی ملاوٹ نہیں ہونے دی۔ اس لئے ان کے لفظوں میں عداوت اور گراوٹ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ وگرنہ ہمارے ہاں بہت سے ادیبوں اور کالم نگاروں کے مضمون کا عنوان پڑھ کے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے یہ کالم کس کے خلاف لکھا ہے۔

نیچر سے محبت کرنے والے مستنصر حسین تارڑ کی، نیچر، محبت سے بھرپور ہے۔ انہوں نے تمام عمر محبتیں ہی وصول کی ہیں اور محبتیں ہی تقسیم کی ہیں۔ عہد حاضر میں مستنصر حسین تارڑ ایسی شخصیات دمِ غنیمت ہیں کہ معاشرے کی خوبصورتیاں ان ایسی شخصیات کے دم قدم سے ہوتی ہیں۔ خدا کرے یہ ہمیشہ خوشبوئیں بکھیرتے رہیں اور محبتیں تقسیم کرتے رہیں۔

آؤ لیڈری سیکھیں

لوگ بڑا آدمی بننے کی غیر شعوری خواہش میں لاکھوں روپے دے کر میڈیسن اور انجنیرنگ میں داخلہ لیتے ہیں کوئی امریکہ یا لندن جاتا ہے تو کوئی آسٹریلیا وغیرہ۔ جب مزید بڑے ہونے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں تو پھر کسی لڑکی کے امیر باپ سے لاکھوں کا جوڑا جہیز لے کر اپنی لگائی ہوئی رقم سود سمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر مریضوں کو لوٹتے ہیں اور انجینئر عوام کو۔ کئی ایسے ہوتے ہیں جو سالے یا بہنوئی کی مدد سے خلیج پہنچ کر شیخوں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتے ہیں۔ چند ایک شریف حضرات ضرور ایسے ہوں گے جن کو لوٹنے کے مواقع نہیں ملتے کیونکہ مولوی اس وقت تک مولوی ہوتا ہے جب تک اسے پولیس جیسی اوپر کی آمدنی والی نوکری نہیں ملتی۔ خیر کیوں نہ ہم آپ کو ایک ایسا پیشہ بتائیں جس میں نہ آپ کو لاکھوں کا سرمایہ لگانا پڑے نہ برسوں لکھنے پڑھنے میں سر کھپانا پڑے اور نہ ملازمت کر کے ایسی ایسی شکلوں کے Bosses کو خوش رکھنے پر مجبور ہونا پڑے جنہیں دیکھ کر یہ قول یاد آتا ہے کہ اللہ غلام بنائے لیکن غلام کی صورت نہ بنائے آمین۔ بہر حال بغیر کوئی ملازمت کئے بھی آپ نہ صرف بڑے آدمی کہلائیں بلکہ لاکھوں کی آمدنی گھر چل کر آتی رہے؟

یہ صرف لیڈری کے پیشے میں ممکن ہے۔

میری باتوں پہ ہنستی ہے دنیا از علیم خان فلکی

غزل کا اغواء

(اپنی غزل پہ تضمین دیکھ کر اوریجنل شاعر کی فریاد)

یہ شور کرتا تھا شاعر غزل کے ایواں میں
چھپی ہے کیسے غزل میری اُن کے دیواں میں
وہ چاہے کرتے کسی بھی حسین پر قبضہ
انہوں نے کیوں کیا میری زمین پر قبضہ
ستم تو یہ ہے قوافی بھی سارے چھین لئے
سپیرا رہ گیا ہے صرف اپنی بین لئے
زمین میری ہے، اِس پر ردیف میرا ہے
کہ جو غزل کا ہے محور، ردیف میرا ہے
نہیں ہے کوئی بھی شعرِ نحیف قابلِ ذکر
غزل میں صرف ہے میرا ردیف قابلِ ذکر
اگرچہ لکھتے ہیں اِس میں وہ اپنا افسانہ
مگر چرایا ہے میرا ہی سارا پیمانہ
گرہ لگائی ہے کچھ ایسے میرے مصرعے پر
مرے خیال کو اُلٹا کے رکھ دیا یکسر
کہیں تو نام پہ تضمین کے یہ کام کیا
کہ پورا مصرعے کا مصرعہ نگل لیا میرا
اُجاڑا اس طرح اشعار کا چمن میرا
کہ مجھ سے چھین لیا موضوعِ سخن میرا
''کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے''
کہ کیوں انہیں مرے مصرعے پہ حال آتا ہے
غزل کہی تھی فقط میں نے جانِ جاں کے لئے
لکھی نہ تھی کوئی یارانِ نکتہ داں کے لئے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو شعر سرقہ ہوئے کو بہ کو تلاش کروں
''میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں''
سناؤں کس کو میں دُکھڑا، کروں میں کیا فریاد
وہ میرے حصے کی بھی کھا گئے ہیں ساری داد
رپٹ یہ درج کراؤں گا جا کے تھانے میں
کہ ڈالو چوٹے شاعر کو جیل خانے میں

مسائرے

احمر علوی

روز دس دس مسائرے ہوں گے
سارے بوگس مسائرے ہوں گے

ایک ہفتے میں انشاء اللہ اب
سات سے دس مسائرے ہوں گے

ایک ساعری بنا یے چیئرمین
سہر میں بس مسائرے ہوں گے

ٹیٹوے ہوں گے سرفراز فقط
اتنے بوگس مسائرے ہوں گے

ہوگی تقریب بھی جو ختنہ کی
اس میں بھی بس مساعرے ہوں گے

موت پر لیڈران کی اب تو
اپنے فیس مسائرے ہوں گے

بھانڈ نقال کوی گائیں گے
اب تو سب رس مساعرے ہوں گے

کوئی اُردو پڑھے پڑھے نہ پڑھے
کچھ نہیں بس مسائرے ہوں گے

چند چٹکلے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

یہ مچھر بھی ردیف و قافیئے میں بھنبھناتے ہیں
بڑے ہی سُر میں غزلیں کان میں آ کر سناتے ہیں
خیالِ خاطرِ احباب رکھنے سے ہیں یہ عاری
جو دے نہ داد ان کو رات بھر ٹیکے لگاتے ہیں
یقیناً کوئی نسبت شاعروں اور مچھروں میں ہے
غضب ڈھاتے ہیں دونوں جب ترنم میں یہ گاتے ہیں

اک روز ایک چرسی بیٹھا جو آ کے بس میں
تھی سیٹ اُس کی ساری ملاّ کے دسترس میں
بدبو سی تھی چرس کی لڑکے کے ہر نفس میں
ملاّ نے اُس کو ڈانٹا اور طیش میں یہ بولا
کھوئے ہوئے ہو لڑکے دنیا کی کس ہوس میں
تم جا رہے ہو سیدھے دوزخ کے اک قفس میں
لڑکے نے چیخ ماری اور بولا "بس کو روکیں!
غلطی سے چڑھ گیا ہوں دوزخ کی آج بس میں!

اک دن یہ اک گدھے نے کہا دوسرے سے یار
آنے لگا ہوں تنگ اس مالک بُرے سے میں
یہ مارتا ہے چھانٹے سے صبح و مسا مجھے
رو بھی سکوں نہ لگ کے کسی کے گلے سے میں
اُس نے کہا کہ چھوڑ دو ظالم کو تم ابھی
تم کو ابھی ملاتا ہوں مالک نئے سے میں
اُس نے کہا کہ چھوڑ کے جاؤں تو کس طرح
اُمیدِ یار رکھتا ہوں اس باؤلے سے میں
کہتا ہے اپنی دخترِ چنچل سے روز یہ
شادی کروں گا تیری کسی دن گدھے سے میں

اے مرغِ مسلّم

حسیب احمد حسیب

اے مرغِ مسلم ! سامنے آ!!
محجوب نہ ہو مستور نہ ہو

کیوں میری نظر سے دور ہوا
یوں میری نظر سے دور نہ ہو

کیا تیرے سوا کچھ کھاؤں میں
کوئی ایسا بھی مجبور نہ ہو

دل تیری دعائیں کرتا ہے
یوں کھانوں سے مفرور نہ ہو

میں آس لگائے بیٹھا ہوں
اب آ بھی جا معذورر نہ ہو

بس آ بھی جا اب یوں نہ ستا
تو اتنا بھی مغرور نہ ہو

کیا بات ہے تیری کھانوں میں
چل اتنا بھی مشہور نہ ہو

آلو کا پراٹھا

(ایک وقوعہ دو لمرک)

شوکت جمال

تم نے جو کھلایا ہے یہ آلو کا پراٹھا
من کو میرے بھایا ہے یہ آلو کا پراٹھا
یہ دل یہ جگر اُس پہ لٹادوں
اور اُس کو گلے سے میں لگالوں
جس نے بھی بنایا ہے یہ آلو کا پراٹھا

کیوں سر میں سمایا ہے یہ آلو کا پراٹھا!
پہلی دفعہ کھایا ہے یہ آلو کا پراٹھا؟
پاگل نہ بنو حد میں رہو تم
غصے سے پڑوسی کے ڈرو تم
ہمسائے سے آیا ہے یہ آلو کا پراٹھا!

دہشت گرد

نوید ظفر کیانی

ناکے پر پولیس نے مجھ کو روک لیا
مخبر نے کر دی تھی اطلاع پہلے سے
شہر میں دہشت گردی کا کچھ خطرہ تھا
سو پولیس نے ہر مشکوک کو گھیرا تھا
اور مشکوک تھا مجھ سے بڑھ کر کون بھلا
مشقِ سخن کی خواری سے جو حلیہ تھا
اُس نے مجھ کو جیل سے بھاگا مجرم سا کر رکھا تھا
یوں بھی گزشتہ شب آنکھوں میں کاٹی تھی
سر کے بال تھے ایسے بکھرے بکھرے سے
جیسے کانٹے ہوں سیہہ کے
لالوں لال تھے دیدے
باہر کو نکلے
چہرے پر تھے بارہ بجے
ہینڈز اپ کر کے خوب تلاشی لی پولیس نے پھر میری
مجھ کو سرتاپا الٹایا پلٹایا
اور پھر بالآخر اُن کو
مل ہی گیا تھا میری دہشت گردی کا اک ایویڈینس
میری جیب سے اک سہ غزلے کی صورت

شش۔۔۔

عبدالحکیم ناصف

دِن حسیں رنگین راتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے
نوجوانی کی وہ گھاتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

گرلز کالج کے دریچے، جھاڑیاں دیوار و دَر
ہم لگاتے تھے جو گھاتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

کہکشاں، اوجِ ثریا، ماہِ نور اور کائنات
چار تھیں کُل کائناتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

دھیرے دھیرے گفتگو کر تُو خدا کے واسطے
پڑ نہ جائیں مجھ کو لاتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

وہ سویاں دار زلفیں، وہ پٹاخے دار گال
چاند راتیں، شب براتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

عمر کے بازار میں ملتے نہیں دلکش قلم
صرف ملتی ہیں دواتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

پہلے بھی دو شوق تھے اور اب بھی ہیں دو شوق بس
"فاعلاتن، فاعلاتیں"، تیری بھابھی سُن نہ لے

لڑکیوں کے یار موبائلز نمبر دے ذرا
پھر سے ہوں گی وارداتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

ایک ہی بیگم پہ ناصفؔ اکتفا اپنا نہیں
اور بھی ہیں بیگماتیں، تیری بھابھی سُن نہ لے

ایک غزل پر تنقید

محمد ادریس قریشی

اِس غزل کا جو ہے مطلع تھوڑا چھوٹا رہ گیا
شعر نمبر دو میں ، برخوردار! گھپلا رہ گیا

شعر کے اینگل ذرا تھوڑے نوکیلے رہ گئے
ہے ردیف اِس میں مگر کچھ پیچ ڈھیلے رہ گئے

شعر نمبر چار کے تو وزن سے کاندھا گیا
لفظ جو باندھا ہے یہ کس کر نہیں باندھا گیا

بھینس گائے بکریوں پر شعر ہیں کچھ ٹاپ کے
کھوپڑی میں کس قدر بھوسا بھرا ہے آپ کے

بچ نہیں پایا ہے کوئی قافیہ بھی وار سے
شعر بھرتی ہو گئے ہیں اِس میں کچھ بیکار سے

اِس میں ایطائے جلی کا بھی بڑا جنجال ہے
اور شترگربہ کی خوبی سے یہ مالا مال ہے

حلوے والا شعر پڑھ کر لگ رہی ہے بھوک سی
مصرعۂ ثانی میں اِک ترکیب ہے مشکوک سی

تھال میں حلوہ بچانے کی تو عادت ہی نہیں
حلوے والی ''ح'' گرانے کی اجازت ہی نہیں

اِس میں تشبیہیں نہیں ہیں استعارہ بھی نہیں
آپ کیوں روئے ابھی تو میں نے مارا بھی نہیں

شعر نمبر پانچ میں تو بھائی سکتہ رہ گیا
اور مقطع لگ رہا ہے کوئی بکتا رہ گیا

پوچھتے ہیں آپ اب کس بحر میں ہے یہ غزل
جس سے مرضی پوچھ لیں، یہ بحر ہے بحرِ چول

مجھ سے پہلی سی محبت۔۔۔

ڈاکٹر عزیز فیصل

میرے لپ ٹاپ میں وڈیوہیں نہ فوٹو تیرے
کیا کہوں کن سے ہیں رنگے ہوئے البم میرے
تو کہ آتی تھی نظر ان میں بڑی اوٹ پٹانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ہے رقیبوں کے تسلط میں ترا دو بٹا تین
کیا کیا جائے کہ ہے بیچ میں دیوار چین
عقل کہتی ہے خبردار نہ دیوار پھلانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میرا معمول ہے آتا ہوں میں گھر رات گئے
آنکھ کھلتی ہے مری دن کے کوئی بارہ بجے
تیرے کہنے پہ کروں نقل میں کیا مرغ کی بانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اب کہاں تیرے رہے میں اور مرے ڈالر و ین
تجھ پہ خرچے کو سمجھتا ہوں میں اب پاگل پن
لسٹ شاپنگ کی ترے ہاتھ میں ہے شارٹ کہ لانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

عاقل و بالغ و کنجوس ہے اب عشق مرا
مکھی سے بڑھ کے مکھی چوس ہے اب عشق مرا
ٹھیک کو ٹھیک سمجھتا ہے، یہ اب رانگ کو رانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

سالگرہ مبارک

عتیق الرحمٰن صفی

تمہیں رنڈوے، کنوارے بھی مبارکباد کہتے ہیں
کئی بابے بچارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارکباد دانشور ہی دیتے ہیں جنم دن پر
مگر پاگل یہ سارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہیں ملبوسِ سادہ نے مبارکباد بھیجی ہے
سبھی لہنگے شرارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

سنو کشمش کے کنبے سے مبارکباد آئی ہے
تمہیں بے بس چھوہارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارک تم کو دیتے ہیں ٹریفک سارجنٹ ایسے
سبھی سگنل اشارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہیں سرحد سے توپوں نے مبارکباد دے دی ہے
تمہیں جنگجو طیارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارک کی ٹیونیں ہیں غضب کاغذ کے باجے میں
تمہیں گیسی غبارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

اُدھر گوبھی نے ہے تم کو مبارکباد بھیجی تو
اِدھر آلو بخارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

ابھی کہکاف سے مجھ کو زکوٹا جن نے بتلایا
وہاں کے سب ادارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارک کی صدائیں آ رہی ہیں بَیس منٹوں سے
تمہیں اونچے چبارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہیں وِش کرنے آیا ہے پرنس اِک کاکروچوں کا
تمہیں شاہی نظارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارک تم کو دیتی ہیں سبھی خاموشیاں مل کر
تمہیں جلسوں کے نعرے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہارے اِس جنم دن پر ابھی تک نیند میں ہیں جو
تمہیں اُن کے ہلارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہیں اِملی کی چٹنی اور سموسوں نے کیا ہے وِش
تمہیں لڈو کرارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

جہاں اب تک نہ چھپ پائی تمہاری اِک غزل دیکھو
تمہیں وہ سب شمارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

تمہارے بعد مشکل سے گزارے کر رہے ہیں جو
تمہیں اُن کے گزارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

جنم دن پر سبھی سچ مچ مبارک دینے آئے ہیں
تمہیں جھوٹوں کے لارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

مبارک دینے آئی ہیں زمانے بھر کی سب چیزیں
تمہیں شوہر تمہارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

کسی بھی خاص ریزن سے میں جن کو لکھ نہیں پایا
تمہیں وہ استعارے بھی مبارکباد کہتے ہیں

اللہ بچائے

نشتر امروہوی

سونے کے واسطے نہ جگانے کے واسطے
میں شعر لکھ رہا ہوں ہنسانے کے واسطے

ڈائی سے کالا سر کا ہر اک بال ہو گیا
مونچھیں رنگیں تو جان کا جنجال ہو گیا
منہ پر الرجی ہو گئی، یہ حال ہو گیا
اچھا بھلا تھا سُوج کے فٹبال ہو گیا

معشوق کے جو اپنی وہ خاوند ہو گئے
مخمل میں جیسے ٹاٹ کا پیوند ہو گئے
شلوار میں ہو جیسے کمربند ہو گئے
چھوٹے ہوئے انار کی مانند ہو گئے

اب یہ سفید بال ہٹانے کے واسطے
مونچھیں منڈائیں عمر چھپانے کے واسطے

شوہر ہوں اب تو صرف کمانے کے واسطے
بیگم کما کے لاتی ہیں کھانے کے واسطے

گزری تمام عمر مری مار دھاڑ میں
داڑھی بڑھا رہا ہوں میں اب اس جگاڑ میں
جو مستحق عوام ہے وہ جائے بھاڑ میں
پیسہ بٹور لوں گا میں داڑھی کی آڑ میں

سنسد میں کیا خبر تھی وہی لوگ آئیں گے
تابوت بھی شہید کے جو بیچ کھائیں گے
دو دو ٹکے کے لوگ کروڑوں کمائیں گے
جو زیر تھے وہ بن کے زبر پیش آئیں گے

میں آپ کے لئے نہ زمانے کے واسطے
ملّا بنا ہوں صرف کمانے کے واسطے

سوئے ہوئے ضمیر جگانے کے واسطے
کچھ تو کرو یہ ملک بچانے کے واسطے

چھتری

اقبال شانہ

ڈر کے بارش سے کھول دی چھتری
تیز آئی ہوا، گئی چھتری

اُڑ رہا ہوں ہوا میں تقریباً
کیسے چھوڑوں نئی نئی چھتری

کون ڈرتا ہے ابر و باراں سے
احتیاطاً خرید لی چھتری

بھیگنا ہے میاں بہر صورت
کیوں میں کھولوں پھٹی ہوئی چھتری

جانے کب وہ چلے گئے یارو
میرے ہاتھوں میں رہ گئی چھتری

سخت حیراں ہوں خودبخود کیسے
اُن کو دیکھا تو کھل گئی چھتری

ہو رہی ہے کبھی کبھی بارش
کھولتا ہوں کبھی کبھی چھتری

بارشیں بند ہو گئیں شانہؔ
میں نے جس دن خرید لی چھتری

بچاؤ! بچاؤ!!

عتیق الرحمٰن

وہ حکومت کے بہانے آئے
جو بچا مال ، اُڑانے آئے

پھر بھری اپنی تجوری، لیکن
قوم کو بھیک منگانے آئے

قوم کو نیند کی گولی دے کر
خوابِ غفلت میں دھنسانے آئے

روشنی آنکھ سے چھینی ، لیکن
خواب پھر بھی وہ دکھانے آئے

حکمرانی ہے گدھوں کی اب تو
فیک ڈگری جو چلانے آئے

ہم نے ہی لات گدھوں سے کھائی
ہوش پھر بھی نہ ٹھکانے آئے

ان رگوں میں تو بچا کچھ بھی نہیں
پھر سے کیوں جونک لگانے آئے

مرد ناکام ہوئے ہیں سارے
ولولہ لے کے زنانے آئے

ناچتے عمر ہماری گزری
کوئی ہم کو نہ نچانے آئے

مل کے مانگیں یہ دعا سب ہی عتیقؔ
کوئی پھر سے نہ ستانے آئے

نوید ظفر کیانی
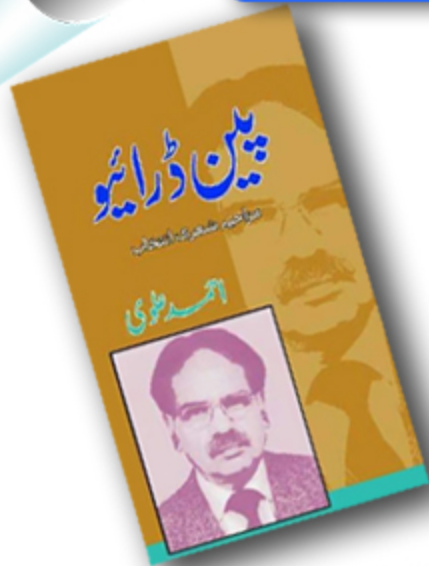
پین ڈرائیو
احمد علوی

احمد علوی پن ڈرائیو کے آئینے میں

احمد علوی کے نام پر ذہن میں از خود ایک ایسے بچے کا تصور ابھرتا ہے جس کی شریر آنکھوں میں شوخی اور الھڑ پن لشکارے مار رہا ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں بہت سی پھلجڑیاں ہیں جسے وہ زمانے کی بسیط ظلمت میں لے کر نکلا ہے۔ اُس کی پھلجڑیوں سے رنگ برنگے شرارے پھوٹ رہے ہیں۔ وہ زمانے کے ملگجے اندھیروں میں طرارے بھرتا پھر رہا ہے۔ جہاں جہاں جاتا ہے، گونا گوں قسم کی روشنیوں کے ننھے ننھے ستارے بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ قلانچیں بھرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ وہ سب لوگ اُن رنگ برنگی روشنیوں کے ستارے چُن رہے ہیں اور خوشی سے قلقاریاں مار رہے ہیں۔ ہر طرف موج میلہ ہے اور اس موج میلے کا مرکزی کردار ہے احمد علوی۔

احمد علوی نام کا شوخ و شنگ بچہ محض سرمستی اور الھڑ پن سے دوڑتا نہیں پھرتا بلکہ بسا اوقات اُس کے انداز میں شوخی اور شرارت بھی عود کر آتی ہے۔ جب کبھی بھی زمانے کے بدصورت اور تاریک چہروں والے بھوتوں پر اُس کی نظر پڑتی ہے تو وہ اپنی رنگ برنگی روشنیوں والی پھلجڑی سونت کر اُن پر جھپٹ پڑتا ہے۔ بھوت روشنیوں کی یلغار سے خوفزدہ ہو کر اُلٹے قدموں پیچھے پلٹتے ہیں اور دوڑ لگا دیتے ہیں۔ بچہ تاریکی کے بھوتوں کو بھاگتا ہوا دیکھتا ہے تو خوشی سے کھلکھلا اُٹھتا ہے۔ اُس کی مترنم کھلکھلاہٹوں کی لے پر پھلجڑیوں کے رنگ برنگی روشنیوں والے ستارے رقص کرنے لگتے ہیں اور ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ چاند بھی بادلوں کا لحاف ہٹا کر بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگتا ہے۔

> احمد علوی نے اپنی شاعری میں انتہائی بے تکلفی اور شائستگی کے ساتھ انگریزی الفاظ کو بھی قبولنے اور برتنے کا موثر طریقہ اختیار کیا ہے۔ اور انہیں ہندی اور اردو کی ہی طرح اپنائیت کیساتھ معنی اور مفہوم کے قریب کیا ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے بہت عمدگی کے ساتھ ان تمام عصری حسیّات اور رویوں کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یا آنا کانی کے استعمال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔
>
> **ساحل احمد**

آپ میری اس خیال آرائی کو محض میری fantasy سمجھ سکتے ہیں لیکن یقین کیجئے کہ میں پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ وہ ظرافت نگار جو مستقل اپنے چلبلے فن کی شمع جلائے ہوئے ہیں، مستقل اسی طلسمِ ہوشربا کا حصہ ہیں اور احمد علوی اُنہیں میں سے ایک ہے۔

احمد علوی ایک ایسا خوش فکر شاعر ہے جو اپنے اندازِ فکر کی لطافت سے ایسی انبساط آگیں کیفیت پیدا کر دیا ہے جو پڑھنے والوں کی توجہ کو مقناطیس کی مانند کھینچتی ہے۔اُن کے ہاں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان میں بھی ندرت موجود ہے۔وہ جس موضوعِ سخن کا انتخاب کرتے ہیں، اُس سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔وہ بڑی سنجیدگی اور تواتر کے ساتھ ادبِ لطیفہ کی تخلیق میں مشغول ہے۔

اس کی نظموں اور غزلوں کے موضوعات میں سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔مزاح گو شاعر اور سنجیدگی، یہ بات بعید از قیاس لگتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی متین بلکہ سنگین موضوع پر خامہ فرسائی کرنا اور اپنے اندازِ بیان سے اُسے رنگین بنا دینا بھی ایک فن ہے جو ہر کسی کا بوتا نہیں ۔

یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کے اندازِ بیان کی شعوری و غیر شعوری شرارتوں سے کاوشوں میں موجود فکاہی عنصر پڑھنے والوں پر چھاتہ بردار فوج کی طرح حملہ آور ہوتا ہے اور اُسے مطالعہ کے بعد بھی ہینڈز اپ کئے رکھتا ہے۔ذرا اس قطعہ میں دیکھئے کہ وہ کس معصومیت، سادگی اور روانی سے کیسی کیسی پھلجڑیاں چھوڑے جاتے ہیں۔

لندن کو اُڑ گئے وہ ہنی مون کے لئے
میں لڑکیوں کو شعر سنانے میں رہ گیا
وہ خوش نصیب نسل بڑھانے میں لگ گیا
میں بد نصیب بچے کھلانے میں رہ گیا

الفاظ میں سلاست اور روانی ایسی ہے کہ پڑھنے والا بہے چلا جاتا ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی سادگی اس کی ریڈر شپ کے اسکوپ کو خاصی متنوع بنا دیتی ہے، جیسے بعض کتابوں پر لکھا ہوتا ہے ''چھ سے ساٹھ سال کے بچوں کے لئے۔''

ان کے ہاں مزاح خالصاً آمد کا شاخسانہ ہے۔ان کی باغ و بہار شخصیت کی برجستگی اور شگفتگی اس کے فنی محاسن کی از خود آبیاری کرتی ہے۔تاہم یہ آمد بھی دردمندی اور آگہی کے مسلسل ریاض کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔موجودہ دور کی علاقائی سیاست اور سماجی پس منظر مزاح گو شاعر کو ہجو اور استہزا کی جانب راغب کرتا ہے لیکن احمد علوی اس باب میں بھی فکری توازن کو برقرار رکھتا ہے۔اگرچہ بسا اوقات اُن کا لہجہ خاصا تلخ اور کھردرا بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک مثبت پہلو ہے کہ وہ اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں۔ بادشاہ کی طرف ترت انگشت نمائی کر دیتا ہے کہ ''بادشاہ سلامت، آپ ننگے ہیں۔''

وہ بڑی بہادری اور جانفروشی سے معاشرے کے اُن منفی عناصر کو للکارتے ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔اِس موقع پر احمد علوی اپنے قلم کو آتش فشاں کے بہتے ہوئے لاوے میں ڈبو لیتا ہے۔

سُرخ گجرات میں کیسر کی ہے رنگت یارو
کتنی مکروہ ہے ووٹوں کی سیاست یارو
یہ ہنر سیکھئے جاکر نریندر مودی سے
کس طرح ہوتی ہے لاشوں پہ حکومت یارو
(حکومت)

چھوڑ دے چھوڑ دے بڑ بولا پن
کچھ رکھا کر زبان پر قابو

احمد علوی خاصے باخبر انسان ہیں انہیں اساتذہ کے مقرر کردہ پیمانوں کی مکمل جانکاری ہے۔تب ہی تو ان کے ہدف طمانچے کھا کے بھی مسکراتے ہیں۔ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی اونچ، نیچ اور بھونڈے پن پر نہ صرف ان کی نظر پڑتی ہے بلکہ یہ سماج کی ان دکھتی رگوں کو ملائمیت کے ساتھ چھیڑتے بھی ہیں۔

منظور عثمانی (معروف طنز و مزاح نگار)

کیا مصلّہ بچھاؤں تیرے لئے
ایک رکعت کا بھی نہیں ہے تو
(راج ٹھاکرے)

کچھ سمجھ ہے تو دھوکے میں مت آے
یہ نہ ہندو کے ہیں نے مسلماں کے ہیں
باپ کو اپنے یہ باپ کہتے نہیں
یہ وفادار بس کرسی اماں کے ہیں
(لیڈر)

یہ تو وہ احمد علوی ہے جو سماجی بھوتوں پر باآوازِ بلند ''لاحول'' پڑھتا ہے لیکن ''پن ڈرائیو'' میں ایک ایسا احمد علوی بھی دکھائی دیتا ہے جو بذلہ سنجی اور شوخ بیانی میں بھی فرد ہے۔ باتوں باتوں میں ایسی دلچسپ بات کہہ جانے والا احمد علوی کہ سننے والا پھڑک اُٹھے۔

جب پڑوسن سے لڑ گئیں آنکھیں
کالا ایک اِک بال کر بیٹھے
پڑھے لکھے تو راکٹوں کے تجربے کیا کیئے
پہونچ گئے ہیں چاند پر لڈّن میاں جگاڑ سے
سو کوششوں سے آئے تھے چندیا پہ چار بال
''دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں''
بوب کٹ زلفیں کٹا لی ہیں مرے محبوب نے
کیسے شانوں پر لکھوں زلفیں پریشاں ہو گئیں

دوسرے طنز و مزاح نگاروں کی طرح طنزیہ اندازِ بیان بھی احمد علوی کا ایک امتیازی وصف ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جس مزاح نگار میں بلٹ اِن (builtin) طنز کے ڈنک نہ ہوں، وہ یا تو بے مقصد مزاح نگار ہے یا پھر وہ اپنے شعری وجدان میں درست سمت پر سفر نہیں کر رہا ہے۔ ایک شاعر اپنے زمانے کے تمام مسائل اور دکھوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اُس کی شاعری ہر قسم کی تلخانہ شیرینی سے ناکوں ناک ہوتی ہے، تاہم ایک اچھا طنز نگار رہی ہے جو کسی معاشرے کی ناہمواری پر اس نیت سے نشتر آزمائی کرتا ہے کہ اُس کے ناسوروں کا علاج کر سکے۔

احمد علوی کا شعری اسلوب بھی طنز کے ''اندازِ احتجاج'' سے مزیّن ہے۔ پن ڈرائیو میں وہ جا بجا ناوک فگن نظر آتا ہے۔

ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیکر اردو سر ہیں کالج میں
غالب گاف سے پڑھنے والے لیکچرر ہیں کالج میں

اس کی قسمت بدل نہیں سکتی
ہاتھ میں ٹھیکرا ہی رہتا ہے
چاہے بن جائے وہ کروڑی مل
بھک منگا بھک منگا ہی رہتا ہے

وہ کانوینٹ گرل ہے کافی پڑھی لکھی
روداد حسب و نسب کی اب انسٹینٹ بھیج
رشتہ بنے گا بینک کا بیلینس دیکھ کر
تصویر نہیں بینک کا اسٹیٹمینٹ بھیج

اور اب ذرا امریکی صدر براک اوبامہ کو امن کا نوبل انعام ملنے پر اُن کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

سوچتا ہوں امن کا کیسے فرشتہ بن گیا
جس کا کلچر ہی ہمیشہ سے رہا بندوق کا
اَمن کا نوبل پرائیز مل گیا کیسے اُسے
قتل گردن پر ہے جس کی اَن گنت مخلوق کا

احمد علوی نئی نسل کے نمائندہ اور میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ مجھے شروع سے ان کے یہاں تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ ان کی نئی نئی شاعری امکانات سے بھرپور نظر آتی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان میں وہ اپنی عمر کے مزاح گو شاعروں میں بہت خوبصورت اور وسیع تر امکانات رکھنے والے شاعر ہیں۔

بشیر بدر

احمد علوی کے کلام میں دلکشی ہے۔ظرافت کے ساتھ شوخی بھی ہے۔احمد علوی کے قطعات میں ایک طرح کا نیا پن ہے۔ان کی بعض پیروڈیاں کمال کی ہیں۔انہوں نے بعض مشہور شعراء کے مصرعوں کو استعمال کیا ہے اس سے بھی ان کی غیر معمولی مزاحیہ حس کا پتہ چلتا ہے۔

مجتبیٰ حسین

پن ڈرائیو میں جس صنفِ سخن کی مقدار سب سے زیادہ ہے وہ ہیں ان کے قطعات ۔ اِس فن میں اِنھیں خصوصی تخصیص حاصل ہے۔قطعہ نگاری کا سب سے بڑا حُسن اس کی حقیقت نگاری ہے۔ شاعر کسی بھی واقعے کو بنیاد بنا کر چار مصرعوں پر مشتمل ایک خیال کو یکجا کرتا ہے۔احمد علوی کے قطعات میں شگفتگی،دلکشی اور تازگی پائی جاتی ہے۔اُن کے بعض قطعات ایسے بھی ہیں جس میں اُن کے اندازِ بیان نے آفاقیت بھر کر رکھ دی ہے۔

''پرانا شعر'' کے عنوان سے ان کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

جتنے آل انڈیے ہیں ڈائس پر
سیڑھیاں شہرتوں کی چڑھتے ہیں
اِن کا استاد ہی نہیں کوئی
شعر سارے چرا کے پڑھتے ہیں

اِن کے قطعات طنز کی کاٹ سے لبالب بھرے ہوئے ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ شگفتگی کی ایک دبیز تہہ بھی اس پر پڑی ہوئی ملتی ہے۔جس سے پڑھنے والے بہت حظ لیتے ہیں:

فرشتے بھی کلرکوں کی طرح ہوتے ہیں لا پروا
جو تخلیقِ خداوندی بھی سرکاری نکلتی ہے
یہاں پہچان ہو کیسے مونث اور مذکر کی
جسے نورا سمجھتے ہیں وہی ناری نکلتی ہے

پیروڈی لفظ پیروڈیا سے نکلا ہے،جس کے معنی ہیں جوابی نغمہ۔اس سے مراد ایسی ادبی طرزِ تخلیق ہے،جس میں کسی نظم یا نثر کی اس طرح نقل کر کے مزاح کا رنگ پیدا کیا جاتا ہے کہ پیروڈی کا لفظی و بحری اہتمام جوں کا توں رہے،تھوڑے سے الفاظ کے رد و بدل یا تبدیلی سے مضمون میں ایسی مضحکہ خیزی پیدا کرنا ہے جس سے نفسِ مضمون کی ایسی کی تیسی ہو کر رہ جائے۔احمد علوی کو پیروڈی میں ید طولیٰ حاصل ہے۔احمد علوی کی پیروڈی میں یہی خاص بات ہے کہ وہ کسی فن پارے کی پیروڈی کرتے وقت پیروڈی کے جملہ لوازمات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں جس سے اُن کی پیروڈی پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔پن ڈرائیو میں آپ کو بہت سی پیروڈیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ بھارت کا ایک مشہور فلمی گانا جب اِن کی فکرِ رسا کے ہتھے چڑھا تو اس کا کیا حشر ہوا،ملاحظہ فرمائیے:

تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
اچھی طرح سکا ہوا شامی کباب ہو

آنکھیں ہیں جیسے چہرے پہ قبریں کھدی ہوئی
زلفیں ہیں جیسے راہوں میں جھاڑی اگی ہوئی
جانِ بہار تم تو کباڑی کا خواب ہو
تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

ایسا نہیں کہ مرتے ہیں بس تم پہ نوجواں
آہیں تمہارے عشق میں بھرتے بڑے میاں
بدبو ہے جس میں شوز کی تم وہ جراب ہو
تم چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

ایک اور فلمی گانے کی پیروڈی ملاحظہ ہو:

آپ کی نظروں نے سمجھا ووٹ کے قابل مجھے
ڈاکوؤں اور رہزنوں میں کر دیا شامل مجھے

کساد بازاری کے اس دور میں احمد علوی کی مزاحیہ شاعری اپنی انفرادیت قائم کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوئی ہے۔یہ سچی اور کھری بات کہنے کے عادی ہیں۔

کمال جعفری (پیکس آل انڈیا ریڈیو دہلی)

جن شاعروں نے اپنی پر مزاح شاعری سے دل شاد بھی کیا اور اس کا نقش کتابی شکل میں لوگوں کے دلوں پر چھوڑا بھی اس نوع کے ظریف البیان شاعروں میں احمد علوی کا نام سرِ فہرست ہے۔

ڈاکٹر توقیر احمد خاں (صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی)

ماشاء اللہ آج تو تعلیم کا میں ہوں وزیر
کم سے کم اب تو نہ کہیئے اَن پڑھ و جاہل مجھے
توڑ دی ہیں میری ٹانگیں اس کے ابّا جان نے
اب بھی محبوبہ سمجھتی ہے مری کامل مجھے
دل بدلنے کے لیئے مجھ کو ملے ہیں دو کروڑ
دل کی اے دھڑکن ٹھہر جا مل گئی منزل مجھے
کل میں ڈرتا تھا پلس سے اب ڈرے مجھ سے پلس
زندگی کی ساری خوشیاں ہو گئیں حاصل مجھے
پھر تو کر سکتا ہوں میں بھی چار سے چھے شادیاں
ساتھ میں بیوی کے مل جائیں اگر دو مِل مجھے

اِسی طرح ساحرلدھیانوی کی ایک معروف نظم کی پیروڈی بھی خاصے کی چیز ہے۔ اِس پیروڈی میں اُن کا جارحانہ رنگ، بقول ایک پنجابی محاورے کے "بلیاں دے دے کر" جھلکیاں مار رہا ہے۔

یہ کھٹمل یہ مکھی یہ مچھر کی دنیا
یہ لنگور بھالو یہ بندر کی دنیا
یہ کتوں گدھوں اور خچر کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ عورت یہ مردوں یہ چھکوں کی دنیا
نہتوں کی ہتھیار بندوں کی دنیا
یہ ڈاکو پولس اور غنڈوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ چوروں یہ لچوں لفنگوں کی دنیا
یہ کمزوروں کی اور دبنگوں کی دنیا
تپ دق کے بیمار چنگوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ بش جونیئر اور اوباموں کی دنیا
یہ امریکیوں کے غلاموں کی دنیا
یہ ملّا عمر اور اساموں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

جنابوں کی عزت مآبوں کی دنیا
یہ اچھوں کی دنیا خرابوں کی دنیا
یہ چمچوں کو ملتے خطابوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ بندوق کٹوں طمنچوں کی دنیا
یہ فٹ بال کی اور کنچوں کی دنیا
خوشامد میں مشغول چمچوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

ہوائی جہازوں کی ریلوں کی دنیا
حوالات کی اور جیلوں کی دنیا
یہ ٹرکوں کی دنیا یہ ٹھیلوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

رئیسوں کی دنیا یہ کڑکوں کی دنیا
یہ بے کار آوارہ لڑکوں کی دنیا
ٹریفک سے بدحال سڑکوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ خوشی کی بات ہے کہ مزاح گو شاعروں میں بہت ہی اہم نام احمد علوی کا بھی ہے۔ ان کی شاعری 'طمانچوں' نہیں دبی دبی آنچوں کی شاعری ہے ہنسی ہنسی میں احمد علوی بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔

یوسف ناظم

لطیفہ ایک چھوٹی سی حکایت کا نام ہے جس کے اثرات بہت مثبت ہوتے ہیں۔ بقول خواجہ عبدالغفور:

''لطیفے کا یہ اعجاز ہے کہ روتوں کو ہنسادے، مردہ دلوں کو زندہ دلی عطا کرے، قنوطیت اور یاسیت کو نابود کردے، اعصابی تناؤ اور اضمحلال کو دور کردے، یہ ایک شگوفہ ہوتا ہے لیکن عام فہم اور زود فہم۔ ذرا سے میں موڈ بدل دے مزاج کو شگفتگی بخش دے۔''

لطیفوں پر منظوم چھاپے مارنے کا بھی احمد علوی کا اپنا ہی انداز ہے۔ نہایت نپے تلے انداز میں لطیفوں کو یوں دبوچ لیتے ہیں کہ دیکھا کیجئے۔ ذرا دیگ کی مخبری کے لئے چاول کا یہ دانہ تو ملاحظہ کیجئے:

یہ کہا میں نے پڑوسی سے مدد کر دیجئے
چند مہماں آگئے ہیں چارپائی چاہئے
چارپائی کے لئے قبلہ نے کر لی معذرت
اپنے گھر کی محترم نے یوں بیاں کی کیفیت
صرف دو ہی چار پائی ہیں مرے گھر میں جناب
رات بھر جن پر رہا کرتے ہیں چاروں محوِخواب
ایک پر سوتا ہوں میں اور میرے ابا محترم
دوسری پر میری بیوی اور مری امی بہم
سن کے ان کی بات کو میں رہ گیا حیرت زدہ
بیش قیمت زندگی کیوں کر رہے ہو بے مزا
اس طرح ضائع جوانی کا نہ تم حصہ کرو
چارپائی دو نہ دو پر ڈھنگ سے سویا کرو

آخر میں احمد علوی کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو جس میں قریب قریب ہر مزاح نگار کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔

مذاق خود کا ہی خود کو اڑانا ہوتا ہے
اُداس چہروں کو مشکل ہنسانا ہوتا ہے
ہے پل صراط سے باریک راہِ طنز و مزاح
دیا ہواؤں کے رُخ پر جلانا ہوتا ہے

پن ڈرائیو

احمد علوی کی پن ڈرائیو میں
موجزن ہے ہنسی خوشی کا جام

ان کے طنز و مزاح سے ہے عیاں
کتنا ظالم ہے عہدِ نو کا نظام

جن کا مخفی ہے ظاہر و باطن
کرتے ہیں ان کا راز طشت ازبام

جن کے چہروں پہ ہے کبیدہ عتقا
گدگداتا ہے ان کو ان کا کلام

شہر دہلی میں ہیں وہ رونقِ بزم
بھیجتے ہیں مجھے سلام و پیام

پن ڈرائیو پہ ان کے یہ گوشہ
ان کے حق میں ہے اک حسیں انعام

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

روبینہ شاہین بینا

پن ڈرائیو میں اَحمد علوی کا طنزیہ انداز

طنز ومزاح ایک دودھاری دشنہ کی مانند ہے، اصنافِ ابلاغ میں طنز ومزاح کا استعمال عموماً ایک ساتھ ہوتا ہے، یعنی دو سگے بھائیوں کی طرح لیکن تیکنیکی طور پر اِن میں خاصا فرق ہے۔ ظرافت خالصاً مزاح ہے اور مزاح لکھنے والا کسی پر چوٹ نہیں کرتا بلکہ وہ پڑھنے یا سننے والے کو زندگی کی تلخیوں اور اداسیوں سے دور لے جاتا ہے اور آناً فاناً اُسے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جو زندگی کے عمرانی، سماجی، معاشی یا سیاسی دکھڑوں سے ماورا ہوتی ہے۔ یہ لمحاتی فرار انسانی زندگی کے لئے ازحد ضروری ہے کیونکہ زندگی کا مسلسل غم یا اداسی پتھر پر گرتی ہوتی پانی کی اُن قطروں کے مترادف ہیں جو پتھر کا سینہ چیر کر رکھ دیتے ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ کسی باشعور انسان کے لئے اُس کی حیاتی صحت کو برقرار رکھنے اور اُس کی توانائی اور تازگی کی بحالی کی خاطر مزاح کی متواتر خوراک انتہائی دضروری ہے۔

مزاح یا ظرافت کا سگا بھائی ''طنز'' ہے۔ طنز کسی بے ہدف تیر کی طرح نہیں ہوتا۔ اس کا نشانہ معاشرے کے وہ غیر ہموار رویے رکھنے والے افراد ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر معاشرے کے اہم رکن ہوتے ہیں اور اس قدر طاقت کے حامل ہوتے ہیں کہ معاشرے کے عام وخواص اُن پر انگشت نمائی کی جرأت نہیں رکھتے۔ ایسے میں طنز اُن کی مدد کو آگے بڑھتا ہے۔ طنز تیز چبھتے ہوئے پوشیدہ معنی رکھتا ہے لیکن کثیف اور ثقیل نہیں ہوتا۔ یہ معاشرے کے کسی عنصر پر تنقیدی نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے لیکن اس کے اثرات خاصے گہرے ہوتے ہیں، تنقید سے قدرے بے اعتدالی کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں ''ہجو'' جیسا زہر بھرا ہوا نہیں ہوتا، عموماً مثبت اندازِ فکر کے ساتھ ناقدانہ اسلوبِ بیان میں لعن وطعن اور سرزنش کی چبھن لئے ہوئے۔

خواجہ عبدالغفار اپنی کتاب ''طنز ومزاح کا تنقیدی جائزہ'' میں طنز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''طنز تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دشنامِ یار ہے، تبصرہ ہے، تازیانہ ہے۔ اس کا مقصد اصلاح ہے، پگڑی اچھالنا ہے، احساسِ برتری کا مظاہرہ کرنا ہے، بیہودہ اشخاص اور اشیاء کا مضحکہ اُڑانا ہے۔''

عصرِ حاضر میں ہمارے اردگرد بہت سی ایسی قوتیں مجتمع ہوگئی ہیں جنھوں نے مقدور بھر ہمیں طلسمِ سامری کے حصار میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ قوتیں ایک طرف تو اُن سماجی عناصر پر مشتمل ہیں، جنھوں نے جائز یا ناجائز طریقے سے اثر ورسوخ اور دولت کا انبار اکٹھا کر

رکھا ہے اور اب وہ معاشرے کے دوسرے افراد کو کسی کمزور کیڑے مکوڑے سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ وہ رہتے تو دوسرے افراد کے درمیان ہیں لیکن اُنھیں اپنے جیسا نہیں سمجھتے۔ بیجا احساسِ برتری سے مغلوب ہو کر وہ دوسروں پر ہر آئے دِن اپنی دولت اور اثر و رسوخ کی دھاک جماتے پھرتے ہیں۔

اِسی طرح دوسری طرف کسی بھی قوم کے سیاست کے ناہموار پہلوؤں نے بھی طنز نگاروں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔ دورِ جدید کی سیاست میں لیڈروں کی سیاسی قلابازیاں اور لوٹا برداریاں ایک عمومی رویہ بن کر رہ گیا ہے۔ سیاسی وفاداریاں کی خرید و فروخت اور ہرے چراہگاہوں کی طرف گھوڑوں کا کوچ کر جانا معاشرے کے عام افراد کے لئے خاصے اچنبھے کی بات ہے۔ اسی ناقابلِ قبول سیاسی حالات نے ایسی سچوئشن پیدا کر دی ہے کہ سیاسی طاقت کا پلڑا اُن عناصر کی طرف جھک جاتا ہے جو جمہوری تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کی صلاحیت سے یکسر پیدل ہیں۔ افلاطون نے غالباً اسی موقع کے لئے کہا تھا:

Those who are too smart to engage in politics, are punished by being governed by those who are being dumer.

ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ اِس ناہموار اور ناقابلِ قبول حالات کے خلاف مقدور بھر مزاحمت کی ہے۔ اُردو کا مزاحمتی ادب اِس کا بیّن ثبوت ہے۔ اس میں فیض احمد فیضؔ، حبیب جالبؔ، ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ اِسی طرح کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے اسلوبِ سخن کو طنز و مزاح کے شیریں زہر میں بجھا رکھا ہے اور مسلسل قلم سونتے مصروفِ جہاد ہیں۔ ماضی قریب و بعید میں اس سلسلے میں اکبرؔ الہ آبادی، دلاور فگارؔ، مسٹر دہلوی، سید ضمیر جعفری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں جبکہ موجودہ دور میں بھی بہت سے شاعر ہیں جو اس راستے کے مسافر ہیں، اُن میں بھارت کے شاعر جناب احمد علوی کا نام سرِ فہرست ہے۔

احمد علوی کے طنز کا دائرۂ عمل خاصا وسیع ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے کسی پہلو سے اغماض نہیں برتا، ہر اُس موضوع کو گدگدایا ہے جس کا تعلق عوام سے ہے۔ سماجی اور عمرانی ناہمواریوں پر اُس کا طرزِ بیان خاصا لطیف اور ہمدردانہ ہے۔ وہ ایک دائرے کے اندر رہ کر انتہائی شگفتہ بیانی اور بذلہ سنجی کے ساتھ خندہ آور وار کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کی ''مایوسی'' کا ایک انداز ملاحظہ فرمائیے:

لندن کو اُڑ گئے وہ ہنی مون کے لئے
میں لڑکیوں کو شعر سنانے میں رہ گیا
وہ خوش نصیب نسل بڑھانے میں لگ گیا
میں بد نصیب بچے کھلانے میں رہ گیا

احمد علوی کو استہزاء کے خردمندانہ وار کرنا خوب آتے ہیں۔ وہ اس اُچھوتے انداز سے وقوعے کا بیان کرتے ہیں کہ بیساختہ ہونٹوں پر تبسم بکھر بکھر جاتا ہے۔ ایک خانگی معرکے کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

غصے میں بیوی یہ بولی شوہر سے
تم نے تو بس ظلم ہی مجھ پر ڈھائے ہیں
میں ہی تم کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتی
سب سے تم نے پیار کے پیچ لڑائے ہیں
بولا شوہر بات اگر یہ سچی ہے
پھر یہ بچے کس کے گھر سے آئے ہیں
بنٹی' ببلی' سونو' مونو' کیا تم نے
انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کرائے ہیں
تیرا میرا جن سے مہکا ہے آنگن
پھول یہ کس کی کوشش نے مہکائے ہیں
انٹرنیٹ کا سرور کب سے ڈاؤن ہے
سارے بچے پین ڈرائیو سے آئے ہیں

احمد علوی کو مذاق کرنا اور مذاق اُڑانا خوب آتا ہے۔ عموماً سیاسی معاملات کے بیان میں اُن کے انداز میں خندۂ استہزاء کا تاثر اُبھرتا ہے جو بظاہر کچھ عجیب بات نہیں کیونکہ بات بارڈر کے اِس طرف کی کی جائے یا اُس طرف کی، لیڈرانِ قومی کے بارے

میں رائے عامہ میں بال برابر فرق نہیں۔اُن کے لہجے کی تلخی میں بھی ایسی گدگداتی ہوئی لہر برآمد ہوتی ہے کہ سننے والا ٹھٹھا مار کر ہنس دیتا ہے۔اُن کا قطعہ ''شیطان کا پھوپھا'' ملاحظہ فرمائیے:

جیب میں کرتے کی وعدوں کا پٹارا نکلا
ذہنِ لیڈر میں فقط جھوٹ کا ملبہ نکلا
مانگنے ووٹ جو آیا تھا فرشتہ بن کے
یہ فرشتہ بھی تو شیطان کا پھوپا نکلا

یا پھر لیڈروں کا روڈ شو پڑھیے اور سر دھنیے (صرف اپنا):

ذرا دیکھو تو ان کی سادہ لوحی
ہماری موت پر مرنے لگے ہیں
الیکشن کا ہوا اعلان جب سے
فرشتے روڈ شو کرنے لگے ہیں

ذرا اُن کی اس طنز و مزاح کی دیگ میں سے چاول کا یہ والا دانہ چکھیے:

ہونے لگا ہے اونچا اب قد یہاں ہمارا
اخبار میں چھپا ہے جھوٹا بیاں ہمارا
اب قومی لیڈروں میں اپنا شمار ہوگا
سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

احمد علوی ایک مزاح گو شاعر ہے لیکن اُن کا مزاح، مزاح برائے مزاح نہیں بلکہ ایک واضح مقصد لئے ہوئے ہے۔وہ جن باتوں کو غلط سمجھتے ہیں، اُنہیں غلط ہی کہتے ہیں، اس ضمن میں کسی قسم کے سمجھوتے کے قائل نہیں۔

احمد علوی کا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ان کا سابقہ ایک ایسی اکثریت سے ہے جس کے بارے میں تاثر ہے کہ وہ اقلیتوں سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً بغض رکھتے ہیں۔ماضی میں کانگریس کی حکومت رہی ہے جو لبرل ازم کی پرچارک تھی چنانچہ مسلمانوں کے مسائل کا کچھ نہ کچھ دال دلیا ہوہی رہتا تھا تاہم بدقسمتی سے اِس وقت بھارت میں ایک ایسی جماعت کی حکومت ہے جو اسلام دشمنی کے لئے مشہور ہے اور جو مسلمانوں سے نفرت کے نعرے پر ووٹ لے کر حکومت میں آئی ہے چنانچہ اُس نے ملک میں ایسا ماحول بنا دیا ہے کہ جہاں کسی فنکار کا مسلمانوں کے ایشو پر بات کرنا خاصا مشکل کام ہے۔احمد علوی کمال جرأت مندی سے اس دشواری سے بھی عہدہ براہوتے نظر آتے ہیں۔مثلاً ڈاڑھی کو طالبانی علامت کہنے پر وہ رقمطراز ہیں:

مبارک ہو نیائے مورتی کو
تمہارے نیائے کا کوئی ہے ثانی
ہے داڑھی گر علامت طالباں کی
تو کیا پی ایم بھی ہے طالبانی؟

مسئلۂ کشمیر پر بات کرنا تو کجا، اس کا استعاراً ذکر کرنا بھی بھارت میں آپ کی حُب الوطنی پر سوالیہ نشان لگانے کے لئے کافی ہے۔خصوصاً اس کی متنازعہ حیثیت کی وجہ سے وہاں کے لوگوں پر بھارتی تشدد کا بیان کسی کو بھی غدار ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔بھارت میں بہت سے ایسے شعراء گزرے ہیں جو اپنی انسانیت پسندی شاعری کی وجہ سے معروف ہیں، ان میں ساحر لدھیانوی قابلِ ذکر ہیں۔ساحر نے'' ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق'' کے بارے میں تو استفسار کیا ہے لیکن وہ'' ثنا خوانِ تقدیسِ بھارت'' سے کشمیر کے بارے میں ایک سوال بھی نہ پوچھ سکے۔یہاں پہنچ کر اُن کے پر بھی جل اُٹھے۔احمد علوی کے ہاں یہ موضوع موجود ہے۔وہ کمال جرأت سے اپنی ایک نظم میں بھی سوال کرتا نظر آتا ہے۔

نہائی لہو میں یہ تصویر کیوں ہے
سلگتا یہ آسام و کشمیر کیوں ہے
جدا ہند سے ان کی تقدیر کیوں ہے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

اور پھر

ملا کوئی لیڈر نہ معقول اب تک
سدھاری نہ ہم نے کوئی بھول اب تک
سلگتے ہیں کشمیر کے پھول اب تک
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں

اسی طرح اسی حوالے سے اپنی صحافت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سُرخ نکسل وادیوں کی ذہنیت تو زرد ہے
ان کی دہشت گردیوں پہ سب کا لہجہ سرد ہے
ہم نوا کشمیریوں کا کوئی کیا ہمدرد ہے
پتھروں سے لڑنے والی قوم دہشت گرد ہے
نکسلی اپنے ہیں دشمن وادیٔ کشمیر ہے
ملک میں قومی صحافت کی یہی تصویر ہے

بش کو جوتا پڑا تو بہت سوں نے اس کا ٹھٹھا اُڑایا اور امریکہ کی انسانیت دشمنی پر انگشت نمائی کی۔ احمد علوی بھی اس جہاد میں شامل نظر آتے ہیں۔

وہ ہے دنیا کا نامور غنڈہ
اس پہ تنقید کس کے بوتے کی
اس کو کیسے کہوں سپر پاور
جس کی اوقات ایک جوتے کی

''پن ڈرائیو'' میں جس نظم نے مجھے بہت زیادہ آزردہ خاطر کیا وہ اُن کی نظم ''ٹھاکرے اور جناح'' ہے۔ اس نظم میں مجھے احمد علوی ایک ایسا احمد علوی نظر آتا ہے، جس کا وجدان اور آگہی اُنہیں عناصر کی پروردہ لگی ہے جس کے وہ نقاد ہیں۔ پہلے ذرا اس نظم کے ابتدائی دو بند ملاحظہ کیجئے:

اُس نے مسلم کو کیا تھا گمراہ
تو مراٹھوں کو کر رہا ہے تباہ
تیرا اور اُس کا ایک جیسا گناہ
پھر بھی غدّار نہیں تو واواہ

وہ تھا تقسیمِ وطن کا مجرم
تیرا اپرادھ بھی نہیں ہے کم
جس طرح تھا جناح مسلم کا
تو مراٹھوں کا قائدِ اعظم

بھلا محمد علی جناح اور بال ٹھاکرے کا کیا مقابلہ۔ ''بدھومیاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں؟'' ایک انتہائی متعصب اور تنگ نظر ہندو لیڈر جس کا کام کچھ اور نہیں، مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکانا ہے۔ جس کے ہاتھ لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ جو ایک موالی سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں۔ دوسری طرف قائدِ اعظم محمد علی جناح کی صورت مسلمانانِ برِصغیر کو ایک نجات دھندہ مل گیا تھا۔ قائدِ اعظم نے بھارت کے نام نہاد اکثریتی کمیونٹی سے دوستی کے لئے اتمام حجت کے طور پر ہر حد تک گئے۔ اُنہوں نے تو سیاست کا آغاز ہی کانگریس سے کیا اور خلوصِ دل سے چاہا کہ برِصغیر میں موجود تمام اقوام مل جل کر سیاسی طور پر مشترکہ طور پر آزادی کی جدوجہد کریں لیکن ہندو نیتاؤں کے اسی انداز کے انتہا پسندانہ رویوں نے اُن کے جدوجہد کا رُخ تبدیل کر دیا جن پر احمد علوی انگشت نمائی کرتے پھرتے ہیں۔ اگر بال ٹھاکرے سے کسی کا تقابلی جائزہ بنتا ہے تو وہ ہمارے ایک موجود لیڈر ''الطاف حسین'' ہو سکتے ہیں جن کی سیاست عین اُنہیں خطوط پر استوار ہے جن پر بال ٹھاکرے کی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ الطاف حسین کو ایک صوبے کے متعصب اور تنگ نظر اکثریت کی حمایت حاصل ہے، جو لگ بھگ اپنی منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے جبکہ بال ٹھاکرے کے انڈے بچے بھارت میں خوب پنپ رہے ہیں اور اپنے مضر اثرات سے دنیائے امن کو تہ و بالا کرنے میں مگن ہیں۔

خیر، اِس بحث کا یہاں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اِس موضوع کی تفہیم اس قدر اختصار کی متحمل نہیں ہوسکتی، تاہم۔۔۔

زخم الفاظ کے نہیں بھرتے
زخم تلوار کے بھر جاتے ہیں
کام ہوتا نہیں جو تیروں سے
تیرے دو لفظ ہی کر جاتے ہیں

احمد علوی

پنِ ڈرائیو سے انتخاب

بدن پہ سوٹ اُردو کا گلے میں ٹائی اُردو کی
انہیں معلوم ہے گہرائی اور گیرائی اُردو کی
بجاتے ہیں ہر اک محفل میں یہ شہنائی اُردو کی
کہ ساری عمر کھائی ہے فقط بالائی اُردو کی
پروفیسر یہ اُردو کے جو اردو سے کماتے ہیں
اسی پیسے سے بچوں کو یہ انگریزی پڑھاتے ہیں

(اُردو کے پروفیسر)

اُردو ادب کا یہ بھی المیہ ہے دوستو
منزل ہے سب کی ایک ہی اور ایک راہ ہے
غالب پہ ہے تمام ہر اک نقدِ شاعری
غالب سے آگے سوچنا تک بھی گناہ ہے

(اُردو کا نقاد)

سکوں گھر میں نہیں جن کو میسّر
زبانی ہاتھا پائی کر رہے ہیں
ستائے ہیں جو اپنی بیویوں کے
وہ شعراء کی کھنچائی کر رہے ہیں

(کھنچائی)

مشاعرے جو کراتے ہیں چندہ کر کر کے
انہیں کو صرف میں فرشی سلام کرتا ہوں
یہ لوگ مجھ کو سمجھتے ہیں شاعرِ اعظم
میں جاہلوں کا بہت احترام کرتا ہوں

(فرشی سلام)

وہ جو آنکھوں کو لال کر بیٹھے
ہم بھی شادی کی ٹال کر بیٹھے

بن گئی فوج بچوں کی گھر میں
دونوں مل کر کمال کر بیٹھے
ایک مچھلی بھی پھانسی نہ ہم نے
کانٹا دریا میں ڈال کر بیٹھے
اک عربی حسینہ پہ مر کے
خرچ سارے ریال کر بیٹھے
جب پروسن سے لڑ گئیں آنکھیں
کالا اک اک بال کر بیٹھے
جس نے تھانے میں پیٹا تھا ہم کو
پھر اسی کا خیال کر بیٹھے

(ہزل)

جن میں اکثر مری بکواس چھپا کرتی ہے
وہ رسالوں کے یہ انبار نہیں پڑھ سکتی
اس لئے آج بھی محفوظ ہے شادی اپنی
میری بیوی مرے اشعار نہیں پڑھ سکتی

(شادی)

حسینوں پر نہیں ڈالی کبھی گندی نظر ہم نے
انہیں جنّت سے ہم نکلی ہوئی پریاں سمجھتے ہیں
ہمیشہ ان کو دیکھا ہم نے پاکیزہ نگاہوں سے
کہ ہر خاتون کو ہم بچوں کی اماں سمجھتے ہیں

(اقبالیہ بیان)

باپ کے بعد بن گیا دادا
میری آنکھوں پہ چڑھ گیا چشمہ
میرے ہاتھوں میں آگیا رعشہ

اڑ گئے بال ہو گیا گنجا

زندگی سے یہی گلا ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے
(نذیر احمد فراز)

جو نکلے برش پکاسو سے ایک بار گدھے
بنے فنون لطیفہ کے شاہکار گدھے
گدھوں کی پینٹنگ تو واقعی میں جادو تھی
گدھوں کی قوم جو منت کش پکاسو تھی
تمام جانور اعزاز سے رہے محروم
مگر گدھوں سے سجے ہیں سبھی کے ڈرائنگ روم
بڑھی ہوئی جو گدھوں کی بہت پرائیز ہے
گدھا تمام امیروں میں رنگنائیز ہے
کسی نے شیر کو اعزاز یہ نہیں بخشا
مرے خیال میں خچر گدھے سے بہتر تھا
مصوری کے لیئے کیوں چنے پکا سو نے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گدھے پکاسو نے
گدھوں سے اس کو یقیناً تھی کچھ نہ کچھ نسبت
سمجھ میں آئی پکاسو کو گدھوں کی عظمت
حویلیوں میں امیروں کی گدھے پہونچائے
بنے امیری کی پہچان گدھوں کے سائے
رئیس گھر میں لگائیں گدھوں کی تصویریں
کہ چمکیں برش سے کیسے گدھوں کی تقدیریں
گدھے جو بوجھ اٹھائیں یتیم ہوتے ہیں
جو پوٹریٹ میں چھائیں عظیم ہوتے ہیں
گدھے کہ سمجھا جنہیں سب نے قابل نفرت
انہیں گدھوں کو پکاسو نے بخش دی شہرت
گدھے کا آرٹ بنایا بڑا کمال کیا
کہ پینٹر نے گدھے پن کو لازوال کیا
گدھے جو بیچنے نکلو ٹکوں میں بکتے ہیں
گدھوں کے پوٹریٹ پر ڈالروں میں بکتے ہیں
بنے ہیں برش کی جنبش سے آنجناب گدھے
یہ بے مثال گدھے اور یہ لاجواب گدھے
پرکھ نہ اصل کی ہوگی کبھی زمانے میں
کہ نقل اصل سے ہے قیمتی زمانے میں
نہ ہوتے طنزیہ شاعر اگر گدھے ہوتے
کسی امیر کے بنگلے میں ہم سجے ہوتے
(پکاسو کے گدھے)

کیا مِلیں کپڑوں کی نذر باد و باراں ہوگئیں
دخترانِ قوم جو سڑکوں پہ عریاں ہوگئیں
رات اور دن ہو رہی ہیں قافیہ پیمائیاں
آج کی غزلیں بنا سوئی کی گھڑیاں ہوگئیں
رو رہے آپ اک پرچون کی دوکان کو
مملکت کتنی جہاں میں نذر خوباں ہوگئیں
جب سے اپنے شہر میں آئیں بلو لائین بسیں
مشکلیں کچھ مرنے والوں کی بھی آساں ہوگئیں
بوب کٹ زلفیں کٹا لی ہیں مرے محبوب نے
کیسے شانوں پر لکھوں زلفیں پریشاں ہوگئیں
(ہزل)

قورمہ توسٹ بٹر یاد آیا
پھر مجھے لقمۂ تر یاد آیا
لوز موشن ہوئے جب بھی مجھ کو
پر تکلف وہ ڈنر یاد آیا
جب ہوا ساس بہو کا جھگڑا
ففٹی سیون کا غدر یاد آیا
بن گیا اس کی گلی کا کتاّ
پھر اسے گھاٹ نہ گھر یاد آیا
جس گھڑی صاف ہوئی جیب مری
دستِ بیگم کا ہنر یاد آیا
(ہزل)

سوتے ہوئے کلوا کو جب آتے ہیں خراٹے
موسیقی نئی فلم کی بن جاتے ہیں خراٹے
معلوم یہ ہوتا ہے بھونچال کوئی آیا
جس وقت فضاؤں میں لہراتے ہیں خراٹے
یہ شکل بھی ہے یارو اک فنِ لطیفہ کی
ٹھمری تو کبھی دادرا سنواتے ہیں خراٹے
خوابوں میں حسینائیں بھی آنے سے ڈرتی ہیں
جب نیند میں یارو بس رہ جاتے ہیں خراٹے
آواز کہ ہو جیسے سو کے وی کا جنریٹر
یوں کان پہ نقارے بجواتے ہیں خراٹے
کانپ اٹھتا ہے کہتے ہیں کہ عرشِ معلی بھی
خراٹوں سے جس شب میں ٹکراتے ہیں خراٹے
(خراٹے)

لاٹری میں ایک دن اپنا بھی نمبر آگیا
نیلے نوٹوں کا نشہ ہم پر آخر چھا گیا
سوچا کر کے دیکھیں ہم بھی کچھ امیری چونچلے
جا کے بازاروں میں لوٹیں خرچ کرنے کے مزے
باپ کے ہوتے ہوئے بچے ہمارے تھے یتیم
آج کھلوا دیں انہیں بادام کی آئس کریم
بیس سالوں سے میں بیگم کر رہا ہوں تم کو مس
آؤ دلوا دوں تمہیں سونے کا بھاری نیکلس
اب گھما لاؤں تمہیں شملہ مسوری نینی تال
گھر سے ہم نکلے نہیں شادی کو گذرے بیس سال
آؤ مستی میں گذاریں ہم بھی کچھ دن گھوم کر
ہم نے بیگم سے کہا بیگم چلو ہنی مون پر
بولی بیگم تھک چکی ہوں مان لو میری یہ بات
آج تو ہنی مون پر لے جاؤ اماں جی کو ساتھ
(ہنی مون)

مرغی مرغی کی شادیاں ہوں گی
مرغ مرغے کی چونچ چومے گا
فیصلہ عدلیہ کا آیا ہے
بیل کے ساتھ بیل گھومے گا
سرد اور گرم سے یہ بنتی ہے
فلسفہ ہے یہی انرجی کا
دخل انساں کا نہیں قدرت میں
یہ نہیں کام اپنی مرضی کا
صرف آدم سے کام چل جاتا
پیدا کرتا نہ خدا حوا کو
غیر فطری عمل ہے ہم جنسی
ہے پتہ منصفی کے ابا کو
عدلیہ کو نہیں ہے کیا معلوم
پیڑ پودوں میں بھی ہیں مادہ و نر
نیگیٹو پوزیٹو کے ملنے سے
شاخ در شاخ ہیں ثمر آور
آج سائنس کا یہ کہنا ہے
یہ جو ہیں مان سون کے بادل
ان میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں
جن کے ملنے سے ہے زمیں جل تھل
یہ چرندوں میں بھی نہیں ملتی
یہ پرندوں میں بھی نہیں ملتی
اشرف المخلوقات کی عادت
گندے کیڑوں میں بھی نہیں ملتی
تار جب سرد گرم ملتے ہیں
تب کہیں گھر کے بلب جلتے ہیں
یہ ہی لاجک ہے سب مشینوں کا
ایسے ہی کارخانے چلتے ہیں
ضد نہ جس شے کی ہو زمانے میں
ایسی شے بے وجود ہوتی ہے
زندگی میں مخالفت کے طفیل
زندگی کی نمود ہوتی ہے

دے جو بے ہودگی کو سرٹیفکٹ
کام یہ تو نہیں عدالت کا
اس کو ٹھہرائے صحیح قانوناً
طوق ڈالے گلے میں لعنت کا
گندگی مغربی تمدّن کی
ارضِ مشرق میں لا رہے ہو کیوں
ان کے کردار کا یہ گندہ پن
اپنی عادت بنا رہے ہو کیوں
(ہم جنسیت)

قیمے کی، قورمے کی، یا شامی کباب کی
اب کیا مثال دوں میں تمہارے شباب کی
دو شوہروں سے آئی ہے لے کر طلاق وہ
ہم نے بھی خوامخواہ ہی نیت خراب کی
پیسے بہت ہیں آپ پر مرکے تو دیکھیے
اٹھے گی دھوم دھام سے میت جناب کی
پاگل ہمارے عشق میں کیٹرینا کیف ہے
خوابوں میں اچھی لگتی ہیں باتیں یہ خواب کی
بیوی بھی ان کو کہنے لگی اب تو بھائی جان
تبدیل کردی عشق نے صورت جناب کی
(پیروڈی)

اس سے شادی کے لیئے ہر مہ جبیں تیار تھی
چار شادی کر چکا تھا پانچویں تیار تھی
اس کا سہرا، شیروانی بالیقیں تیار تھی
کیا خبر تھی قبر بھی اس کی وہیں تیار تھی

اس اچانک موت نے ارمان چوپٹ کر دیئے
پانچویں شادی کے سب سامان چوپٹ کر دیئے
(اچانک موت)

راہ چلتے اتفاقاً مل گیا تھا ایک دن
قید بوتل میں دھوئیں کی شکل میں تھا ایک جن

دیکھ کر جن نے مجھے بوتل کے اندر سے کہا
اے شریف النفس انساں درد میرا سن کے جا

ایک جادوگر نے پکڑا تھا مجھے بنگال سے
قید ہوں بوتل کے اندر میں ہزاروں سال سے

دن مہینے سال صبح و شام آؤنگا بہت
مجھ کو کر آزاد تیرے کام آؤنگا بہت

اک دھوئیں کی شکل میں ظاہر ہوا پر تول کر
کر دیا آزاد جن کو میں نے بوتل کھول کر

اہل دانش کا ہے کہنا آسماں ہو یا زمیں
زندگی میں دوست آزادی سے بڑھ کر کچھ نہیں

تو نے آزادی کی وہ نعمت چکھائی ہے مجھے
قید سے برسوں کی آزادی دلائی ہے مجھے

اب سے تو آقا ہے میرا اور میں تیرا غلام
آج سے آساں سمجھ مشکل سے مشکل اپنا کام

رنگ برنگی تتلیوں میں خوشبوؤں کا ذکر ہوں
محترم جن میں غزل کا شاعر خوش فکر ہوں

چھ کتابیں لکھ چکا ہوں ساتویں تیار ہے
شاعر اعظم ہوں میری ہر غزل شہکار ہے

جان کر میرا تعارف جن بہت گھبرا گیا
التجا سن کر مری سکتہ سا جن کو آگیا

حکم تیرا میں کسی صورت بجا سکتا نہیں
تو غزل کہتا ہے میں مصرعہ پچا سکتا نہیں

نیم سے بھی تلخ ہے آقا رہائی کی یہ قند
میرے محسن تو مجھے کردے ابھی بوتل میں بند
(بوتل کا جن)

کے ایم خالد

مشتاق احمد یوسفی

ماخذ وکی پیڈیا، ایکپریس نیوز ویب سائٹ، پاکستان کنکشن ویب سائٹ، مشتاق احمد یوسفی شہ پارے، بازگشت بلاگ پوسٹ، دنیا نیوز ویب سائٹ، ڈان نیوز ویب سائٹ۔

حوالہ حلقۂ ارباب مزاح 001

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، مشتاق احمد یوسفی کو ''ادبی کٹہرے میں'' میں کھڑا کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اس نے اُردو مزاح کو اس مشکل مقام پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے لے جانا کسی دوسرے مزاح نگار تو کیا اس کے اپنے بس میں نہیں''۔ ''لوگ اس کی کتابیں اتنی بے دردی سے خرید اور بیچ رہے ہیں جس سے کئی دوسرے لکھنے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے''۔

ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے ان کے بارے میں لکھا ''ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں''۔

ڈاکٹر نور الحسن نقوی لکھتے ہیں ''یوسفی کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والا پڑھتے، پڑھتے سوچنے لگتا ہے اور ہنستے ہنستے اچانک چپ ہو جاتا ہے اکثر اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں''۔

ڈاکٹر ناصر مستحسن لکھتے ہیں ''مشتاق احمد یوسفی ایک رجحان ساز اور صاحب اسلوب مزاح نگار ہیں انہوں نے بلاشبہ اردو ادب کو مزاح کے میدان میں بے پایاں عزت دی اردو مزاح کا کوئی بھی دوران کے بغیر نامکمل ہے''۔

وہ جے پور جسے ''پنک سٹی'' بھی کہتے ہیں ضلع ٹونک، راجھستان میں ۴ ستمبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم راجپوتانہ سے حاصل کی، معاشیات میں ماسٹر ڈگری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لائے اور مسلم کمرشل بینک میں ملازمت اختیار کی۔ وہ کئی بینکوں کے سربراہ بھی رہے اور پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ وہ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

ان کا پہلا باقاعدہ مطبوعہ مضمون ''صنف لاغر'' جو طباعت کے لئے سب سے پہلے معروف ادبی جریدے ماہنامہ ''ادب لطیف'' کے مدیر میرزا ادیب نے شائع کیا ان کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۵۵ء کے زمانے سے ہوا۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتابیں

- **چراغ تلے** ۱۹۶۱ء (مکتبہ جدید لاہور، مکتبہ دانیال کراچی)
- **خاکم بدھن** ۱۹۶۹ء (مکتبہ دانیال کراچی)
- **زرگزشت** ۱۹۷۶ء (مکتبہ دانیال کراچی)
- **آب گم** ۱۹۹۰ء (مکتبہ دانیال کراچی)
- **شام شعر یاراں** ۲۰۱۴ء (عرشیہ پبلی کیشنز)

مشتاق احمد یوسفی نے بہت سے ٹی وی پروگرامز میں شرکت کی

اس کے علاوہ ان کے دیارِ غیر میں نجی طور ریکارڈڈ ادبی پروگرامز بھی مختلف ویب سائٹس پر دستیاب ہیں ان کا اب تک آخری پروگرام ''بزبان یوسفی'' ہے جو جیو چینل نے پیش کیا۔

مشتاق احمد یوسفی کو مختلف ایوارڈز سے بھی نوازا گیا ان میں کمال فن ایوارڈ، آدم جی ایوارڈ، بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ ،ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز حکومت پاکستان کی طرف سے دیا گیا۔

ان کی تحریریں اردو کے اخبارات کے علاوہ اردو کی تمام قابل ذکر ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ فیس بک پر ان کے پیج مشتاق احمد یوسفی کے نام سے موجود ہے۔

ان کی کتابوں سے چند فقرے

''دنیا میں جتنی لذیذ چیزیں ہیں ان میں سے آدھی تو مولوی صاحبان نے حرام کردی ہیں اور باقی آدھی ڈاکٹر صاحبان نے''۔

''مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے''۔

''کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا۔ آپ کے خیال میں محبت شادی سے پہلے ہونی چاہئے یا شادی کے بعد؟ جس پر مرزا صاحب نے ارشاد فرمایا، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ محبت شادی سے پہلے ہو بعد، مگر بیوی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنی چاہئے''۔

''چھوٹے ملکوں کے موسم بھی تو اپنے نہیں ہوتے، ہوائیں اور طوفان بھی دوسرے ملکوں سے آتے ہیں ،زلزلوں کا مرکز بھی سرحد پار ہوتا ہے''۔

''اسلام آباد درحقیقت جنت کا نمونہ ہے، جنت کا نمونہ اس اعتبار سے کہ یہاں جو بھی آتا ہے حضرت آدم کی طرح نکالا جاتا ہے''۔

اردو مرکز لاس اینجلس ورلڈ فیمس اکیڈمی آف لیٹرز ۲۰۰۸ء کے ایک ادبی اجلاس میں مشتاق احمد یوسفی پاکستان کے معروف شاعر جون ایلیا کے بارے میں ایک طویل بیان سے ایک ابتدایہ ''ایک زمانے میں جب ہم جوان تھے اور جون ایلیا ایسے ہی تھے جیسے اب ہیں تو ہم رسالوں میں ان کی غزلیں یہ سمجھ کر بڑے شوق اور بے تابی سے پڑھتے تھے کہ یہ کسی آواری اینگلو انڈین لڑکی کا کلام ہے۔ پھر ان سے اچانک مسلم کمرشل بینک میں ملاقات ہوگئی ،میں وہاں ملازم تھا رمضان کا مہینہ تھا اور اس دن میں حسب معمول روزے سے نہیں تھا مجھے السر کی شکایت تھی اور جون ایلیا کی صحت بھی اتنی خراب تھی کہ پانی تک سے پرہیز کرتے تھے فرماتے تھے غسل کے لئے پانی ایک کارآمد شئے ہے بشرطیکہ ہفتے میں ایک بار سے زیادہ نہ ہو اس واسطے کہ ''راحتیں اور بھی غسل کی راحت کے سوا''۔

روبینہ شاہین بینا

دو عیدیں، دو مشاعرے

فیس بک پر طرحی مشاعرے کی روایت کوئی نئی بات نہیں، بیشمار ایسے اُردو ادبی گروہ ہیں جہاں ہر ہفتے اُردو فی البدیہہ طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ منتظمین مشاعرے سے پانچ دس منٹ قبل کوئی مصرع دیتے ہیں جس پر شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اِن مشاعروں کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کے شعراء اس مشاعرے کا حصہ بن سکتے ہیں، چاہے وہ ایشیاء میں ہوں، یورپ میں ہوں یا انٹارکٹیکا میں، جہاں جہاں اُنہیں انٹرنیٹ کی سہولت میسر ہے، وہ وہاں سے مشاعرے میں شرکت کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اِن مشاعروں میں فی البدیہہ شعر کہنے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے شاہکار اشعار پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

موجِ غزل فورم بھی ایک ایسا ہی گروہ ہے جو اگرچہ اپنی پیدائش کے لحاظ سے زیادہ بالغ نہیں لیکن پھر بھی اپنی مشاعروں کی پچیس بہاریں دیکھ چکا ہے۔ اس گروہ میں اکثر طنز و مزاح پر مشتمل مشاعروں کا بھی انعقاد کیا جاتا ہے۔ ذیل میں دو ایسے ہی مشاعرے کی رپورٹ پیشِ خدمت ہے جن کا انعقاد بالترتیب عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے مواقع پر کیا گیا تھا۔

سیّد مظہر عباس رضوی کی باغ و بہار شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اسلام آباد میں مقیم ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن طبی معالجے کے ساتھ ساتھ فکری علاج معالجے کے سہولت کار بھی ہیں اور دورِ نو کے ٹینشن زدہ زمانے میں پریشان حال دلوں کو بھی اپنی شاعری کے ذریعے ہنسنے ہنسانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ برسہا برس سے فنِ ظرافت کے گھوڑے پر نہایت چابکدستی سے سوار ہیں اور اُردو مزاح گو شعراء میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھوتے ادیب بھی ہیں۔ اُن کی طنز و مزاح پر مبنی شاعری کے بہت سے مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن میں

ہوئے ڈاکٹری میں رسوا

دوا بیچتے ہیں

گڑبڑ گھوٹالہ

ہنپتالی شاعری

نعتیں کیا کیا

شامل ہیں۔ موج غزل فیس بک کا ایک عالمی ادبی فورم ہے جہاں ہفتہ وار ایک آن لائن فی البدیہہ عالمی طرحی مشاعرے کا

اہتمام کیا جاتا ہے۔ اِن مشاعروں میں اندرون ملک اور بیرون ملک سے بہت سے شعرائے کرام شرکت کرتے ہیں۔ اس بار عید الفطر کے موقع پر عید کی مناسبت سے جو مشاعرہ منعقد ہوا، اس کا مصرع جناب ڈاکٹر مظہر عباس رضوی کے کلام سے لیا گیا تھا، جو کچھ یوں تھا:

جیب خالی ہوگئی ہے دے دلا کے عیدیاں
مجھ سے بڑھ کر کون ہے مسکین میٹھی عید پر

اس مشاعرے میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک میں رہائش پذیر بہت سے نامور اور نو آزمود شعراء نے مشقِ سخن فرمائی جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

عرفان قادر، ڈاکٹر عزیز فیصل، اشفاق اسغنی رفیقی، محترمہ نور جمشید پوری، مبارک علی مبارکی، نوید ظفر کیانی، ندیم اختر، محترمہ ذہینہ صدیقی، توحید اظہر بسنت پوری، محترمہ دلشاد نسیم، محترمہ قدسیہ ظہور، ذیشان فیصل شان، محترمہ رعنا حسین، محترمہ جیا قریشی، نوید صدیقی، محترمہ ڈاکٹر امواج الساحل، ہاشم علی خان ہمدم، شہواز انور، عادل تسلیم، شاہین فصیح ربانی، ڈاکٹر صابر مرزا، گوہر رحمان مردانوی، شہناز رضوی اور راقم الحروف۔

ذیل میں اس مشاعرے میں پیش کیے گئے اِن شعراء کے منتخب اشعار پیش خدمت ہیں۔

کب تلک کہتے رہیں گے، ہم بہت مصروف ہیں
چل پڑے سُسرال، "مفرورین" میٹھی عید پر
ظالما! دھوکا ہے یہ، کہ شربتِ دیدار میں
کیوں ہے چینی کی جگہ سکرین میٹھی عید پر

عرفان قادر

اس کی نیت جب ہوئی رنگین میٹھی عید پر
کر گئیں زخمی اسے دو تین میٹھی عید پر
کوئے جاناں میں بسر کرتے ہیں اپنی چاند رات
وصل کے سب سینئر شوقین میٹھی عید پر

ڈاکٹر عزیز فیصل

بیٹھنے کو ہے گلا بیگم کو دیکر مشورے
بھینس کے آگے بجاؤں بین میٹھی عید پر
ساس کے بٹوے کی چوری ہوگئی بازار میں
مل گئی دل کو مرے تسکین میٹھی عید پر

اشفاق اسغنی

ہے بہت مہنگی شکر تم تھوڑی تھوڑی ڈالیو
یاد آئی ساس کی تلقین میٹھی عید پر
جب تمھادی لسٹ لمبی دونوں بیگم نے اسے
سامنے تھا مسئلہ سنگین میٹھی عید پر

نور جمشید پوری

قیمتیں چینی کی چونکہ چھو رہی ہیں آسماں
کیوں نہ چینی لینے جائیں چین میٹھی عید پر
مِل ہی لیتے ہم گلے اُن سے اگر ہوتے نہیں
بھائی اُنکے ، سامنے دو تین میٹھی عید پر

مبارک علی مبارکی

جب گلے ہم کو لگاتے ہیں بھیچ جاتے ہیں ہم
اُن کے آگے ہم ہیں "میڈ اِن چین" میٹھی عید پر
مجھ کو اپنے پیار کی عیدی اگر دینی نہیں
جلوہ فرما کیوں ہے پھر نوشین میٹھی عید پر

نوید ظفر کیانی

اڑ گئے طوطے میاں کے یوں ہوا کچھ ماجرا
بچے جھولی پڑ گئے دو تین میٹھی عید پر
سوکنیں جب لڑ پڑیں دونوں چڑھا کر آستیں
پوچھیے مت کیا بنا پھر سین میٹھی عید پر

ندیم اختر

شیر خرما کھاتے کھاتے بڑھ گئی میری شکر
اب مجھے درکار ہے نمکین میٹھی عید پر
عیدی دینا فرض ہے نہ دو تو ملتی ہے سزا
گویا یہ بھی جرم ہے سنگین میٹھی عید پر

ذہینہ صدیقی

عید گہ سے ہائے میرا جوتا چوری ہو گیا
اسلئے میں خوب ہوں غمگین میٹھی عید پر
نین ملتے ہی جلا منہ، چائے کا کپ گر گیا
ہوگیا برباد پھر قالین میٹھی عید پر

توحیداظہر بسنت پوری

اس نے مجھ کو کہہ دیا نمکین میٹھی عید پر
میری بھی ہونے لگی تسکین میٹھی عید پر
مینا چہکی، مینہ برسا، کالی گھٹا جھومی ہے
آج موسم بھی ہوا رنگین میٹھی عید پر

دلشادنسیم

سو روپے لے کر بھی مجھ سے اک سپاہی نے کہا
یوں نہ کر پولیس کی توہین میٹھی عید پر
خواب ٹوٹے سب جو دیکھے میں نے شاپنگ واسطے
چھن گیا جو پرس ہوئی غمگین میٹھی عید پر

قدسیہ ظہور

ہیں سبھی پہلی صفوں میں جو رہے روزے سے دور
یہ عمل ہے قابلِ تحسین میٹھی عید پر
نیند پوری ہو نہ پائی تھی ابھی پوری طرح
پھر چلا ہے کام پہ مسکین میٹھی عید پر

ذیشان فیصل شان

آئے بیٹھے پاس، سینے سے لگا لینے کے بعد
صبر کی کرتے رہے تلقین میٹھی عید پر
ہوں وطن سے دور تنہا بے سرو سامان ہوں
مجھ سے بڑھ کر کون ہے مسکین میٹھی عید پر

رعنا حسین

میرا سارا دن کچن میں کھپ گیا ہے ہائے ہائے
"مجھ سے بڑھ کر کون ہے مسکین میٹھی عید پر"
سامنے دیکھا جو بیگم بھیگی بلی بن گئے
بن رہے تھے جو بڑے گل چین میٹھی عید پر

روبینہ شاہین بینا

تیرے آنے سے مرے آنگن میں آئی ہے بہار
سبز ہے پھر خواہشوں کی خشک ٹہنی عید پر

جیاقریشی

عیدی سالے سالیوں کو دے کے "پھاہا" ہوگیا
حسبِ سابق شوہرِ مسکین میٹھی عید پر
کھا گیا مہنگائی کا عفریت ساری قوم کو
حکمرانوں نے بجائی بین میٹھی عید پر

نوید صدیقی

عقد ثانی کر لیا جمعے کو اس نے عید پر
اس کے تو خطبے ہوئے پھر تین میٹھی پر
میں تو پچھتاتی رہی تھی اس سے عیدی مانگ کر
سن رہی تھی اس کی میں تلقین میٹھی عید پر

ڈاکٹر امواج الساحل

تین دن تک لوڈ شیڈنگ کی سہولت کے بغیر
بدلا بدلا سا لگے آئین میٹھی عید پر
تین دن خرمستیوں میں دیکھ کر احباب کو
ہو گئی شیطان کو تسکین میٹھی عید پر

ہاشم علی خان ہمدم

پھول خوشبو سارے تارے مر مٹے تھے جان جاں
تم یہاں پر جب ملے تھے ہم سے پہلی عید پر

شہوازانور

جوتیاں اور گالیاں کھانی پڑی ہر موڑ پر
جو حسینوں کے بنے شوقین میٹھی عید پر

عادل تسلیم

ایک کیا ہے، ساتھ میں ہیں تین میٹھی عید پر
دیکھتے ہیں کیسے کیسے سین میٹھی عید پر
سو کے جس نے سحریاں ساری گزاریں دوستو
وہ بجاتا پھر رہا ہے ٹین میٹھی عید پر

شاہین فصیح ربانی

عید کی شاپنگ کا ٹانکا لگ ہے دس ہزار
اب بنی پھرتی ہے ٹیک پروین میٹھی عید پر
گوہر رحمان گہر مردانوی

ایک کم ففٹی دنوں کے بعد واپس آئے ہیں
بھیگی بلی کی طرح مسکین میٹھی عید پر
شہناز رضوی

موجِ غزل کے زیرِ اہتمام عیدالفطر کی طرح عید الضحیٰ کے موقع پر بھی بقر عید کی مناسبت سے مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس بار طرحی مشاعرے کے لئے جناب عرفان قادر کے مصرع کا انتخاب کیا گیا۔ عرفان قادر صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ فیس بک پر ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ یہ خالصاً طنز و مزاح کے کھلاڑی ہیں اور ایک طویل عرصہ سے ظرافت نگاری کی اننگ کھیل رہے ہیں۔ یہ خاصے پُر گو شاعر ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک فی البدیہہ طرحی مشاعرے پر ان کی پچپاس اشعار سے بھی زائد اشعار پر مبنی غزل دیکھنے کو ملی تھی۔ اِس بار اِن کے جس شعر سے مصرعِ طرح لیا گیا تھا وہ کچھ یوں تھا:

اُسے لے آئے، گرچہ جیب پر بھاری پڑا بکرا
کسی منڈی میں دیکھا جب کوئی معصوم سا بکرا

حسبِ روایت، اس طرحی مشاعرے پر بھی بہت سے شعرائے اکرام نے طبع آزمائی کی، جن کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

شہزاد گوہیر، آصف علی، شہنواز نور، وحید واحد اختر، اشفاق استغنی رفیقی، خلیل الرحمٰن خلیل، ہاشم علی خان ہمدم، ڈاکٹر امواج الساحل، شہناز رضوی، نوید ظفر کیانی، عرفان قادر، قدسیہ ظہور، کامران اعظم سوہروردی، عبدالعزیز یاس چاند پوری، اسرار رازی، شیخ علیم اسرار، محمد فہیم، خضر حیات، جواد فاروقی، محمد ظفر کاظمی، آزاد حسین آزاد، ذہینہ صدیقی، علی رضا، جیا قریشی، یاسر عباس فراز، عتیق الرحمٰن، نشتر امروہوی اور راقم الحروف۔

ہمیں آواز دیتا ہے کوئی شاید بھنا بکرا
مری کٹیا کے پچھواڑے یہ کس نے باندھ
کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں ہم ایسا پارسا بکرا
ترے پہلو میں جا بیٹھے ہو ایسا دلربا بکرا
شہزاد گوہیر

نہ دنبہ چاہئے اسکو نہ ہی حسرت ہے بچھڑے کی
میری بیگم مجھے بولے "ولائیں آپ سا بکرا"
مجھے جو داد دیتے ہیں دعا دیتا ہوں میں انکو
میسر ان کو یارب ہو ہمیشہ ہی بھنا بکرا
آصف علی

کبھی لیلیٰ دوانی تھی کبھی رانجھا کو تھا پیارا
کسی کی یاد میں مجنوں بھی اب تک کھا رہا بکرا

کسی شاعر کو ضد تھی اس پہ یارو شعر کہنے کی
مفاعیلن کر چکر میں کوئی اب لے اڑا بکرا

شہوازانور

وہ اندازِ تغزل، ''میں سے میں تک'' شعر چلتا تھا
نکل آئی جو محفل میں اکیلی شاعرہ بکرا
فریزر میں چھپانے پڑ گئے اعمال واحد کو
وگرنہ بانٹنا پڑتا چرایا مفت کا بکرا

وحیدواحداختر

بنا چارہ دکھائے اک قدم بھی نہ بڑھاتا ہے
کسی لیڈر کے ہاں مجھکو لگے ہے وہ پلا بکرا
بہانے سے میں لایا ساس کو اسکے قریں لیکن
اشاروں کی زباں سمجھا نہیں میرا گدھا بکرا

اشفاق اسانغنی

خریدے پھر نہیں کپڑے نہ کچھ جوتے خریدے ہیں
بجٹ گھر کا ہمارے سامنے سب کھا گیا بکرا
قصائی نے پکارا ''لے بھی آؤ اب کھڑا بکرا''
جو بیگم کی نظر مجھ پر پڑی تو ہنس دیا بکرا

خلیل الرحمٰن خلیل

یہ بکرا تو علامت ہے اسے کچھ اور سمجھو جی
امیر شہر سے بڑھ کر ہوا کوئی ہے کیا بکرا
اسے ہر حال ، ہر قیمت پہ میں ممنون سمجھا ہوں
" کسی منڈی میں دیکھا جب کوئی معصوم سا بکرا"

ہاشم علی خان ہمدم

کسی کو دے ہی دیتا تو اسی کی عید ہوجاتی
جو بجلی ہوگئی تھی بند تو ضائع ہوا بکرا
کہا بچی نے میری بک کسی بھی کام تو آئی
کہ کھا کر دین کی بک کو مسلماں ہو گیا بکرا

ڈاکٹرامواج الساحل

ہمیشہ دِل مچل اُٹھتا ہے یہ میرا نہ جانے کیوں
کسی منڈی میں جب دیکھا کوئی معصوم سا بکرا

یہ کرغم اُس کے جانے کا ذرا بھی دِل میں تُو شہناز
تجھے اِک پَل میں پَل سے پار اُتاریگا ترا بکرا

شہنازرضوی

مٹن کے نام پر یوں تو سگ وخر چرتے پھرتے ہیں
مگر عیدِ بقر پر مل ہی جاتا ہے کھرا بکرا
ارے یہ ارتقا کی کس ڈگر پر آ گئے ہیں ہم
بہت سستا ہوا انساں، بہت مہنگا ہوا بکرا

نویدظفرکیانی

مجھے گوری پڑوسن کا ذرا سا دل جلانا ہے
دلا دے ظالما مجھ کو بھی کالا کوک سا بکرا
لگائی اس نے ٹکر تو نظر آئے مجھے تارے
زمیں سے آسماں پر یوں مجھے بھی لے گیا بکرا

روبینہ شاہین بیناؔ

ترقی کر کے بنتا بھینس تو اُس کا بگڑتا کیا؟
گدھا بن کے یہ کیسا کر چکا ہے ارتقا بکرا؟
سٹوری یاد ہے اس کو ہر اِک مووی کی فر فر فر
نہیں سمجھو اسے یارو پرانے دور کا بکرا

عرفان قادر

گئے جو ہسپتال ہم بھی مریضوں کی عیادت کو
مریضانہ اداؤں میں ملا ہے خوش نوا بکرا
بدلتے جا رہے ہیں اس کے تیور عید قرباں پر
بہت معصوم لگتا تھا جو منڈی میں کھڑا بکرا

قدسیہ ظہور

یہ بکرا باعثِ رونق ہے منڈی میں کہیں گھر میں
کچن میں ہوگئی رونق وہاں جس پل کٹا بکرا
کہیں بچی ،کہیں تکے کہیں ہے قورمہ قیمہ
بہت سے روپ یہ پھر دھارتا ہے عید کا بکرا

کامران اعظم سوہروردی

اطاعت میں بھی اچھا تھا بڑی خاموش فطرت تھا
جدھر کو میں چلا لے کر ادھر کو وہ چلا بکرا

بڑے ہی پیار سے پالا رہِ حق میں کیا قرباں
لگے ہے یاس گھر کو سونا سونا کر گیا بکرا

عبدالعزیز یاس چاندپوری

گلے میں ٹانگ کر سیل فون نغمے سنتا رہتا ہے
بڑا ہے فین منا ڈے کا میوزک آشنا بکرا
اسے ہے شوق ٹی وی پر ڈرامے اور فلموں کا
ہوا خوش دیکھ کے "قسطوں پہ بکرا" منچلا بکرا

اسرار رازی

مکاری یہ عیاری ہوا دستور دنیا کا
کسی معصوم کو اب لوگ سمجھیں ہیں بڑا بکرا

علیم اسرار

عجب تاثیر ہے اس کی کہ جب سے کھا لیا میں نے
بجائے خون کے میری رگوں میں دوڑتا بکرا
کسی بھی زاویے سے وہ نہیں ملتا تھا بکرے سے
نہ جانے اپنی بیگم کو وہ شوہر کیوں لگا بکرا

محمد فہیم

لگا کے رنگ بچوں نے بنا ڈالا ہے رنگیں یوں
مری بستی کا سب سے ہو گیا ہے خوشنما بکرا
نہاتا ہے یہ شیمپو سے خوشی سے پان بھی کھائے
بڑے ہی ناز سے پالا ہے میں نے خوش ادا بکرا

خضر حیات

نہیں نکلے گا نمبر بانڈ کا جب تک نہ ہوں راضی
منا لے اپنے پیروں کو گرا اِک کالا سا بکرا

سیّد ظفر کاظمی

ذبح سے پہلے پھولوں سے سجا کر حلوہ پوری دی
بہت ناز و ادا سے گھر میں پھر کھایا گیا بکرا
کھلائے ہاتھ سے پتے تو اس نے سینگ دے مارے
ذہینہ کو حقیقت میں بہت مہنگا پڑا بکرا

ذہینہ صدیقی

بھری منڈی نہیں بھایا کوئی مظلوم سا بکرا
تو لے آیا تھا میں اپنے صدر ممنون سا بکرا
اسے تھا خوفِ قربانی تو بدلا روپ تک اپنا
گدھے کے بھیس میں پھرتا ہوا پکڑا گیا بکرا

آزاد حسین آزاد

خریدا ہے اسے میں نے کئی تولے بھنا کر کے
ہوا سونے سے بھی مہنگا یقیں مانو موا بکرا

جواد فاروقی

لگائے مت کوئی بہتان میرے بکرے پر کوئی
مرا بکرا کئی لوگوں سے تھا اچھا بھلا بکرا

علی رضا

بکا بکرا، کٹا بکرا، بٹا بکرا، بھنا بکرا
بروز عید کیسا تھا، ہوا کیا کیا سے کیا بکرا
اسے بھی لوڈ شیڈنگ نے کیا قربان لوگوں پر
فریزر میں جو رکھا تھا بچا کر عید کا بکرا

جیا قریشی

بذریعہ ڈاک بکرے کی سہولت دے رہے ہیں اب
حکومت نے بنا ڈالا ہے اب کے ڈاکیا بکرا
بہت چالاک ہے بے حد ذہین ہے اور سیانا ہے
کسی استاد کے گھر سے لگے ہے یہ مرا بکرا

یاسر عباس فراز

بہت گھومے، ہمیں تھی جستجو خاموش بکرے کی
پسند آتا ہمیں کیسے کوئی بھی بے سرا بکرا
پشاور میں پڑا تھا قحط یارو دیسی بکروں کا
ملا ہے ہم کو آخر میں فقط اک بوک سا بکرا

عتیق الرحمٰن

نجانے کیا کیا جادو پٹالی ایک ہی دن میں
پڑوسن کی تھی بکری اُس پہ عاشق ہو گیا بکرا
بڑی میٹھی نگاہوں سے ہر اک بکری کو تکتا ہے
مری بیگم کو لگتا ہے چھچھورا، بے حیا بکرا

نشتر امروہوی

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ